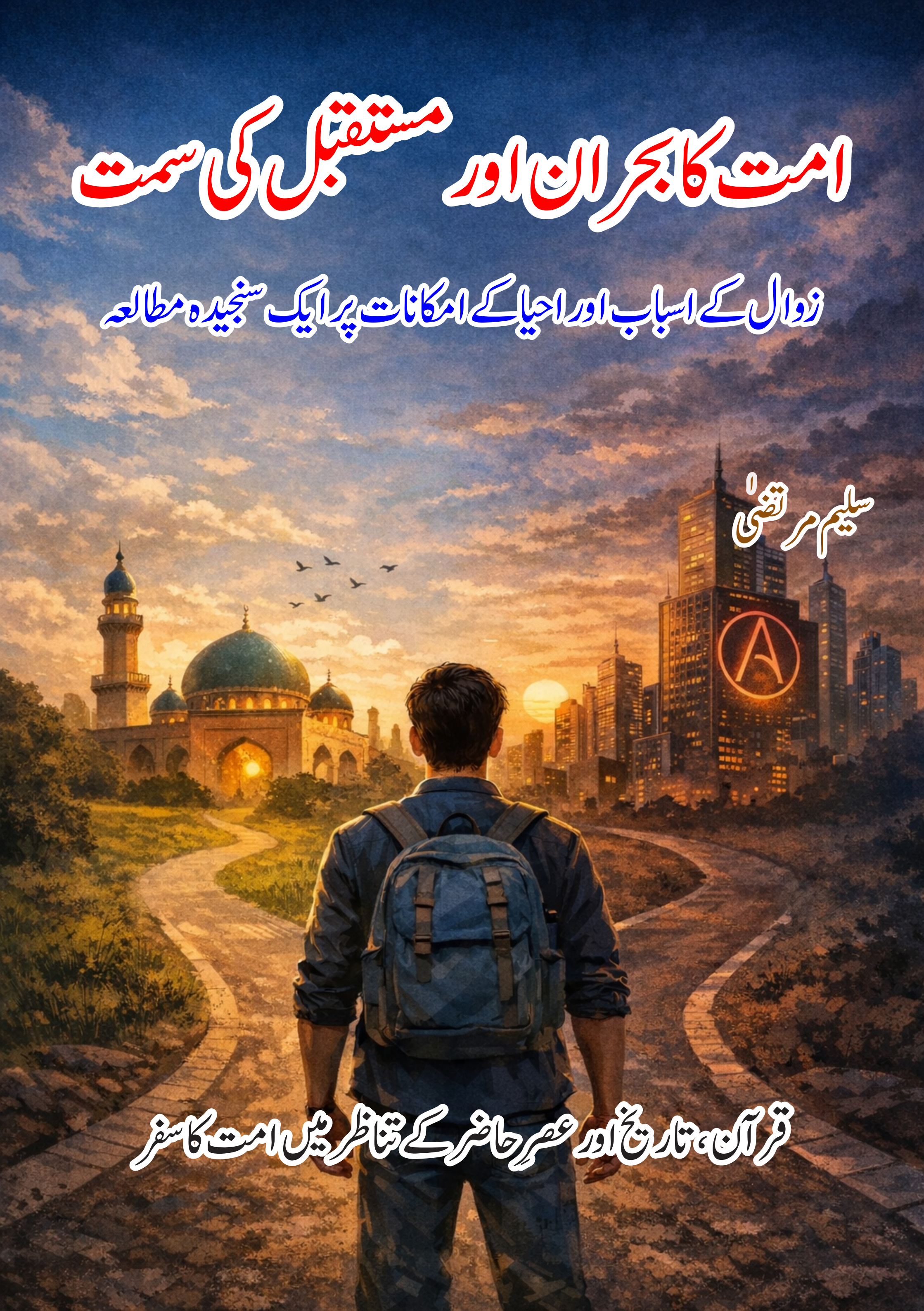
امت کا بحران اور مستقبل کی سمت

زوال کے اسباب اور احیا کے امکانات پر ایک سنجیدہ مطالعہ

سلیم مرتضیٰ

قرآن، تاریخ اور عصرِ حاضر کے تناظر میں امت کا سفر



امت کا بحران اور مستقبل کی سمت

زوال کے اسباب اور احیا کے امکانات پر ایک سنجیدہ مطالعہ

سلیم مرتضیٰ[1]

قرآن، تاریخ اور عصرِ حاضر کے تناظر میں امت کا سفر

انتساب(Dedication Page)

یہ کتاب

اُن تمام مسلمان نوجوانوں کے نام

جو سوال کرتے ہیں،

سچ تلاش کرتے ہیں،

اور دل کے سکون کی جستجو میں ہیں۔

"جو سچ کا مسافر ہو—وہ کبھی راستہ نہیں بھولتا"

فہرست مضامین

(علمی عروج، سیاسی و اخلاقی زوال)

(بیرونی حملے، داخلی کمزوریاں، نو آبادیاتی دور اور دین سے اجتماعی دوری کی تکمیل)

باب ۳

جدید فکری و تہذیبی اسبابِ لادینیت

(جدید دور، فکری بحران، اور مسلمان ذہن کی نئی کشمکش)

(سیکولرازم، عقل و وحی کا مغالطہ، اور جدید علم کا فکری دباؤ)

(میڈیا، نصاب، ثقافت اور جدید طرزِ زندگی: لادینیت کا خاموش فروغ)

(خاندانی نظام کی کمزوری، دینی تربیت کا فقدان، اور دین کی غلط نمائندگی)

(دین کی طرف واپسی کے امکانات، فکری اصلاح، اور متوازن دعوت کا راستہ)

باب ۴

نفسیاتی، سماجی اور اخلاقی اسبابِ لادینیت

(انسانی نفس، خواہشات، اور دین سے تدریجی جذباتی دوری)

(شناخت کا بحران، مادّی کامیابی، اور روحانی خالی پن)

(اخلاقی نسبیت، ضمیر کی کمزوری، اور گناہ کا معمول بن جانا)

(اخلاقی زوال سے سماجی ٹوٹ پھوٹ تک)

(اخلاقی و سماجی بحالی: دین بطور شفا، امید اور اجتماعی ربط)

باب ۵

تعلیمی، فکری اور ادارہ جاتی اسبابِ لادینیت

(تعلیم کا مقصد بدل جانا اور علم کا دین سے کٹ جانا)

(نوآبادیاتی تعلیمی ورثہ، فکری غلامی، اور مسلمان ذہن کی سیکولر تشکیل)

(مغربی فلسفہ، فکری شکوک، اور مسلمان نوجوان کا ذہنی انتشار)

(جامعات، میڈیا اور ادارے: دین مخالف بیانیے کی منظم تشکیل)

(مسلمان اداروں کی داخلی کوتاہیاں، تعلیمی خلیج، اور اصلاح کی عملی راہیں)

باب ٦

سیاسی، معاشی اور عالمی اسبابِ لادینیت

(سیاست کا دین سے جدا ہونا اور ریاستی سطح پر سیکولرازم کا نفوذ)

(معاشی نظام، سرمایہ دارانہ دباؤ، مادہ پرستی اور دین سے بدظنی)

(عالمی طاقتیں، ثقافتی یلغار، تہذیبی دباؤ اور شناخت کا بحران)

(عالمی نظام کے خلاف دینی ردِ عمل: افراط، تفریط اور مزید لادینیت)

(اسلامی عالمی وژن: عدل، توازن، انسانی وقار اور فکری استقامت)

باب ۷

ذرائع ابلاغ، ٹیکنالوجی اور ڈیجیٹل دور میں دین سے دوری

(میڈیا کی طاقت، ذہن سازی، اور دین کا پس منظر میں چلے جانا)

(سوشل میڈیا، فوری تسکین، ڈیجیٹل نشہ اور روحانی خلا)

(آن لائن دینی مواد: فوائد، نقصانات، جعلی علم اور فکری انتشار)

(ڈیجیٹل دور میں دین سے جڑنے کے امکانات اور متوازن دینی رہنمائی)

(ڈیجیٹل دور میں فردِ مسلم کی ذمہ داریاں، توازن کا قیام اور ایمان کا تحفظ)

باب ۸

تعلیمی نظام، نصاب اور فکری تربیت میں دین کی کمزوری

(تعلیم کی اہمیت، اسلامی تصورِ علم، اور جدید تعلیمی نظام کا فکری اثر)

(نو آبادیاتی تعلیمی نظام، میکالے ازم اور مسلم ذہن کی فکری غلامی)

(نصاب میں دین کی علامتی حیثیت، علوم کی تقسیم اور دوہری شخصیت کا بحران)

(اساتذہ کا کردار، تعلیمی ماحول اور تعلیم و تربیت کے درمیان خلیج)

(تعلیمی اصلاح، دینی و عصری علوم کا امتزاج، اور متوازن اسلامی تعلیمی وژن)

باب ۹

روحانی کمزوری، عبادات سے غفلت اور ایمان کی کم ہوتی حرارت

(ایمان کی حقیقت، دل کی کیفیت اور روحانی زوال کا آغاز)

(عبادات سے غفلت کے اسباب، نماز و قرآن سے دوری، اور روحانی خلا)

(روحانی خلا، جدید انسان کی بے چینی، اور سکون کی غلط تلاش)

(روحانی خلا سے نکلنے کے راستے، توبہ ورجوع، اور ایمان کی تجدید)

(ایمان کی حفاظت، روحانی زوال سے بچاؤ، اور زندہ ایمان والی زندگی)

باب ۱۰

خاندانی نظام کی کمزوری اور دینی تربیت کا فقدان

(خاندان کی دینی اہمیت، اسلامی تصورِ خاندان، اور دین کی منتقلی میں اس کا کردار)

(والدین کی ترجیحات، تربیتی غفلت، اور محبت و نظم کا عدمِ توازن)

(والدین و اولاد کے درمیان فکری خلا)

(میڈیا، اسکرین کلچر، بیرونی فکری اثرات اور گھر کے اندر دینی ماحول کی شکست)

(گھر میں دینی ماحول کی بحالی، والدین کے لیے عملی حکمتِ عملیاں)

باب ۱۱

تعلیمی نظام، اسکول اور دین سے دوری کے منظم اسباب

(تعلیم کا مقصد، علم و ایمان کی جدائی، اور جدید تعلیمی فلسفے کا فکری اثر)

(نصابِ تعلیم، اساتذہ کا فکری کردار، اور طالب علم کی ذہنی تشکیل)

(یونیورسٹی کلچر، لبرل فکر، اور تعلیم یافتہ مسلمانوں میں عملی لادینیت)

(تعلیم یافتہ طبقے کی مذہبی بے حسی، سیکولر کامیابی، اور روحانی خلا)

(تعلیم اور ایمان کے رشتے کی بحالی، اصلاحی حکمتِ عملیاں)

باب ۱۲

میڈیا، ثقافتی یلغار اور دین سے دوری کے اجتماعی اسباب

(میڈیا کی طاقت، ثقافت کی تشکیل، اور اقدار کی خاموش تبدیلی)

(تفریحی صنعت، فلم وڈرامہ، سوشل میڈیا اور اخلاقی و دینی زوال)

(اقدار کی نئی تعریف، آزادی وحیا کا بحران)

(میڈیا میں دین کی منفی تصویر، مسلمان کردار، دہشت گردی کا بیانیہ)

(میڈیا کے فتنوں کا مقابلہ، متبادل اسلامی بیانیہ، اور فکری و عملی واپسی کا راستہ)

باب ۱۳

خاندانی نظام کی کمزوری، رشتوں کا بکھراؤ اور دین سے دوری

(خاندان کی دینی حیثیت، اس کا زوال اور ایمان پر اس کے گہرے اثرات)

(والدین کا کردار، تربیت کی کمزوری، اور اولاد میں دین سے جذباتی و عملی فاصلے)

(ازدواجی تعلقات کی کمزوری، گھریلو تنازعات)

(جدید طرزِ زندگی، مصروفیت، اور خاندانی روابط کے ٹوٹنے کے دینی اثرات)

(طلاق، سنگل پیرنٹنگ، اور ٹوٹے ہوئے خاندانوں میں دین کی منتقلی کے مسائل)

باب ۱۴

دوستی، سماجی حلقے اور Peer Pressure کے ذریعے دین سے دوری

(انسان کی سماجی فطرت، دوستی کی طاقت، اور ایمان پر اس کے ابتدائی اثرات)

(نوجوانی، قبولیت کی خواہش، گروہی دباؤ اور دین سے عملی سمجھوتے)

(غلط صحبت، اجتماعی گناہ، اور ضمیر کی بتدریج موت)

(سوشل میڈیا، ڈیجیٹل دوستیاں، اور ایمان پر غیر محسوس حملے)

(صحبت کی اصلاح، متبادل سماجی حلقے، اور دین سے دوبارہ جڑنے کے عملی راستے)

باب ۱۵

تعلیم، نصاب اور جدید تعلیمی نظام کے ذریعے دین سے دوری

(علم کا تصور، تعلیم کی سمت، اور دین و دنیا کی مصنوعی تقسیم)

(سیکولر نصاب، نظریاتی غیر جانبداری کا دعویٰ، اور ایمان کی غیر محسوس نفی)

(اساتذہ کا کردار، تعلیمی ماحول، اور دین کے بارے میں لاشعوری پیغامات)

(طلبہ کی نفسیات، تعلیمی دباؤ، کامیابی کا تصور، اور دین سے داخلی کشمکش)

(تعلیم کی اصلاح، دینی و دنیاوی علم کا امتزاج)

باب ۱۶

میڈیا، تفریحی صنعت، اور شعوری و لاشعوری طور پر دین سے دوری

(میڈیا کی طاقت، ذوق کی تشکیل، اور ایمان پر غیر محسوس اثرات)

(ڈرامہ، فلم، موسیقی اور ثقافتی مواد کے ذریعے اقدار کی تبدیلی)

(خبری میڈیا، بیانیہ سازی، اور دین کی منفی یا ثانوی تصویر)

(سوشل میڈیا، الگورتھمز، اور دین سے دوری کا نیا ڈیجیٹل انداز)

(میڈیا کے مقابلے میں دینی حکمتِ عملی، شعور کی بازیافت، اور عملی حل)

باب ۱۷

خاندانی نظام کی کمزوری اور نسل در نسل دینی زوال

(خاندان بطور دینی تربیت کا پہلا ادارہ، اور اس کے کمزور ہونے کے نتائج)

(والدین کی ترجیحات، طرزِ زندگی، اور بچوں کی دینی شناخت پر اثرات)

(گھر میں دینی مکالمے کی کمی، نسلوں کے درمیان فکری فاصلہ، اور اس کے نتائج)

(طلاق، خاندانی ٹوٹ پھوٹ، اور بچوں کی دینی واخلاقی شخصیت پر اثرات)

(خاندانی نظام کی بحالی، دینی تربیت کے عملی اصول)

باب ۱۸

دوستوں، سوشل سرکل اور معاشرتی دباؤ کے ذریعے دین سے دوری

(انسان بطور سماجی وجود، رفاقت کا اثر، اور دینی شناخت کی تشکیل)

(نوجوانوں میں Peer Pressure ، فیشن، رجحانات اور دینی کمزوری)

(بری صحبت، معمولی گناہوں کا معمول بن جانا، اور ایمان کی تدریجی کمزوری)

(نیک صحبت کی کمی، دینی رول ماڈلز کا فقدان، اور عملی متبادل کا بحران)

(نیک صحبت کی تعمیر، مثبت سوشل سرکل)

باب ۱۹

میڈیا اور سوشل نیٹ ورکس کے ذریعے دینی فکر کی تشکیل یا بگاڑ

(میڈیا بطور خاموش معلم، اور فکر و اقدار کی غیر محسوس تشکیل)

(سوشل میڈیا، شارٹ فارم مواد، اور دین کی سطحی تفہیم کا بڑھتا ہوا رجحان)

(ڈیجیٹل مبلغین، آن لائن مذہبی اتھارٹی، اور علم و شہرت کا تصادم)

(میڈیا میں دین کی نمائندگی، اسلاموفوبیا، اور خود مسلمانوں کے بیانیے کا بحران)

(ڈیجیٹل دور میں دینی بیانیے کی تعمیر، میڈیا لٹریسی، اور فکری خود اعتمادی)

باب ۲۰

تعلیمی نظام، نصاب اور فکری تشکیل میں دین کی کمزوری

(تعلیم بطور فکری سانچہ، اور دین کی تدریجی بے دخلی)

(نصاب کی سیکولرائزیشن، اقدار کی تبدیلی، اور دینی و اخلاقی خلا)

(زوال کے اسباب: جب قومیں اپنے اصول کھو بیٹھتی ہیں)

زوال سے نکلنے کے قرآنی و تاریخی اصول

(احیا، اصلاح اور فکری واپسی کا راستہ)

(عملی احیا: فرد، خاندان اور ریاست کی سطح پر اصلاح)

(عصرِ حاضر میں احیا کے امکانات اور چیلنجز)

باب ۲۱

نوجوان، شناخت کا بحران اور مستقبل کی قیادت

(نوجوان: امت کا سرمایہ یا گم ہوتا ہوا امکان؟)

(شناخت کا بحران: دین، ثقافت اور جدیدیت کے درمیان کشمکش)

(نوجوان کی فکری و اخلاقی تربیت: قیادت کی تیاری کیسے ہو؟)

(نوجوان، میڈیا اور قیادت کا نیا تصور)

(نوجوان قیادت کا مستقبل: امید، ذمہ داری اور راستہ)

دعائیہ اختتام

پیش لفظ (Preface)

یہ کتاب کسی ایک لمحے کی سوچ یا وقتی جذبے کا نتیجہ نہیں، بلکہ ایک طویل مشاہدے، مسلسل غور و فکر اور امت کے فکری زوال و احیا پر گہری تشویش کی پیداوار ہے۔ یہ تحریر اس سوال سے جنم لیتی ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں، یہاں تک کیسے پہنچے، اور آگے بڑھنے کا راستہ کیا ہے؟

یہ کتاب نہ کسی فرد، جماعت یا طبقے پر الزام ہے، اور نہ ہی مایوسی کی تبلیغ۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ قاری کو آئینہ دکھایا جائے۔ ایسا آئینہ جس میں ہم خود کو دیکھ سکیں، پہچان سکیں، اور اگر ضرورت ہو تو خود کو درست کرنے کا حوصلہ پیدا کریں۔

اگر یہ کتاب قاری کو سوچنے پر مجبور کر دے، اگر یہ دل میں ایک سوال جگا دے، یا اگر یہ عمل کی طرف ایک چھوٹا سا قدم بھی بڑھا دے — تو یہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہوگی۔

عصرِ حاضر کا سب سے بڑا فکری چیلنج نوجوان کی شناخت کا بحران ہے۔

امید ہے کہ یہ کتاب والدین، اساتذہ، علماء، پالیسی سازوں اور سب سے بڑھ کر نوجوانوں کے لیے ایک فکری چراغ ثابت ہوگی۔

اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے۔

تمہیدی کلمات — بدلتا ہوا مذہبی منظرنامہ

امتِ مسلمہ کی تاریخ عروج و زوال کے روشن اور تاریک ابواب سے بھری پڑی ہے۔ مگر تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہ نہیں کہ زوال آیا، بلکہ یہ ہے کہ ہم نے زوال کے اسباب کو سمجھنے کے بجائے انہیں تقدیر کا نام دے دیا۔ حالانکہ قرآن ہمیں بار بار یہ بتاتا ہے کہ قوموں کے حالات اتفاقاً نہیں بدلتے، بلکہ ان کے افکار، اعمال اور ترجیحات کے نتیجے میں بدلتے ہیں۔

یہ کتاب اسی نکتے سے سفر کا آغاز کرتی ہے کہ زوال محض بیرونی سازش نہیں، بلکہ اکثر اندرونی کمزوریوں کا نتیجہ ہوتا ہے — کمزور فکر، بکھری شناخت، بے مقصد تعلیم، اخلاقی ابہام، اور قیادت کا بحران۔

اکیسویں صدی کا آغاز انسانی تاریخ کے اُن ادوار میں شمار ہوتا ہے جہاں تبدیلی کی رفتار ماضی کی تمام صدیوں سے زیادہ تیز ہے۔ ٹیکنالوجی، ابلاغ، معیشت اور ثقافت میں ہونے والے انقلابات نے انسان کے سوچنے، سمجھنے اور جینے کے انداز کو بنیادی طور پر بدل دیا ہے۔ اس عالمی تبدیلی سے مسلمان معاشرہ بھی مستثنیٰ نہیں۔ خاص طور پر نوجوان نسل ایک ایسے ماحول میں پروان چڑھ رہی ہے جہاں روایتی اقدار اور جدید رجحانات مسلسل باہم ٹکرا رہے ہیں۔

ماضی میں مذہب صرف عقیدہ نہیں بلکہ معاشرتی ڈھانچے کا مرکز تھا۔ خاندان، تعلیم، رسم و رواج، حتیٰ کہ ریاستی شناخت بھی مذہبی بنیادوں پر قائم تھی۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ مذہبی مرکزیت کمزور پڑنے لگی۔ آج کی نوجوان نسل کے لیے مذہب اکثر زندگی کے مرکزی نظام کے بجائے ایک ثقافتی شناخت یا رسمی روایت کی صورت اختیار کر چکا ہے۔

یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ تمام نوجوان دین سے دور ہو رہے ہیں، مگر یہ حقیقت ہے کہ سوال اٹھانے والوں، شکوک میں مبتلا افراد اور خود کو "غیر مذہبی" کہنے والوں کی تعداد نمایاں طور پر بڑھ رہی ہے۔ کچھ نوجوان خاموشی سے مذہبی عمل ترک کر رہے ہیں، کچھ سوشل میڈیا پر مذہب پر تنقید کر رہے ہیں، اور کچھ کھل کر لادین یا دہریہ شناخت اختیار کر رہے ہیں۔ یہ تبدیلی ایک سنجیدہ سماجی رجحان کی علامت ہے، جسے نظر انداز کرنا مستقبل کے بڑے بحران کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

یہ مسئلہ محض عقیدے کا نہیں بلکہ ذہنی، جذباتی اور معاشرتی بحران کا نتیجہ ہے۔ نوجوان آج معلومات کے سمندر میں ڈوبا ہوا ہے مگر حکمت کی پیاس بجھی نہیں۔ اسے سائنسی سوالات بھی درپیش ہیں، اخلاقی الجھنیں بھی، معاشی بے یقینی بھی، اور شناخت کا بحران بھی۔ اگر مذہبی بیانیہ ان سوالات کا معقول جواب فراہم نہ کر سکے تو نوجوان فطری طور پر متبادل فکری راستے تلاش کرتا ہے۔

سوشل میڈیا نے اس عمل کو مزید تیز کر دیا ہے۔ چند لمحوں میں دنیا بھر کے نظریات، فلسفے اور تنقیدی مواد نوجوان کی اسکرین پر آ جاتے ہیں۔ مذہب اب صرف مسجد یا مدرسے سے نہیں سیکھا جا رہا بلکہ یوٹیوب، ایکس، فیس بک اور ٹک ٹاک سے بھی تشکیل پا رہا ہے۔ اس ڈیجیٹل فضا میں روایتی مذہبی اندازِ گفتگو اکثر غیر مؤثر محسوس ہوتا ہے، جس سے فاصلہ مزید بڑھتا ہے۔

یہ کتاب کسی فرد یا طبقے پر الزام رکھنے کے لیے نہیں لکھی جا رہی۔ اس کا مقصد یہ سمجھنا ہے کہ آخر وہ کون سے عوامل ہیں جو مسلمان نوجوان کو دین سے دور کر رہے ہیں؟ کون سی غلطیاں ہم بطور معاشرہ کر رہے ہیں؟ اور کون سے راستے ایسے ہیں جن سے دوبارہ فکری و روحانی ربط قائم ہو سکتا ہے؟

کسی بھی مسئلے کا حل اس کی درست تشخیص سے شروع ہوتا ہے۔ اگر ہم نوجوان کی فکری دنیا کو سمجھے بغیر صرف نصیحت یا جذباتی خطاب پر اکتفا کریں گے تو مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ مزید گہرا ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں ہم جذبات کے بجائے تحقیق، مشاہدے اور علمی تجزیے کی بنیاد پر گفتگو کریں گے۔ تمہید کا مقصد قاری کو اس فکری زمین سے روشناس کرانا ہے جس پر پوری کتاب کی عمارت کھڑی ہے، تاکہ آگے آنے والے ابواب محض معلومات نہیں بلکہ ایک مربوط فکری سفر بن سکیں۔

مصنف کا پیغام

میں اس کتاب کو کسی حتمی فیصلے یا آخری سچ کے طور پر پیش نہیں کر رہا۔ یہ ایک دعوتِ فکر ہے، ایک مکالمہ ہے— مصنف اور قاری کے درمیان، دل اور عقل کے درمیان، حال اور مستقبل کے درمیان۔

اگر کہیں آپ کو اختلاف محسوس ہو تو اسے رد نہ کریں، بلکہ اس پر غور کریں۔ اگر کہیں آپ کو اپنی کمزوری دکھائی دے تو مایوس نہ ہوں، بلکہ اسے اصلاح کا موقع سمجھیں۔ اور اگر کہیں آپ کو امید کی کرن نظر آئے تو اسے معمولی نہ سمجھیں— کیونکہ تاریخ میں بڑے انقلابات ہمیشہ چھوٹی امیدوں سے ہی شروع ہوئے ہیں۔

یہ کتاب خاص طور پر نوجوانوں، اساتذہ، والدین، اہلِ فکر اور ان سب لوگوں کے لیے ہے جو امت کے مستقبل کو محض تقریروں کے حوالے نہیں کرنا چاہتے، بلکہ سوچ، کردار اور عمل کے ذریعے اس کی تعمیر میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔

باب 01

دین کیا ہے؟— قرآن وسنت کی روشنی میں

دین کا سوال انسانی تاریخ کے قدیم ترین اور بنیادی سوالات میں سے ایک ہے۔ انسان جب سے اس زمین پر آیا ہے، اس نے صرف خوراک، لباس اور رہائش ہی کے مسائل پر غور نہیں کیا بلکہ اس نے اپنی ہستی، مقصدِ حیات اور کائنات کے نظام پر بھی سوال اٹھائے ہیں۔ ہر تہذیب، ہر قوم اور ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں دین کا تصور موجود رہا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ دین انسان کی فطرت میں ودیعت ایک بنیادی ضرورت ہے، نہ کہ محض ایک سماجی ایجاد۔

اسلام دین کو محض چند عبادات، رسوم یا اخلاقی ہدایات تک محدود نہیں کرتا، بلکہ دین کو ایک ہمہ گیر نظامِ زندگی قرار دیتا ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

''بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے'' (سورۃ آل عمران: آیت 19)

یعنی اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ اس آیت میں دین کو کسی جزوی یا محدود تصور کے بجائے ایک مکمل طرزِ حیات کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جو انسان کے عقیدے، عمل، اخلاق، معیشت، سیاست اور معاشرت سب کو محیط ہے۔

لغوی اعتبار سے لفظ ''دین'' عربی زبان میں جزا، اطاعت، قانون اور نظام کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ امام راغب اصفہانی اپنی معروف کتاب ''المفردات فی غریب القرآن''، میں لکھتے ہیں کہ دین دراصل اس نظام کا نام ہے جس کے تحت انسان کسی مقتدرِ اعلیٰ کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں دین کا تصور ہمیشہ اللہ کی حاکمیت، اطاعت اور جواب دہی کے ساتھ جڑا ہوا نظر آتا ہے۔

اصطلاحی طور پر دین اس مکمل نظام کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا، جس میں عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات سب شامل ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ دین صرف اللہ کی عبادت اور اس کے احکامات کی پیروی کا نام ہے، اور یہی دینِ فطرت ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام لے کر آئے۔

قرآنِ مجید بار بار اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ انسان کو محض آزاد اور خود مختار مخلوق نہیں بنایا گیا بلکہ وہ اللہ کے سامنے جواب دہ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

تو کیا تم نے گمان کر لیا کہ ہم نے تمھیں بے مقصد ہی پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے؟ (سورۃ المؤمنون: آیت 115)

یہ آیت دین کے بنیادی تصور کو واضح کرتی ہے کہ زندگی محض ایک اتفاقی وجود نہیں بلکہ ایک ذمہ دارانہ سفر ہے، جس کا ایک واضح انجام ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے دین کی جامع تعریف ایک نہایت بلیغ حدیث میں فرمائی۔ حضرت عمرؓ سے مروی مشہور حدیثِ جبریل میں جب جبرائیل علیہ السلام نے دین کے بارے میں سوال کیا تو نبی ﷺ نے ایمان، اسلام اور احسان کو دین کے بنیادی اجزاء کے طور پر بیان فرمایا (صحیح مسلم، حدیث: 8)۔ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ دین صرف ظاہری اعمال کا نام نہیں بلکہ باطن کی اصلاح، نیت کی درستگی اور اللہ کی نگرانی کے احساس کا نام بھی ہے۔

تاریخی طور پر اگر ہم ابتدائی انسانی معاشروں کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ دین ہمیشہ معاشرتی نظم وضبط کا مرکزی عنصر رہا ہے۔ قدیم تہذیبوں، مثلاً مصر، بابل، فارس اور ہندوستان میں مذہب محض عبادت تک محدود نہیں تھا بلکہ قانون، اخلاق اور ریاستی نظم کا حصہ تھا۔ لیکن یہ مذاہب وحیِ الٰہی کے تابع ہونے کی بجائے انسانی سوچ کا نتیجہ تھے۔ اسلام

نے اسی فطری رجحان کو وحیِ الٰہی کے ذریعے درست اور متوازن شکل دی۔

اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں دین کا تصور کسی خانقاہ یا مسجد تک محدود نہ تھا۔ مدینہ کی اسلامی ریاست میں دین ہی قانون تھا، دین ہی اخلاق تھا اور دین ہی معاشرتی تعلقات کی بنیاد تھا۔ نبی کریم ﷺ نے مسجد کو صرف عبادت گاہ نہیں بلکہ تعلیم، مشاورت اور اجتماعی فیصلوں کا مرکز بنایا، جو اس بات کی عملی دلیل ہے کہ اسلام میں دین زندگی سے الگ نہیں بلکہ زندگی کی رہنمائی کے لیے ہے۔

دین کے تصور کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اسے صرف چند مذہبی اعمال یا مخصوص رسومات تک محدود نہ کریں، کیونکہ ایسا کرنا خود دینِ اسلام کی روح کے منافی ہے۔قرآنِ مجید دین کو ایک مکمل اور مربوط نظام کے طور پر پیش کرتا ہے، جو انسان کی فکری، روحانی، اخلاقی اور عملی زندگی کے ہر پہلو کو محیط ہے۔یہی جامعیت دین کو محض مذہب (Religion) سے ممتاز کرتی ہے اور اسے ایک مکمل ضابطِ حیات بناتی ہے۔

قرآنِ مجید میں بارہا اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کائنات کا خالق، مالک اور حاکم ہے، اور اسی کی اطاعت دین کی بنیاد ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

کہہ دے بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے، جو جہانوں کا رب ہے۔ (الأنعام: 162)

یہ آیت دین کے اس ہمہ گیر تصور کو واضح کرتی ہے کہ دین صرف عبادت کے چند اعمال کا نام نہیں بلکہ پوری زندگی کو اللہ کے تابع کرنے کا نام ہے۔

اسلام کے نزدیک دین اور دنیا کی تقسیم ایک غیر فطری تصور ہے۔ یہ تقسیم دراصل بعد کے ادوار میں پیدا ہونے والا فکری انحراف ہے، جس کی جڑیں زیادہ تر مغربی مذہبی تاریخ میں ملتی ہیں، جہاں کلیسا اور ریاست کے تصادم نے مذہب کو نجی معاملہ بنا دیا۔ اس کے

برعکس اسلام نے ابتدا ہی سے دین کو اجتماعی زندگی کی بنیاد بنایا۔ نبی کریم ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی یہ تھا کہ انسان کو صرف روحانی نجات نہ دی جائے بلکہ اسے ایک عادل، متوازن اور اخلاقی معاشرہ فراہم کیا جائے۔

نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ اس حقیقت کی روشن مثال ہے۔ مکہ مکرمہ میں ابتدائی تیرہ سال ایمان، عقیدہ اور اخلاق کی اصلاح پر صرف ہوئے، تاکہ افراد کی فکری و روحانی بنیاد مضبوط ہو۔ مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد یہی دین ایک مکمل معاشرتی اور ریاستی نظام کی صورت میں ظاہر ہوا۔ میثاقِ مدینہ، جو تاریخِ انسانی کا پہلا تحریری دستور سمجھا جاتا ہے، اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ دینِ اسلام نے مذہب، سیاست، قانون اور معاشرت کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا۔

دین کی جامعیت کو سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم قرآن میں بار بار آنے والے لفظ ''حکم'' اور ''حاکمیت'' پر غور کریں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

حکم (اختیارِ فیصلہ) صرف اللہ ہی کا ہے۔ (سورۃ یوسف: آیت 40)

یہ آیت دین کے سیاسی اور قانونی پہلو کو واضح کرتی ہے، جس کے مطابق حتمی اقتدار اور قانون سازی کا حق اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ انسان کو جو اختیار دیا گیا ہے، وہ اللہ کی عطا کردہ حدود کے اندر ہے، نہ کہ مطلق آزادی۔

احادیثِ نبویہ میں بھی دین کی اسی جامع حقیقت کو بار بار بیان کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دین خیر خواہی کا نام ہے۔'' ہم (صحابہ رضی اللہ عنہم) نے پوچھا: کس کی (خیر خواہی؟) آپ نے فرمایا: ''اللہ کی، اس کی کتاب کی، اس کے رسول کی، مسلمانوں کے امیروں کی اور عام مسلمانوں کی خیر خواہی۔)'' صحیح مسلم حدیث: 196)

یہ حدیث اس بات کو واضح کرتی ہے کہ دین محض انفرادی عبادت نہیں بلکہ اجتماعی

ذمہ داری، سماجی شعور اور اصلاحِ معاشرہ کا نام بھی ہے۔

اگر ہم اسلامی فقہ اور شریعت کے ذخیرے کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ دین نے انسانی زندگی کے ہر پہلو کے لیے اصول وضوابط مقرر کیے ہیں۔ عبادات کے ساتھ ساتھ معاملات، معاشرت، معیشت، سیاست، عدل و انصاف اور حتیٰ کہ بین الاقوامی تعلقات تک کے اصول قرآن وسنت میں موجود ہیں۔ امام شاطبیؒ نے "الموافقات" میں شریعت کے مقاصد (مقاصد الشریعہ) بیان کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ دین کا مقصد انسان کے دین، جان، عقل، نسل اور مال کا تحفظ ہے۔ یہ مقاصد اس بات کی دلیل ہیں کہ دین انسان کی مکمل فلاح کے لیے آیا ہے، نہ کہ کسی ایک پہلو کے لیے۔

تاریخی طور پر جب مسلمانوں نے دین کے اس جامع تصور کو اپنایا، تو وہ دنیا کی ایک عظیم تہذیب کے معمار بنے۔ بنوامیہ اور بنوعباس کے ادوار میں علم، فلسفہ، طب، فلکیات اور قانون میں جو ترقی ہوئی، وہ اس بات کی دلیل ہے کہ دین نے کبھی عقل یا علم کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالی۔ بلکہ قرآن نے بار بار غور وفکر، تدبر اور عقل کے استعمال کی دعوت دی ہے۔

﴿أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾، ﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ﴾

جیسے الفاظ قرآن میں کثرت سے آئے ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ دین اسلام جامد نہیں بلکہ متحرک فکری نظام ہے۔

یہاں ایک اہم نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ دین کا اصل مسئلہ "کم علمی" نہیں بلکہ "غلط فہمیاں" ہیں۔ جب دین کو صرف رسومات، فرقہ وارانہ مباحث یا جزوی احکامات تک محدود کر دیا جاتا ہے تو اس کی روح ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے دین سے دوری کا عمل شروع ہوتا ہے۔ لوگ دین کو زندگی سے غیر متعلق سمجھنے لگتے ہیں، اور پھر آہستہ

لادینیت یا عملی بے دینی کی طرف بڑھتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اس خطرے کی طرف بہت پہلے اشارہ فرما دیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''عنقریب امتوں کے لوگ تم پر یوں ٹوٹ پڑیں گے، جیسے بسیار خور (کھانے کے) پیالے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔'' کہنے والے نے کہا: آیا ہم اس وقت تعداد میں کم ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہاری بہت زیادہ تعداد ہوگی، لیکن تم سیلاب کے کوڑا کرکٹ کی طرح (ہلکے پھلکے اور بے وقعت) ہو جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہاری ہیبت نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں » وہن « ڈال دے گا۔'' کہنے والے نے کہا: اے اللہ کے رسول! » وہن « کیا ہوتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا کی محبت اور موت کی کراہیت کو » وہن « کہتے ہیں۔'' (سلسلہ احادیث صحیحہ حدیث: 3757)

یہ کمزوری جسمانی نہیں بلکہ فکری اور اخلاقی کمزوری کی طرف اشارہ ہے، جو دین کے اصل تصور سے دوری کا نتیجہ ہوتی ہے۔

دین دراصل انسان کو ایک واضح مقصد دیتا ہے۔ جب یہ مقصد دھندلا جاتا ہے تو زندگی محض خواہشات، مفادات اور وقتی لذتوں کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ یہی کیفیت آج کے انسان، خصوصاً مسلمان نوجوان، میں تیزی سے نظر آ رہی ہے۔ دین کو اگر دوبارہ اس کے جامع، فطری اور متوازن تصور کے ساتھ پیش نہ کیا گیا تو یہ فاصلہ مزید بڑھتا جائے گا۔

(دین اور فطرتِ انسانی، وحدتِ دین اور انبیائے کرام کا مشترکہ پیغام)

دین کے تصور کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے ایک نہایت بنیادی حقیقت کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے، اور وہ یہ ہے کہ دین کسی مخصوص زمانے، قوم یا خطے کی پیداوار نہیں بلکہ انسانی فطرت کے عین مطابق ایک الٰہی نظام ہے۔ اسلام اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ

دین انسان پر باہر سے مسلط نہیں کیا گیا بلکہ یہ اس کی فطرت میں پیوست ایک حقیقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید دین کو ''فطرت'' کے ساتھ جوڑ کر پیش کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

پس اپنا رخ یکسو ہو کر دین کی طرف کر لو، یہ اللہ کی وہ فطرت ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔(سورۃ الروم: آیت 30)

یہ آیت دین کے تصور کو انسانی فطرت سے براہِ راست جوڑ دیتی ہے اور واضح کرتی ہے کہ دین کوئی غیر فطری بوجھ نہیں بلکہ انسان کی اصل ساخت کے مطابق ایک رہنمائی ہے۔

فطرت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر کچھ بنیادی سوالات، رجحانات اور اخلاقی احساسات از خود موجود ہوتے ہیں، جیسے خیر و شر کا شعور، عدل کی خواہش، ظلم سے نفرت اور کسی اعلیٰ قوت کے سامنے جواب دہ ہونے کا احساس۔ دین ان تمام فطری رجحانات کو درست سمت دیتا ہے۔ جب انسان دین سے دور ہوتا ہے تو دراصل وہ اپنی ہی فطرت سے ٹکرا رہا ہوتا ہے، اور یہی تصادم ذہنی انتشار، اخلاقی بحران اور روحانی خلا کو جنم دیتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فطرت کے اس تصور کو نہایت واضح انداز میں بیان فرمایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت (اللہ پر ایمان اور اچھائی کی محبت) پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں'' (صحیح مسلم حدیث: 6755)

یہ حدیث اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اصل دین انسان کے اندر پہلے سے موجود ہوتا ہے، بعد کے ماحول اور تربیت اسے یا تو نکھار دیتے ہیں یا مسخ کر دیتے ہیں۔

یہی فطری دین دراصل تمام انبیاء علیہم السلام کا مشترکہ پیغام رہا ہے۔ قرآنِ مجید بار بار اس حقیقت کو دہراتا ہے کہ تمام رسول ایک ہی دین لے کر آئے، اگرچہ ان کی شریعتوں میں وقتی اور عملی فرق رہا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اس نے تمہارے لیے دین کا وہی راستہ مقرر کیا جو نوحؑ کو دیا گیا، اور جو ہم نے آپ کی طرف وحی کیا۔ (سورۃ الشوریٰ: آیت 13)

یہ آیت اس بات کا واضح اعلان ہے کہ دین ایک ہے، انبیاء مختلف ہیں، اور مقصد سب کا ایک ہی ہے: اللہ کی بندگی اور انسان کی ہدایت۔

تاریخی اعتبار سے اگر ہم انبیاء کی دعوت کا مطالعہ کریں تو ہر نبی کی دعوت کا مرکز ''توحید'' رہا ہے۔ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور آخر میں حضرت محمد ﷺ — سب نے سب سے پہلے اپنی قوم کو یہی پیغام دیا:

''اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔'' (سورۃ الاعراف: آیت 73)

یہ پیغام صرف عبادت تک محدود نہیں تھا بلکہ زندگی کے پورے نظام کی اصلاح کا اعلان تھا۔

حضرت ابراہیمؑ کی زندگی دین کے فطری اور عقلی پہلو کی بہترین مثال ہے جسے قرآن حکیم میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

''تو جب اس پر رات چھا گئی تو اس نے ایک ستارہ دیکھا، کہنے لگا یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ غروب ہوگیا تو اس نے کہا میں غروب ہونے والوں سے محبت نہیں کرتا۔ پھر جب اس نے چاند کو چمکتا ہوا دیکھا، کہا یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ غروب ہوگیا

تو اس نے کہا یقیناً اگر میرے رب نے مجھے ہدایت نہ دی تو بلاشبہ میں ضرور گمراہ لوگوں میں سے ہو جاؤں گا۔ پھر جب اس نے سورج چمکتا ہوا دیکھا، کہا یہ میرا رب ہے، یہ سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ غروب ہو گیا کہنے لگا اے میری قوم! بے شک میں اس سے بری ہوں جو تم شریک بناتے ہو۔" (سورۃ الأنعام: آیت 79–76)۔

یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ دین عقل کے خلاف نہیں بلکہ عقل کو صحیح سمت دیتا ہے۔ اسلام اسی ابراہیمی روایت کا تسلسل ہے، جو فطرت، عقل اور وحی کے درمیان توازن قائم کرتا ہے۔

قرآنِ مجید نے دین میں تفرقے کو ایک شدید فکری اور اخلاقی بیماری قرار دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"ان لوگوں میں شامل نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا اور گروہوں میں بٹ گئے۔" (سورۃ الروم: آیت 32–31)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ دین کی اصل روح وحدت ہے، جب کہ فرقہ واریت اور تعصب دین سے دوری کی علامت ہے۔

اسلام نے امتِ مسلمہ کو ایک وحدت کے طور پر پیش کیا۔

"یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے۔" (سورۃ الانبیاء: آیت 92)

لیکن جب دین کو جزوی، مسلکی یا ثقافتی عینک سے دیکھا جانے لگا تو وحدت ٹوٹنے لگی، اور دین ایک جامع نظام کے بجائے اختلافات کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں سے عملی بے دینی اور فکری لادینیت کا آغاز ہوتا ہے۔ جب دین اپنی وحدت، فطرت اور جامعیت کھو دیتا ہے تو وہ انسان کے دل و دماغ پر اثر کھو

بیٹھتا ہے۔ پھر دین ایک زندہ حقیقت کے بجائے ایک تاریخی ورثہ یا سماجی شناخت بن جاتا ہے، اور یہی کیفیت آج بہت سے مسلم معاشروں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے امت کو اس انجام سے خبردار فرمایا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:
''میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، جب تک ان کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے گمراہ نہ ہو گے: اللہ کی کتاب اور میری سنت۔'' (موطا امام مالک 1620)

یہ حدیث اس بات کا اعلان ہے کہ دین کی اصل صورت قرآن و سنت میں محفوظ ہے، اور اسی سے وابستگی انسان کو فطرت کے راستے پر قائم رکھتی ہے۔

دین سے دوری دراصل اللہ سے نہیں بلکہ خود انسان سے دوری ہے، کیونکہ دین انسان کی اصل پہچان ہے۔ جب یہ پہچان کمزور ہوتی ہے تو انسان اپنی سمت کھو بیٹھتا ہے۔ یہی گم شدگی فرد سے معاشرے اور معاشرے سے پوری تہذیب تک پھیل جاتی ہے۔

(دین بطور نظامِ حیات، عبادت و سیاست کی مصنوعی تقسیم، اور فکری انحرافات)

دین کے تصور کو اگر ایک جملے میں سمیٹا جائے تو وہ یہ ہے کہ دین انسان کی پوری زندگی کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کے تحت منظم کرنے کا نام ہے۔ اسلام نے دین کو کبھی صرف مسجد، عبادت یا ذاتی روحانیت تک محدود نہیں کیا بلکہ اسے اجتماعی نظم، معاشرتی انصاف اور انسانی معاملات کی بنیاد بنایا۔ یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جسے نظر انداز کرنے سے دین اپنی روح کھو بیٹھتا ہے اور محض ایک رسمی شناخت بن کر رہ جاتا ہے۔

قرآنِ مجید دین کو واضح طور پر ''نظامِ حیات'' کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔'' (سورۃ

البقرہ: آیت 208)

یہ آیت اس بات کی صریح دلیل ہے کہ دین جزوی قبولیت کا نام نہیں، بلکہ مکمل اطاعت اور ہمہ جہت وابستگی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اسلام کسی ایسے انسان کو قبول نہیں کرتا جو عبادات میں تو دیندار ہو، لیکن اخلاق، معاملات اور اجتماعی زندگی میں دین کو غیر متعلق سمجھتا ہو۔

نبی کریم ﷺ کی عملی زندگی اس حقیقت کی سب سے بڑی تفسیر ہے۔ آپ ﷺ صرف امامِ مسجد نہیں تھے بلکہ قاضی، معلم، سپہ سالار، حکمران اور سماجی مصلح بھی تھے۔ مدینہ منورہ میں قائم ہونے والی اسلامی ریاست میں دین ہی قانون تھا، دین ہی معیشت کی بنیاد تھا اور دین ہی عدل و انصاف کا معیار تھا۔ یہ تصور بعد کے ادوار میں بتدریج کمزور ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ دین اور دنیا کو دو الگ خانوں میں بانٹ دیا گیا۔

عبادت اور سیاست کی یہ مصنوعی تقسیم اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔ قرآنِ مجید میں بار بار ان اقوام کی مذمت کی گئی ہے جو دین کو ٹکڑوں میں بانٹ لیتے ہیں۔

”کیا تم کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور دوسرے کو نہیں مانتے؟“ (سورۃ البقرہ: آیت 85)

یہ سوال صرف بنی اسرائیل سے نہیں بلکہ ہر اس امت سے ہے جو دین کو اپنی خواہشات کے مطابق قبول کرتی ہے۔

تاریخی طور پر یہ تقسیم مسلمانوں کے ہاں اچانک پیدا نہیں ہوئی بلکہ یہ ایک تدریجی فکری انحراف کا نتیجہ تھی۔ خلافتِ راشدہ کے بعد جب سیاسی اقتدار میں موروثیت، طاقت اور مفاد داخل ہوا تو دین کو ریاستی نظم سے الگ کرنے کا غیر اعلانیہ عمل شروع ہو گیا۔ اگرچہ فقہ، حدیث اور دینی علوم نے اپنی جگہ ترقی کی، مگر دین کا اجتماعی اور اصلاحی پہلو بتدریج

کمزور ہوتا گیا۔

یہی وہ مرحلہ تھا جہاں دین فرد کی ذاتی زندگی تک محدود ہونا شروع ہوا، اور اجتماعی مسائل کو "دنیاوی امور" قرار دے کر دین سے الگ کر دیا گیا۔ اس رویے کو بعد میں مغربی سیکولر فکر نے مزید تقویت دی، جس نے مذہب کو مکمل طور پر نجی معاملہ بنا دیا۔ بدقسمتی سے مسلم معاشروں میں بھی اسی تصور کو بلا تنقید قبول کر لیا گیا، حالانکہ یہ تصور اسلام کی روح کے بالکل منافی تھا۔

اسلامی فقہ کے عظیم علما نے ہمیشہ دین کی جامعیت پر زور دیا۔ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کی فقہ صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ معاملات، سیاست اور عدل و انصاف کے اصولوں پر بھی محیط ہے۔ امام ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ شریعت کا مقصد عدل، رحمت، مصلحت اور حکمت ہے، اور جو چیز ان اصولوں کے خلاف ہو وہ شریعت نہیں ہو سکتی، چاہے اس پر دینی لیبل ہی کیوں نہ لگا دیا جائے (اعلام الموقعین)۔

قرآنِ مجید بار بار عدل و انصاف کو دین کا بنیادی تقاضا قرار دیتا ہے:

"بے شک اللہ عدل اور احسان اور قرابت والے کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور برائی اور سرکشی سے منع کرتا ہے، وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔" (سورۃ النحل: آیت 90)

یہ آیت جمعہ کے خطبات میں پڑھی جاتی ہے، لیکن عملی زندگی میں اس کے تقاضے اکثر نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ جب دین کا یہ اجتماعی پہلو کمزور ہوتا ہے تو لوگ دین کو محض چند عبادات تک محدود سمجھنے لگتے ہیں، اور یہی محدود تصور بالآخر بے دینی یا لادینیت کی طرف لے جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اس خطرے کی طرف واضح اشارہ فرمایا تھا۔ آپ ﷺ نے

فرمایا: ''اسلام کی کڑیوں کو ایک ایک کڑی کر کے توڑ دیا جائے گا اور جب ایک کڑی ٹوٹ جایا کرے گی تو لوگ دوسری کے ساتھ چمٹ جایا کریں گے، سب سے پہلے ٹوٹنے والی رسی حکم یعنی انصاف کی ہوگی اور سب سے آخر میں ٹوٹنے والی نماز ہوگی''۔ (مسند احمد 22513)

یہ حدیث اس بات کی گہری نشاندہی کرتی ہے کہ جب دین کے اجتماعی پہلو ختم ہوتے ہیں تو آخرکار فرد کی عبادات بھی محض رسم بن کر رہ جاتی ہیں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں دین اپنی اصلاحی قوت کھو دیتا ہے۔ دین کا مقصد صرف فرد کو نجات دلانا نہیں بلکہ معاشرے کو ظلم، ناانصافی اور اخلاقی بگاڑ سے بچانا ہے۔ جب دین اس کردار سے ہٹ جاتا ہے تو لوگ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر دین زندگی کے مسائل حل نہیں کر سکتا تو اس کی ضرورت کیا ہے؟ یہی سوال آگے چل کر شکوک، بدگمانی اور لادینیت کو جنم دیتا ہے۔

لہٰذا دین سے دوری کی اصل وجہ دین کی سختی یا غیر فطری ہونا نہیں بلکہ دین کے اصل تصور سے انحراف ہے۔ جب دین کو مکمل نظامِ حیات کے بجائے ایک جزوی اور محدود مذہب بنا دیا جاتا ہے تو اس کی کشش ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وہ فکری خلا ہے جسے بعد میں مادیت، قوم پرستی اور الحاد جیسے نظریات پُر کرتے ہیں۔

خلاصہ:

دین کے تصور پر اس تفصیلی گفتگو کے بعد اب یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتی ہے کہ اسلام میں دین محض چند اعتقادات، عبادات یا اخلاقی ہدایات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر، فطری اور متوازن نظامِ حیات ہے۔ دین انسان کو اس کے خالق سے جوڑتا ہے، اس کی زندگی کو مقصد عطا کرتا ہے اور معاشرے کو عدل، اخلاق اور ذمہ داری کے

اصولوں پر استوار کرتا ہے۔ جب تک دین اس جامع تصور کے ساتھ زندہ رہا، مسلمان نہ صرف فکری طور پر مضبوط رہے بلکہ تہذیبی، علمی اور اخلاقی لحاظ سے بھی دنیا کی رہنمائی کرتے رہے۔

اس باب میں ہم نے دیکھا کہ دین کی بنیاد انسانی فطرت پر ہے۔ قرآنِ مجید دین کو فطرتِ انسانی کا عین تقاضا قرار دیتا ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے فطرت کے اس تصور کو نہایت سادہ مگر گہرے الفاظ میں واضح فرمایا۔ دین انسان پر مسلط کیا گیا کوئی خارجی نظام نہیں بلکہ اس کی داخلی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انسان دین سے دور ہوتا ہے تو وہ سکون، مقصد اور معنویت سے بھی محروم ہو جاتا ہے، چاہے اس کے پاس مادی وسائل کی فراوانی ہی کیوں نہ ہو۔

ہم نے یہ بھی دیکھا کہ تمام انبیاء علیہم السلام ایک ہی دین لے کر آئے، اور وہ دین توحید، عدل اور اخلاق پر مبنی تھا۔ شریعتوں کا فرق وقتی اور حالات کے مطابق تھا، مگر دین کا اصل پیغام ہمیشہ ایک ہی رہا۔ اسلام اسی آفاقی اور فطری دین کا آخری اور کامل اظہار ہے۔ اس تناظر میں دین کو کسی خاص قوم یا ثقافت تک محدود کرنا خود دین کی روح کے خلاف ہے۔

بابِ اوّل میں یہ حقیقت بھی نمایاں ہوئی کہ دین کی اصل کمزوری اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اسے جزوی، محدود اور منقسم بنا دیا جاتا ہے۔ عبادت اور سیاست، دین اور دنیا، فرد اور معاشرہ — یہ تمام تقسیم اسلام کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں۔ قرآنِ مجید نے دین کو پورے کا پورا اختیار کرنے کا حکم دیا، مگر تاریخ کے مختلف ادوار میں مسلمان اس جامعیت کو برقرار نہ رکھ سکے۔ نتیجتاً دین فرد کی نجی زندگی تک محدود ہوتا چلا گیا، اور اجتماعی و ریاستی زندگی اس سے دور ہوتی گئی۔

یہی وہ مقام ہے جہاں سے دین سے دوری کی ابتدائی بنیادیں پڑتی ہیں۔ دین جب معاشرتی عدل، سیاسی انصاف اور اخلاقی ذمہ داری سے الگ ہو جاتا ہے تو عوام کے ذہن میں یہ سوال جنم لیتا ہے کہ اگر دین زندگی کے بنیادی مسائل حل نہیں کر سکتا تو اس کی عملی اہمیت کیا ہے؟ یہ سوال بذاتِ خود لادینیت نہیں، لیکن اگر اس کا جواب درست دینی تناظر میں نہ دیا جائے تو یہی سوال آگے چل کر تشکیک، بداعتمادی اور بالآخر لادینیت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس فکری زوال کی پیش گوئی بہت پہلے فرما دی تھی۔ اسلام کی کڑیاں ایک ایک کر کے ٹوٹنے کی جو بات حدیث میں آئی ہے، وہ دراصل اسی تدریجی عمل کی نشاندہی ہے جس میں پہلے دین کا اجتماعی پہلو کمزور ہوتا ہے، پھر اخلاقی اقدار متاثر ہوتی ہیں، اور آخر کار عبادات بھی محض رسمی اعمال بن کر رہ جاتی ہیں۔ جب دین کا باطن خالی ہو جائے تو اس کا ظاہر بھی زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا۔

یہاں یہ بات نہایت اہم ہے کہ دینی سے دوری کا مطلب یہ نہیں کہ لوگ مکمل طور پر دین چھوڑ دیتے ہیں۔ اکثر اوقات یہ دوری ''عملی'' اور ''فکری'' ہوتی ہے۔ لوگ خود کو مسلمان کہتے ہیں، کچھ عبادات بھی انجام دیتے ہیں، مگر زندگی کے بڑے فیصلوں، اقدار اور ترجیحات میں دین کو غیر متعلق سمجھنے لگتے ہیں۔ یہی کیفیت آگے چل کر لادینیت کی نرم اور خاموش شکلوں کو جنم دیتی ہے، جن کا شعور اکثر خود افراد کو بھی نہیں ہوتا۔

دین سے دوری کا مسئلہ دین کی سختی، غیر عقلی ہونے یا ترقی سے متصادم ہونے کا نتیجہ نہیں، بلکہ دین کے اصل تصور سے لاعلمی اور اس کے عملی اطلاق سے انحراف کا نتیجہ ہے۔ جب دین کو اس کی فطری، جامع اور متوازن صورت میں پیش کیا جائے تو وہ آج بھی انسان کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کا مؤثر حل پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اگلے باب میں سوال زیرِ بحث آئے گا کہ مسلم معاشروں میں دین سے دوری کا یہ عمل تاریخی طور پر کیسے شروع ہوا؟

کون سے سیاسی، سماجی اور فکری عوامل تھے جنہوں نے اس فاصلے کو بڑھایا؟

اور یہ کہ وہ کون سی غلطیاں تھیں جو ہم نے ماضی میں کیں اور جن کے اثرات آج تک ہمارے معاشروں میں محسوس کیے جا رہے ہیں؟

باب دوم میں ہم تاریخی تناظر میں اس مسئلے کا جائزہ لیں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ عروجِ امت کے دور میں دین کس طرح زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کرتا تھا، اور پھر کن مراحل پر یہ ربط کمزور پڑتا چلا گیا۔ یہ تاریخی تجزیہ ہمیں موجودہ دور کی لادینیت کو سمجھنے میں کلیدی کردار ادا کرے گا۔

باب 02

عروجِ امت اور دینی وابستگی — ایک تاریخی جائزہ

(ابتدائی انسانی تاریخ، بعثتِ نبوی ﷺ سے قبل کا عالمی منظرنامہ، اور دین کی اجتماعی حیثیت)

دین اور تاریخ کا تعلق محض اتفاقی نہیں بلکہ گہرا اور لازمی ہے۔ انسانی تاریخ کا کوئی بھی سنجیدہ مطالعہ اس حقیقت کی گواہی دیتا ہے کہ جب بھی کوئی قوم دین کے ساتھ مضبوطی سے وابستہ رہی، اس نے فکری، اخلاقی اور تہذیبی عروج حاصل کیا، اور جب دین اس کی اجتماعی زندگی سے کمزور ہوا تو زوال نے اس کا راستہ دیکھا۔ یہی اصول امتِ مسلمہ کی تاریخ میں بھی پوری وضاحت کے ساتھ نظر آتا ہے۔

اسلام سے قبل کی دنیا کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کا عالمی منظرنامہ شدید فکری، اخلاقی اور سماجی بحران کا شکار تھا۔ عرب معاشرہ، جس میں نبی کریم ﷺ کی بعثت ہوئی، قبائلی عصبیت، جہالت، ظلم اور اخلاقی انحطاط کی واضح مثال تھا۔ قرآنِ مجید نے اس کیفیت کو ''ضلالتِ مبین'' سے تعبیر کیا ہے۔

وہ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور ان سے بالکل ہی غفلت کرتے تھے۔ (سورۃ الأعراف: آیت 136)

یہاں غفلت سے مراد صرف لاعلمی نہیں بلکہ ہدایت سے دوری کی وہ کیفیت ہے جس میں معاشرہ اپنی اخلاقی سمت کھو بیٹھتا ہے۔

عرب معاشرے میں اگرچہ اللہ تعالیٰ کا تصور موجود تھا، مگر وہ توحید کے بجائے شرک، بت پرستی اور توہمات میں بدل چکا تھا۔ کعبہ، جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ

کی توحیدی دعوت کا مرکز تھا، سینکڑوں بتوں سے بھر دیا گیا تھا۔ دین اپنی اصل روح کھو چکا تھا اور محض رسومات کا مجموعہ بن گیا تھا۔ یہی کیفیت ہمیں اس دور کی دیگر بڑی تہذیبوں میں بھی نظر آتی ہے۔

رومی سلطنت بظاہر طاقتور تھی، مگر اندرونی طور پر اخلاقی زوال، طبقاتی ظلم اور مذہبی جبر کا شکار تھی۔ عیسائیت، جو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات پر مبنی تھی، کلیسائی اجارہ داری میں بدل چکی تھی، جہاں مذہب عوام کے لیے نجات کے بجائے استحصال کا ذریعہ بن گیا تھا۔ فارس کی ساسانی سلطنت بھی طبقاتی تقسیم، بادشاہ پرستی اور مذہبی جبر کی مثال تھی۔ مجوسیت میں دین اقتدار کا محافظ بن چکا تھا، نہ کہ اخلاقی اصلاح کا ذریعہ۔

یہی وہ عالمی پس منظر تھا جس میں اسلام کا ظہور ہوا۔ نبی کریم ﷺ کی بعثت دراصل کسی ایک قوم کی اصلاح کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے ایک ہمہ گیر پیغام تھی۔ قرآنِ مجید اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے:

اور ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لئے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے۔ (سورۃ الانبیاء: آیت 107)

آپ ﷺ کی بعثت انسانیت کے لیے رحمت تھی، کیونکہ آپ ﷺ نے دین کو دوبارہ اس کی اصل فطری، اخلاقی اور اجتماعی حیثیت کے ساتھ زندہ کیا۔

ابتدائی مکی دور میں اگرچہ مسلمانوں کی تعداد کم تھی، مگر دینی وابستگی غیر معمولی تھی۔ ایمان محض زبانی اقرار نہیں بلکہ ایک مکمل فکری اور اخلاقی انقلاب تھا۔ صحابہؓ نے نہ صرف بتوں کو ترک کیا بلکہ ظلم، ناانصافی، تعصب اور اخلاقی برائیوں سے بھی کنارہ کشی اختیار کی۔ یہ تبدیلی اس بات کی دلیل تھی کہ دین فرد کی اندرونی دنیا بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اور یہی تبدیلی آگے چل کر اجتماعی عروج کی بنیاد بنتی ہے۔

قرآنِ مجید کی مکی سورتوں کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ اس دور میں دین کی اصل توجہ ایمان، آخرت کے شعور، اخلاقی ذمہ داری اور صبر و استقامت پر تھی۔

جس نے (اپنے) نفس (یعنی روح) کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا۔ (سورۃ الشّمس: آیت 9)

یہ تزکیہ نفس ہی تھا جس نے ایک منتشر، کمزور اور مظلوم جماعت کو ایک مضبوط فکری وحدت میں بدل دیا۔

ہجرتِ مدینہ کے بعد دین کی اجتماعی حیثیت پوری طرح نمایاں ہوئی۔ مدینہ میں قائم ہونے والی اسلامی ریاست اس بات کی عملی مثال تھی کہ دین محض ذاتی عقیدہ نہیں بلکہ اجتماعی نظم کی بنیاد بھی ہوسکتا ہے۔ میثاقِ مدینہ نے مختلف مذاہب اور قبائل کو ایک عادلانہ نظام کے تحت متحد کیا، جہاں عدل، ذمہ داری اور قانون کی بالادستی کو یقینی بنایا گیا۔

یہی وہ مرحلہ تھا جہاں دین نے فرد سے معاشرے اور معاشرے سے ریاست تک کا سفر طے کیا۔ دین کی یہ ہمہ جہت وابستگی ہی امت کے عروج کی اصل وجہ بنی۔ قرآنِ مجید نے اس تعلق کو یوں بیان کیا:

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے نکالی گئی۔ (سورۃ آل عمران: آیت 110)

یہ فضیلت نسب، رنگ یا زبان کی بنیاد پر نہیں بلکہ دین سے وابستگی اور اخلاقی ذمہ داری کی بنیاد پر عطا کی گئی۔

تاہم یہاں یہ بات بھی سمجھنا ضروری ہے کہ یہ عروج کسی معجزاتی یا اتفاقی عمل کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ دین کے ساتھ گہری، شعوری اور عملی وابستگی کا ثمر تھا۔ صحابہؓ نے دین کو صرف

قبول نہیں کیا بلکہ اسے اپنی زندگی کا محور بنا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں وہ تاریخ کی سمت بدلنے والی قوت بن گئے۔

اس تاریخی حقیقت کو سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ آگے چل کر ہم دیکھ سکیں کہ جب یہی وابستگی کمزور پڑی تو زوال کا عمل کیسے شروع ہوا۔ آگے ہم خلافتِ راشدہ، اس کے بعد کے ادوار اور پھر بتدریج پیدا ہونے والی کمزوریوں کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

(خلافتِ راشدہ، دین کی عملی بالادستی، عدل، شوریٰ اور اخلاقی قیادت)

اسلامی تاریخ میں خلافتِ راشدہ کا دور محض ایک سیاسی نظام نہیں بلکہ دین کے عملی نفاذ کی زندہ مثال ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں دین، ریاست، معاشرہ اور اخلاق ایک دوسرے سے جدا نہیں تھے بلکہ ایک ہی مقصد کے تحت منظّم تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جسے نبی کریم ﷺ نے خود ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' قرار دیا، اور یہی وہ معیار ہے جس کی روشنی میں بعد کے تمام ادوار کو پرکھا جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد سب سے پہلا اور اہم سوال قیادت کا تھا، مگر یہ سوال اقتدار، طاقت یا نسب کی بنیاد پر نہیں بلکہ دین، اہلیت اور اعتماد کی بنیاد پر حل کیا گیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا انتخاب اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ابتدائی مسلم معاشرے میں قیادت کو دینی ذمہ داری سمجھا جاتا تھا، نہ کہ ذاتی مفاد یا خاندانی حق۔

حضرت ابو بکرؓ کے پہلے خطبے میں دین کی سیاسی اور اخلاقی روح پوری طرح جھلکتی ہے۔ آپؓ نے فرمایا:

''تم میں سے جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک طاقتور ہے جب تک میں اس کا حق دلوا نہ دوں، اور تم میں سے جو طاقتور ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے جب تک میں اس سے

حق وصول نہ کرلوں۔"

یہ الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ خلافت کا مقصد اقتدار نہیں بلکہ عدل کا قیام تھا، اور یہی عدل دین کی روح ہے۔

خلافتِ راشدہ میں شوریٰ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ قرآنِ مجید نے اہلِ ایمان کی صفات میں شوریٰ کو نمایاں طور پر ذکر کیا ہے:

"اور ان کا کام آپس میں مشورہ کرنا ہے" (سورۃ الشوریٰ: آیت 38)

یہ آیت محض ایک اخلاقی نصیحت نہیں بلکہ اجتماعی نظم کی بنیاد ہے۔ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں شوریٰ کا نظام نہایت مضبوط تھا، یہاں تک کہ ایک عام شہری بھی خلیفہ وقت سے سوال کر سکتا تھا، اور خلیفہ کو جواب دینا لازم سمجھا جاتا تھا۔

حضرت عمرؓ کی خلافت کو عدل و انصاف کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ان کا مشہور قول:

"اگر فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر جائے تو عمر اس کا ذمہ دار ہوگا"

اس بات کی دلیل ہے کہ دین کی وابستگی صرف عبادات تک محدود نہیں تھی بلکہ حکمران خود کو رعایا کے ہر فرد کے لیے جواب دہ سمجھتا تھا۔ یہی احساسِ جواب دہی دین کی اصل طاقت ہے۔

خلافتِ راشدہ کے دور میں قانون کی بالادستی حقیقی معنوں میں قائم تھی۔ کوئی شخص، چاہے وہ خلیفہ ہی کیوں نہ ہو، قانون سے بالاتر نہیں تھا۔ حضرت علیؓ کا ایک یہودی کے ساتھ عدالت میں پیش ہونا اسلامی عدل کی ایک روشن مثال ہے، جہاں قاضی نے خلیفہ کے حق میں نہیں بلکہ دلیل کی بنیاد پر فیصلہ دیا۔ یہ واقعہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ دین

اقتدار کا محافظ نہیں بلکہ انصاف کا ضامن تھا۔

دین کی اس عملی بالادستی نے معاشرے میں اعتماد، اطمینان اور اخلاقی استحکام پیدا کیا۔ لوگ دین کو صرف خطبات یا عبادات میں نہیں بلکہ روزمرہ زندگی میں انصاف، دیانت اور ذمہ داری کی صورت میں دیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی دعوت تلوار سے نہیں بلکہ کردار سے پھیلی۔ غیر مسلم اقوام نے مسلمانوں کے عدل اور اخلاق سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا۔

قرآنِ مجید نے اس کامیابی کا راز واضح الفاظ میں بیان کیا ہے:

اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے، انہیں زمین میں اقتدار عطا کرے گا۔ (سورۃ النور: آیت 55)

یہ آیت اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ عروج کا تعلق ایمان اور عمل کے ساتھ ہے، نہ کہ محض طاقت یا وسائل کے ساتھ۔

خلافتِ راشدہ کے بعد جب دین کی یہ عملی وابستگی برقرار رہی، تو امت ترقی کرتی رہی، مگر جیسے جیسے اقتدار میں شخصی مفادات، عصبیت اور دنیا پرستی داخل ہوتی گئی، دین اور اقتدار کے درمیان فاصلہ بڑھنے لگا۔ یہ فاصلہ ابتدا میں بہت معمولی تھا، مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہی معمولی انحراف بڑے زوال کی بنیاد بن گیا۔

یہاں یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد آنے والے ادوار کو مکمل طور پر دین سے خالی نہیں کہا جا سکتا۔ علم، فقہ اور تمدن میں ترقی جاری رہی، مگر دین کا وہ زندہ اور جواب دہ نظام جو خلافتِ راشدہ میں نظر آتا تھا، بتدریج کمزور ہونے لگا۔ یہی کمزوری آگے چل کر دین سے دوری کے اجتماعی اسباب میں تبدیل ہوئی۔ امت کا عروج کسی معجزاتی نظام کا نتیجہ نہیں بلکہ دین کے ساتھ گہری، عملی اور اخلاقی وابستگی کا ثمر تھا۔ جب دین فرد،

قیادت اور ریاست کی بنیاد بن جائے تو کم وسائل کے باوجود عظیم نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اور جب یہی دین محض رسمی یا جزوی بن جائے تو بڑی سلطنتیں بھی اندر سے کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔

(خلافتِ راشدہ کے بعد کا دور، سیاسی تبدیلیاں، اور دین و اقتدار کے درمیان بڑھتا ہوا فاصلہ)

خلافتِ راشدہ کا اختتام اسلامی تاریخ کا وہ نازک موڑ ہے جہاں سے امت کے اجتماعی سفر کی سمت بتدریج بدلنا شروع ہوتی ہے۔ یہ تبدیلی نہ اچانک تھی، نہ مکمل، اور نہ ہی اس کا مطلب یہ تھا کہ دین یکسر معاشرے سے غائب ہو گیا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دین اپنی جگہ موجود رہا، مگر اس کی اجتماعی بالادستی اور اخلاقی مرکزیت آہستہ آہستہ کمزور ہونے لگی۔

حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت کے آخری حصے میں جو فتنہ پیدا ہوا، وہ محض ایک سیاسی بحران نہیں تھا بلکہ اس نے امت کے اندر پہلی بار منظّم اختلاف، بداعتمادی اور طاقت کے استعمال کو جنم دیا۔ قرآنِ مجید نے جس فتنہ کو صرف ظالموں تک محدود نہ رہنے والا قرار دیا تھا، وہ عملی صورت میں ظاہر ہوا:

اور اس عظیم فتنے سے بچ جاؤ جو لازماً ان لوگوں کو خاص طور پر نہیں پہنچے گا جنھوں نے تم میں سے ظلم کیا اور جان لو کہ اللہ بہت سخت سزا والا ہے۔ (سورۃ الأنفال: آیت 25)

اور حقیقت ہے کہ یہ فتنہ صرف قاتلین حضرت عثمانؓ یا باغیوں تک محدود نہ رہا بلکہ اس کے اثرات پوری امت پر پڑے۔

حضرت علیؓ کے دور میں داخلی جنگیں، جیسے جنگِ جمل اور جنگِ صفین، امت کے لیے نہایت دردناک مگر سبق آموز مراحل تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب پہلی بار امت مسلمہ کے

خلاف سازش کے ذریعے ایسے اختلافات پیدا کیے گئے جنہوں نے مسلح تصادم کی صورت اختیار کی۔ ان جنگوں کے نتیجے میں دونوں طرف سے ہزاروں مسلمان اپنی جان سے چلے گئے۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد اموی دور کا آغاز ہوا۔ حضرت امیر معاویہؓ کے دور میں بھی اسلامی سلطنت کو کافی عروج ملا، لیکن ان کے بعد اقتدار کی نوعیت بدل گئی۔ اقتدار جو پہلے دینی امانت سمجھا جاتا تھا، رفتہ رفتہ سیاسی طاقت میں بدلنے لگا۔ اموی دور میں بہت سے حکمران ذاتی طور پر دیندار تھے، مگر نظام کی سطح پر عدل، شفافیت اور جواب دہی میں کمی آتی چلی گئی۔ نتیجتاً دین عوام کے لیے ایک اخلاقی و روحانی سہارا تو رہا، مگر ریاستی نظم میں اس کی حیثیت ثانوی ہوتی گئی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں دین اور دنیا کی عملی تقسیم کی بنیاد پڑی۔ یہ کہنا درست نہیں کہ اس دور میں دین مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا، مگر یہ ضرور حقیقت ہے کہ دین اور اقتدار کے درمیان وہ فطری ہم آہنگی باقی نہ رہی جو خلافتِ راشدہ کا خاصہ تھی۔

عباسی دور میں علم، فقہ، فلسفہ اور تمدن نے بے مثال ترقی کی۔ بغداد علم و دانش کا عالمی مرکز بنا، اور اسلامی علوم کو باقاعدہ مدون کیا گیا۔ مگر اس علمی عروج کے ساتھ ساتھ سیاسی سطح پر بادشاہت کا نظام مزید مستحکم ہوتا گیا۔ علما اور حکمرانوں کے درمیان فاصلہ بڑھنے لگا، اور دین زیادہ تر فرد اور مدرسے تک محدود ہوتا چلا گیا۔

یہاں ایک نہایت نازک مگر اہم نکتہ سامنے آتا ہے:

جب دین اقتدار کا اخلاقی نگران ہونے کے بجائے اس کا تابع بن جائے تو دین کی اصلاحی قوت کمزور ہو جاتی ہے۔ بہت سے علما نے اس صورتحال پر تنقید بھی کی، مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ تقسیم معاشرتی حقیقت بن گئی۔ دین ''نجات'' اور ''عبادت'' تک محدود ہونے لگا، جبکہ سیاست، معیشت اور طاقت کے معاملات کو ''دنیاوی ضرورت'' کہہ کر الگ کر دیا گیا۔

یہی وہ تاریخی لمحہ ہے جہاں سے دین سے دوری کا عمل اجتماعی سطح پر شروع ہوتا ہے۔عوام دین کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے رہے، مگر اسے زندگی کے بڑے فیصلوں سے الگ سمجھنے لگے۔ دین اب سوال اٹھانے، نظام بدلنے اور ظلم کے خلاف اجتماعی مزاحمت کی قوت کم کم رکھتا تھا۔

قرآنِ مجید نے بنی اسرائیل کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اسی طرز کے زوال کی طرف اشارہ کیا تھا، جہاں کتاب موجود تھی مگر اس کی روح سے وابستگی کمزور ہو چکی تھی۔

پھر ان کے بعد ایسے نالائق جانشین ان کی جگہ آئے جنھوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے تو وہ عنقریب گمراہی کو ملیں گے۔(سورۃ مریم: آیت 59)

یہ صرف نماز چھوڑنے کی بات نہیں بلکہ اقدار، ترجیحات اور اجتماعی ذمہ داریوں کے ضائع ہونے کی علامت ہے۔

امت کا زوال کسی ایک حکمران، ایک جنگ یا صرف ایک سازش کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ یہ ایک تدریجی تاریخی عمل تھا جس میں دین کی اجتماعی مرکزیت کمزور ہوتی گئی۔ یہی کمزوری آگے چل کر نوآبادیاتی دور، فکری غلامی اور جدید لادینیت کے لیے زمین ہموار کرتی ہے۔

آگے ہم یہ جائزہ لیں گے کہ کس طرح علمی ترقی کے باوجود اخلاقی اور سیاسی زوال بڑھتا گیا، اور دین عوامی زندگی سے مزید پیچھے ہٹتا چلا گیا۔

(علمی عروج، سیاسی و اخلاقی زوال، اور دین کی اجتماعی حیثیت کا مزید کمزور ہونا)

اسلامی تاریخ کا ایک نہایت اہم اور بظاہر متضاد مرحلہ وہ ہے جب امتِ مسلمہ علمی، فکری اور تمدنی اعتبار سے دنیا کی قیادت کر رہی تھی، مگر اسی دوران اخلاقی، سیاسی اور

دینی اعتبار سے اس کے اندر کمزوریاں جڑ پکڑ رہی تھیں۔ یہ وہ دور ہے جسے اکثر صرف ''سنہری دور'' کہہ کر پیش کیا جاتا ہے، مگر ایک سنجیدہ تاریخی مطالعہ اس تصویر کو زیادہ پیچیدہ اور سبق آموز بناتا ہے۔

عباسی دور خصوصاً اس تضاد کی نمایاں مثال ہے۔ بغداد، قرطبہ، قاہرہ اور سمرقند جیسے شہر علم و دانش کے عالمی مراکز بن چکے تھے۔ قرآن، حدیث، فقہ، فلسفہ، طب، فلکیات اور ریاضی میں ایسی ترقی ہوئی جس کی مثال دنیا میں کم ملتی ہے۔ بیت الحکمہ جیسے ادارے قائم ہوئے، یونانی علوم کا ترجمہ ہوا، اور اسلامی فکر نے عقل اور وحی کے درمیان ایک متوازن رشتہ قائم کیا۔ یہ سب کچھ اس بات کی دلیل ہے کہ دین علم کا دشمن نہیں بلکہ اس کا محرک ہے۔

قرآنِ مجید نے علم کی فضیلت کو بار بار بیان کیا ہے:

کہہ دے کیا برابر ہیں وہ لوگ جو جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے؟ (سورۃ الزمر: آیت 9)

لیکن قرآن نے علم کو کبھی اخلاق، تقویٰ اور جواب دہی سے جدا نہیں کیا۔ مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب علم تو بڑھتا ہے، مگر دین کی اخلاقی اور اصلاحی روح کمزور پڑ جاتی ہے۔

اسی دور میں ہمیں یہ حقیقت نظر آتی ہے کہ علم بڑی حد تک علما، مدارس اور علمی حلقوں تک محدود ہوتا چلا گیا، جبکہ اقتدار، سیاست اور ریاستی نظم ایک الگ دائرہ بن گیا۔ علما کی ایک بڑی تعداد نے فتنوں سے بچنے اور دین کی حفاظت کے لیے اقتدار سے فاصلہ اختیار کیا، جو ایک حد تک قابلِ فہم تھا، مگر اس کے نتیجے میں دین کی اجتماعی نگرانی کمزور پڑ گئی۔

یہاں سے دین اور اقتدار کے درمیان ایک خاموش مگر گہری خلیج پیدا ہوئی۔ حکمران طبقہ دین کو اپنی مشروعیت کے لیے استعمال کرتا رہا، مگر خود کو اس کے اخلاقی تقاضوں

کا پابند سمجھنے میں کمزور ہوتا چلا گیا۔ دوسری طرف عوام کے لیے دین زیادہ تر عبادات، فقہی مسائل اور نجاتِ اخروی تک محدود ہو گیا۔ یہی تقسیم آگے چل کر دین سے دوری کے اجتماعی شعور میں بدل گئی۔

نبی کریم ﷺ نے جس علم کی تعریف فرمائی، وہ ایسا علم تھا جو خشیتِ الٰہی پیدا کرے:

" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کی طرف دیکھا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ وہ وقت ہے جب علم کو اٹھا لیا جائے گا انصار میں سے ایک صاحب جن کا نام لبید بن زیاد تھا انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا علم کو اٹھا لیا جائے گا جبکہ اسے ثابت کیا جا چکا ہے اور دلوں نے اسے محفوظ کر لیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں تو تمہیں اہل مدینہ کا سب سے زیادہ سمجھدار شخص سمجھتا ہوں۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسائیوں اور یہودیوں کے پاس اللہ کی کتاب ہونے کے باوجود ان کے گمراہ ہونے کا ذکر کیا۔" (صحیح ابن حبان حدیث:4572)

جب علم خشیت، عدل اور ذمہ داری پیدا نہ کرے تو وہ دین کو مضبوط کرنے کے بجائے اسے کمزور بھی کر سکتا ہے۔

اسی دور میں ایک اور اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ عوام اور حکمرانوں کے درمیان فاصلے بڑھتے گئے۔ سادگی، احتساب اور جواب دہی کی جگہ شاہانہ طرزِ زندگی، درباری کلچر اور طبقاتی فرق نے لے لی۔ یہ سب کچھ دین کی اصل روح کے خلاف تھا، مگر چونکہ ظاہری طور پر دین موجود تھا، اس لیے یہ تضاد زیادہ شدت سے محسوس نہ کیا گیا۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب دین محض ''مقدس روایت'' بن جائے اور زندہ اخلاقی قوت نہ رہے تو معاشرہ اندر سے کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ یہی وہ کیفیت تھی جس میں امت

علمی لحاظ سے بلند، مگر عملی لحاظ سے کمزور ہوتی چلی گئی۔ یہ کمزوری فوری زوال کا سبب نہیں بنی، مگر اس نے امت کی مدافعتی قوت کو ضرور کم کر دیا۔

اسی کمزوری کا فائدہ بعد میں آنے والے بیرونی حملہ آوروں نے اٹھایا۔ تاتاری حملے، صلیبی جنگیں اور داخلی بغاوتیں اس بات کی علامت تھیں کہ امت کے اندر وہ اخلاقی اور فکری وحدت باقی نہ رہی تھی جو خلافتِ راشدہ کا خاصہ تھی۔ اگرچہ دین اب بھی موجود تھا، مگر اس کی وہ قوت جو ظلم کو روک سکے، اقتدار کو جواب دہ بنا سکے اور معاشرے کو ایک سمت میں رکھ سکے، کمزور ہو چکی تھی۔

رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی

واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی
برق طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی

یہی وہ مرحلہ ہے جہاں دین سے دوری ایک واضح اجتماعی صورت اختیار کرنے لگتی ہے۔ لوگ دین کو عزت دیتے ہیں، اس سے محبت بھی کرتے ہیں، مگر اسے زندگی کے نظام بدلنے والی قوت نہیں سمجھتے۔ یہی ذہنیت آگے چل کر جدید دور میں سیکولرازم، قوم پرستی اور لادینیت کے قبولِ عام کی بنیاد بنتی ہے۔

قرآنِ مجید نے ایسی ہی اقوام کے بارے میں خبردار فرمایا تھا:

اللہ کے نزدیک یہ بات سخت ناپسندیدہ ہے کہ تم وہ کہو جو خود نہ کرو۔ (سورۃ الصّف: آیت 3)

یہ آیت صرف فرد کے نفاق کی نہیں بلکہ اجتماعی تضاد کی بھی نشاندہی کرتی ہے۔

مختصر یہ کہ امتِ مسلمہ کا مسئلہ علم کی کمی نہیں تھا، بلکہ دین اور عمل، علم اور اخلاق، اقتدار اور جواب دہی کے درمیان بڑھتا ہوا فاصلہ تھا۔ یہی فاصلہ بعد کے ادوار میں مزید گہرا

ہوتا چلا گیا اور بالآخر جدید دور میں دین سے دوری اور لادینیت کی صورت میں سامنے آیا۔

آگے ہم اس سوال کا جواب تلاش کریں گے کہ جب بیرونی طاقتیں آئیں تو امت اتنی کمزور کیوں تھی؟ اور یہ کمزوری نوآبادیاتی دور میں کس طرح فکری غلامی میں بدل گئی؟

(بیرونی حملے، داخلی کمزوریاں، نوآبادیاتی دور اور دین سے اجتماعی دوری کی تکمیل)

اسلامی تاریخ کا زوال محض بیرونی حملوں کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ یہ زوال دراصل اندرونی کمزوریوں اور بیرونی دباؤ کے امتزاج سے وجود میں آیا۔ جب کوئی تہذیب اپنے اندر اخلاقی وحدت، فکری وضاحت اور دینی مرکزیت کھو دیتی ہے تو بیرونی طاقتیں محض اس عمل کو تیز کر دیتی ہیں، پیدا نہیں کرتیں۔ امتِ مسلمہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

تاتاری حملے اسلامی تاریخ کا سب سے ہولناک باب سمجھے جاتے ہیں۔ بغداد، جو صدیوں تک علم، دین اور تہذیب کا مرکز رہا تھا، 1258ء میں منگولوں کے ہاتھوں تباہ ہوا۔ یہ صرف ایک شہر کی تباہی نہیں تھی بلکہ ایک تہذیبی زخم تھا۔ کتب خانوں کی کتابیں دجلہ میں بہا دی گئیں، علما قتل ہوئے، اور علمی مراکز مٹ گئے۔ مگر یہ سوال اپنی جگہ باقی رہتا ہے:

کیا اتنی عظیم امت صرف تلوار سے شکست کھا سکتی تھی؟

حقیقت یہ ہے کہ تلوار نے وہ کام مکمل کیا جو اندرونی کمزوری پہلے ہی کر چکی تھی۔

اسی طرح صلیبی جنگیں محض عسکری تصادم نہیں تھیں بلکہ تہذیبی اور مذہبی کشمکش کا اظہار تھیں۔ اگرچہ مسلمانوں نے بالآخر بیت المقدس واپس حاصل کر لیا، مگر ان جنگوں نے امت کو اندر سے کمزور کر دیا۔ فرقہ واریت، سیاسی انتشار اور اخلاقی زوال نے اجتماعی مزاحمت کی قوت کو کم کر دیا تھا۔ دین عوام کے دلوں میں تو زندہ تھا، مگر اجتماعی نظم میں اس کی

مرکزیت باقی نہ رہی تھی۔

قرآنِ مجید نے بار بار اس اصول کی طرف توجہ دلائی ہے کہ زوال کی اصل وجہ باہر نہیں بلکہ اندر ہوتی ہے:

''اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں، پھر وہ نافرمانی کرتے ہیں، تو اس پر بات ثابت ہو جاتی ہے، پھر ہم اسے تباہ کر دیتے ہیں۔'' (سورة الاسراء: آیت 16)

اور جیسا کہ سورۃ الرعد، آیت 11 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے **''بے شک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔''**

یہ آیات اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ بیرونی شکست دراصل اندرونی انحراف کا ظاہری نتیجہ ہوتی ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلم دنیا مختلف چھوٹی بڑی سلطنتوں میں تقسیم ہوتی چلی گئی۔ عثمانی خلافت ایک عرصے تک بظاہر دین اور ریاست کے ربط کو کسی حد تک برقرار رکھنے میں کامیاب رہی، مگر وہاں بھی وقت کے ساتھ اصلاحی روح کمزور پڑتی گئی۔ مسلمان اصل دین (قرآن وسنت) سے دور ہوتے چلے گئے اور بدعات کا شکار ہو گئے۔ عملی دین کی جگہ تصوف، یونانی، میسوپوٹیمین اور اپنیشد کے فلسفوں نے لے لی۔ اجتہاد کے دروازے محدود ہوئے، تقلید نے جمود کو جنم دیا، اور دین بتدریج عوامی رسوم اور رسمی شناخت تک محدود ہونے لگا۔

انیسویں صدی میں جب یورپی طاقتیں سائنسی، صنعتی اور عسکری اعتبار سے برتر ہو چکی تھیں، تو مسلم دنیا نوآبادیاتی تسلط کا شکار ہو گئی۔ یہ دور محض زمینوں کی غلامی کا نہیں بلکہ فکر، علم اور تہذیب کی غلامی کا آغاز تھا۔ برطانوی، فرانسیسی اور دیگر استعماری طاقتوں نے

مسلم معاشروں کے تعلیمی، قانونی اور سیاسی ڈھانچوں کو بدل دیا۔

نوآبادیاتی دور میں دین کو دانستہ طور پر اجتماعی زندگی سے الگ کیا گیا۔ شریعت کو عدالتوں سے نکال کر ذاتی عبادات تک محدود کر دیا گیا، اور مغربی قوانین، نصاب اور اقدار کو "ترقی" کا معیار بنا دیا گیا۔ نتیجتاً ایک ایسی نسل پروان چڑھی جو دین کو احترام کی نگاہ سے تو دیکھتی تھی، مگر اسے جدید دنیا کے مسائل کے حل کے قابل نہیں سمجھتی تھی۔

یہی وہ مقام ہے جہاں دین سے دوری ایک اجتماعی شعور بننے لگی۔ دین اب شناخت تو تھا، مگر رہنمائی نہیں۔ عبادت موجود تھی، مگر نظام غائب تھا۔ اخلاقی تعلیم باقی تھی، مگر ریاستی و معاشرتی سطح پر اس کا نفاذ نہیں تھا۔ یہی خلا بعد میں سیکولرازم، قوم پرستی اور جدید لادین نظریات کے لیے زرخیز زمین ثابت ہوا۔

رسول اللہ ﷺ نے ایسے ہی دور کے بارے میں خبردار فرمایا تھا:

سیدنا انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بے شک علم کا اُٹھا لیا جانا، جہالت کا عام ہو جانا، شراب پیا جانا اور زنا عام ہو جانا قیامت کی نشانیوں میں سے ہے" (صحیح بخاری: حدیث 6808)

دین سے دوری کا عمل کسی ایک دن یا ایک واقعے میں مکمل نہیں ہوا، بلکہ یہ صدیوں پر پھیلا ہوا ایک تدریجی تاریخی عمل تھا۔ ابتدا میں دین کی اجتماعی مرکزیت کمزور ہوئی، پھر اخلاقی جواب دہی ختم ہوئی، اس کے بعد اقتدار دین سے آزاد ہو گیا، اور آخرکار نوآبادیاتی نظام نے اس تقسیم کو مستقل شکل دے دی۔

اسی تاریخی پس منظر کو سمجھے بغیر آج کی لادینیت، تشکیک اور دینی بے زاری کو سمجھنا ممکن نہیں۔ آج کے مسلمان نوجوان کے ذہن میں جو سوالات، شکوک اور تضادات ہیں، وہ دراصل اسی طویل تاریخی سفر کا نتیجہ ہیں۔

باب دوم کا خلاصہ

باب دوم نے یہ واضح کر دیا کہ:

- امت کا عروج دین کی اجتماعی وابستگی کا نتیجہ تھا
- زوال کی اصل وجہ اندرونی فکری و اخلاقی کمزوریاں تھیں
- بیرونی حملے اور نوآبادیات نے اس زوال کو مکمل کیا
- دین بتدریج زندگی کے مرکز سے ہٹ کر حاشیے پر چلا گیا

باب 03

جدید فکری و تہذیبی اسبابِ لادینیت

(جدید دور، فکری بحران، اور مسلمان ذہن کی نئی کشمکش)

جدید دور میں مسلمانوں کے اندر دین سے دوری اور لادینیت کا مسئلہ صرف عبادات کی کمی یا اخلاقی زوال تک محدود نہیں رہا، بلکہ یہ ایک گہرے فکری بحران کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ آج کا مسلمان صرف یہ سوال نہیں کرتا کہ میں دین پر عمل کیوں نہیں کر رہا؟ بلکہ وہ یہ بھی پوچھتا ہے کہ کیا دین واقعی زندگی کی رہنمائی کے قابل ہے؟

یہ سوال اپنی نوعیت میں نہایت سنجیدہ ہے، کیونکہ یہ ایمان اور انکار کے درمیان کھڑے ایک ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔

باب دوم میں ہم نے دیکھا کہ تاریخی طور پر دین کی اجتماعی مرکزیت کیسے کمزور ہوئی۔ باب سوم میں ہم اس سے ایک قدم آگے بڑھتے ہیں اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جدید دنیا نے مسلمان ذہن پر کون سے فکری دباؤ ڈالے جنہوں نے دین کو محض ایک ''روایت'' یا ''ثقافتی شناخت'' بنا کر رکھ دیا۔

جدید دور کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے علم، طاقت اور سچائی کے مصادر کو بدل دیا۔ صدیوں تک وحی، روایت اور اخلاق انسان کے لیے حق و باطل کا معیار رہے، مگر جدید یورپی فکر نے عقلِ محض، تجربہ اور مادہ کو واحد معیار بنا دیا۔ اس تبدیلی نے نہ صرف مغرب بلکہ پوری دنیا کے فکری نقشے کو بدل دیا، اور مسلمان بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے۔

یورپ میں نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) اور بعد ازاں روشن خیالی (Enlightenment) کی تحریکیں دراصل کلیسا کے ظلم، مذہبی جبر اور فکری جمود کے

خلاف ردِعمل تھیں۔ مگر یہ ردِعمل بتدریج مذہب دشمنی میں بدل گیا۔ خدا کو کائنات کے مرکز سے ہٹا کر انسان کو محور بنا دیا گیا، اور وحی کے بجائے عقل کو حاکمِ مطلق قرار دیا گیا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں سیکولرازم اور لادینیت نے جنم لیا۔

مسئلہ یہ تھا کہ مغرب کا یہ تجربہ — جو اس کی اپنی مذہبی تاریخ کا نتیجہ تھا — بلا تنقید مسلم دنیا میں درآمد کر لیا گیا۔ حالانکہ اسلام اور عیسائیت کی مذہبی تاریخ، ساخت اور کردار یکساں نہیں تھے۔ اسلام میں نہ کلیسا تھا، نہ پاپائیت، نہ وحی اور عقل کے درمیان وہ تصادم تھا جو یورپ نے دیکھا۔ مگر اس کے باوجود مغربی فکر کو ''عالمی سچ'' سمجھ کر اپنایا گیا۔

نوآبادیاتی دور میں یہ فکری یلغار مزید گہری ہو گئی۔ مغربی طاقتوں نے صرف زمینوں پر قبضہ نہیں کیا بلکہ ذہنوں کو بھی مسخر کیا۔ انگریزی تعلیم، مغربی نصاب، جدید قوانین اور سیکولر ادارے متعارف کروائے گئے۔ نتیجتاً ایک ایسی مسلمان اشرافیہ پیدا ہوئی جو مذہبی طور پر مسلمان تھی، مگر فکری طور پر مغرب کی پیروکار بن چکی تھی۔

یہ وہی طبقہ تھا جس نے دین کو ''ذاتی عقیدہ'' اور ریاست کو ''غیر مذہبی نظام'' قرار دیا۔ اس تقسیم کو ترقی، جدیدیت اور عقلیت کا نام دیا گیا۔ آہستہ آہستہ یہ تصور عام لوگوں کے ذہن میں بھی سرایت کرتا چلا گیا کہ دین جدید زندگی کے لیے ناکافی ہے۔

قرآنِ مجید نے اس ذہنی غلامی کی طرف بہت پہلے اشارہ فرمایا تھا:

اور تجھ سے یہودی ہرگز راضی نہ ہوں گے اور نہ نصاریٰ، یہاں تک کہ تو ان کی ملت کی پیروی کرے۔ (سورۃ البقرہ: آیت 120)

یہ آیت صرف مذہبی اختلاف کی نہیں بلکہ فکری دباؤ کی بھی نشاندہی کرتی ہے۔

جدید تعلیم نے اگرچہ سائنسی اور فنی ترقی دی، مگر اس کے ساتھ ایک خطرناک خلا

بھی پیدا کیا۔ نئی نسل کو "**کیسے جینا ہے**" تو سکھایا گیا، مگر "**کیوں جینا ہے**" کا جواب نہیں دیا گیا۔ جب مقصدِ حیات دھندلا جائے تو دین غیر متعلق محسوس ہونے لگتا ہے، اور یہی احساس لادینیت کی پہلی سیڑھی بنتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جدید مسلمان نوجوان لادین اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ اخلاق سے نفرت کرتا ہے، بلکہ اکثر وہ اخلاق کی تلاش میں دین سے دور ہوتا ہے۔ جب اسے دین صرف سختی، تضاد یا غیر عقلی پابندیوں کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے تو وہ جدید فلسفوں میں معنی تلاش کرنے لگتا ہے۔ یہ ایک فکری بھٹکاؤ ہے، بغاوت نہیں۔

نبی کریم ﷺ نے ایسے فتنوں کے بارے میں پیشگی خبردار فرمایا تھا: "اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں سے چھینتے ہوئے نہیں اٹھائے گا بلکہ وہ علماء کو اٹھا کر علم کو اٹھا لے گا حتیٰ کہ جب وہ (لوگوں میں) کسی عالم کو (باقی) نہیں چھوڑے گا تو لوگ (دین کے معاملات میں بھی) جاہلوں کو اپنے سربراہ بنالیں گے۔ ان سے (دین کے بارے میں) سوال کیے جائیں گے تو وہ علم کے بغیر فتوے دیں گے، اس طرح خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔" (صحیح مسلم حدیث:6796)

جدید لادینیت محض خواہشات یا اخلاقی بگاڑ کا نتیجہ نہیں، بلکہ ایک گہرے فکری بحران کا اظہار ہے۔ یہ بحران اس وقت پیدا ہوا جب مسلمان ذہن نے اپنی فکری خوداعتمادی کھودی اور دوسروں کے تصورات کو معیارِ حق مان لیا۔

(سیکولرازم، عقل و وحی کا مغالطہ، اور جدید علم کا فکری دباؤ)

جدید دور میں دین سے دوری کا سب سے طاقتور فکری ذریعہ سیکولرازم ہے، مگر مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت نہ اسے پوری طرح سمجھتی ہے اور نہ اس کے اثرات کو پہچان پاتی ہے۔ اکثر سیکولرازم کو محض "مذہبی رواداری" یا "ریاستی غیر جانبداری" سمجھ لیا جاتا

ہے، حالانکہ حقیقت اس سے کہیں زیادہ گہری اور پیچیدہ ہے۔

سیکولرازم دراصل ایک مکمل فکری تصور ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مذہب انسان کی نجی زندگی تک محدود رہے، جبکہ اجتماعی، سیاسی، تعلیمی اور معاشی فیصلے مذہب سے آزاد ہوں۔ یہ تصور یورپ کے مخصوص تاریخی تجربے کا نتیجہ تھا، جہاں کلیسا نے علم، سیاست اور آزادی پر ناجائز تسلط قائم کر رکھا تھا۔ یورپ نے جب اس جبر کے خلاف بغاوت کی تو اس نے مذہب ہی کو مسئلے کی جڑ سمجھ لیا۔

اسلامی تناظر میں یہ نقطہ نظر بنیادی طور پر ناقص ہے، کیونکہ اسلام میں نہ کلیسا تھا، نہ پاپائیت، اور نہ ہی وحی اور عقل کے درمیان وہ جنگ جو مغرب نے دیکھی۔ اسلام نے ابتدا ہی سے عقل کو مخاطب کیا، سوال اٹھانے کی دعوت دی، اور کائنات میں غور و فکر کو عبادت قرار دیا۔

قرآنِ مجید بار بار کہتا ہے:

﴿أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾، ﴿أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ﴾، ﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ﴾

یہ آیات اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ اسلام عقل کا دشمن نہیں بلکہ اس کا رہنما ہے۔

لیکن جدید مسلمان ذہن کو یہ تاثر دیا گیا کہ دین اور عقل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں سائنس کو "**حقیقت**" اور دین کو "**عقیدہ**" کہہ کر الگ خانوں میں بانٹ دیا گیا۔ نتیجتاً نوجوان ذہن یہ سمجھنے لگا کہ اگر وہ سائنسی اور عقلی ہے تو اسے دینی ہونا چھوڑنا پڑے گا۔ یہی وہ فکری مغالطہ ہے جو لادینیت کی بنیاد بنتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے کبھی سائنس کی مخالفت نہیں کی۔ مسلم تاریخ میں

بڑے سائنسدان، طبیب، فلسفی اور ماہرِ فلکیات سب دین دار لوگ تھے۔ ابن الہیثم، البیرونی، ابن سینا اور الخوارزمی جیسے علماء کے لیے سائنس دین سے بغاوت نہیں بلکہ کائنات میں اللہ کی نشانیوں کو سمجھنے کا ذریعہ تھی۔

قرآنِ مجید فرماتا ہے:

عنقریب ہم انھیں اپنی نشانیاں دنیا کے کناروں میں اور ان کے نفسوں میں دکھلائیں گے (سورۃ فصلت: آیت 53)

یہ آیت سائنس اور وحی کے درمیان ہم آہنگی کا واضح اعلان ہے۔

مسئلہ سائنس نہیں بلکہ سائنس پرستی (Scientism) ہے، یعنی یہ دعویٰ کہ صرف سائنسی طریقہ ہی سچائی تک پہنچا سکتا ہے۔ یہ دعویٰ خود سائنسی نہیں بلکہ فلسفیانہ ہے۔ سائنس ''کیا ہے'' بتاتی ہے، مگر ''کیوں ہے'' کا جواب نہیں دیتی۔ زندگی کا مقصد، اخلاق کی بنیاد، خیر و شر کا معیار — یہ سب سوالات سائنس کے دائرے سے باہر ہیں۔ جب ان سوالات کو نظر انداز کیا جاتا ہے تو انسان فکری خلا کا شکار ہو جاتا ہے۔

یہی فکری خلا جدید انسان کو بے چینی، اضطراب اور معنویت کے بحران میں مبتلا کرتا ہے۔ مسلمان نوجوان بھی اسی بحران سے گزرتا ہے۔ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی دیکھتا ہے، مگر روحانی سکون نہیں پاتا۔ جب دین اسے صرف ماضی کی کہانی یا رسمی عبادت کے طور پر پیش کیا جائے تو وہ جدید نظریات میں معنی تلاش کرنے لگتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایسے فکری فتنوں کی طرف اشارہ فرمایا تھا: ''قیامت سے پہلے سخت تاریک رات کی طرح فتنے (ظاہر) ہوں گے، جن میں آدمی صبح کو مومن ہوگا اور شام میں کافر ہو جائے گا، شام میں مومن ہوگا اور صبح کو کافر ہو جائے گا، دنیاوی ساز و سامان کے بدلے کچھ لوگ اپنا دین بیچ دیں گے''۔ (سنن ترمذی- حدیث: 2197)

یہ فتنہ تلوار کا نہیں بلکہ خیالات اور تصورات کا ہے۔

سیکولرازم کا ایک اور خطرناک پہلو یہ ہے کہ وہ اخلاق کو بھی مذہب سے جدا کر دیتا ہے۔ اخلاق اب **"الٰہی ذمہ داری"** نہیں بلکہ **"سماجی معاہدہ"** بن جاتا ہے۔ جب مفاد بدلتا ہے تو اخلاق بھی بدل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید دنیا میں قانون موجود ہے، مگر انصاف کمزور ہے؛ سہولتیں ہیں، مگر سکون ناپید ہے۔

قرآنِ مجید نے ایسے اخلاقی زوال کی جڑ واضح کی ہے:

پھر کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنا معبود اپنی خواہش کو بنا لیا۔ (سورۃ الجاثیہ: آیت 23)

جب خواہش انسان کا خدا بن جائے تو عقل بھی اس کی خادم بن جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جدید لادینیت کا بڑا سبب دین کی کمزوری نہیں بلکہ دین کے بارے میں پھیلائے گئے فکری مغالطے ہیں۔ عقل اور وحی کو ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کرنا، سائنس کو دین کا متبادل بنانا، اور سیکولرازم کو واحد ترقی یافتہ راستہ قرار دینا — یہ سب وہ تصورات ہیں جنہوں نے مسلمان ذہن کو الجھا دیا ہے۔

(میڈیا، نصاب، ثقافت اور جدید طرزِ زندگی: لادینیت کا خاموش فروغ)

جدید دور میں دین سے دوری کا عمل زیادہ تر شور، بغاوت یا کھلے انکار کی صورت میں نہیں ہوتا، بلکہ یہ ایک خاموش، تدریجی اور معمول بنتا ہوا عمل ہے۔ اس عمل میں سب سے مؤثر کردار میڈیا، تعلیمی نصاب اور جدید ثقافت ادا کرتی ہے، جو انسان کے شعور کو اس طرح ڈھالتی ہے کہ وہ دین سے دوری کو فطری، ترقی یافتہ اور نارمل سمجھنے لگتا ہے۔

میڈیا جدید انسان کا سب سے طاقتور استاد بن چکا ہے۔ فلمیں، ڈرامے، سوشل

میڈیا، اشتہارات اور خبریں — یہ سب مل کر ایک مخصوص طرزِ فکر کو معمول بناتے ہیں۔ اس طرزِ فکر میں مذہب کو یا تو مکمل طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے یا اسے شدت، پسماندگی اور ذاتی معاملہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ نیکی، برائی، مقصدِ حیات اور اخلاق جیسے تصورات کو مذہب کے بجائے ''ذاتی انتخاب'' کا مسئلہ قرار دیا جاتا ہے۔

یہ وہی عمل ہے جسے قرآن نے ''باطل کو خوبصورت بنا کر دکھانا'' کہا ہے:

شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال خوش نما بنا دیے۔ (سورۃ النحل: آیت 63)

یہ تزیین صرف گناہ کی نہیں بلکہ غلط نظریات کی بھی ہوتی ہے۔

تعلیمی نصاب اس عمل کو مزید گہرا کرتا ہے۔ جدید نصاب میں سائنس، تاریخ، سماجیات اور فلسفہ کو مذہب سے مکمل طور پر الگ کر کے پڑھایا جاتا ہے۔ طالب علم کو بتایا جاتا ہے کہ علم **''غیر جانبدار''** ہوتا ہے، مگر عملی طور پر یہ غیر جانبداری ایک مخصوص سیکولر نظریے کی نمائندگی کرتی ہے۔ اسلامی تاریخ کو یا تو سرسری طور پر پڑھایا جاتا ہے یا اسے محض فتوحات اور اقتدار کی کہانی بنا کر پیش کیا جاتا ہے، جس میں اس کی اخلاقی اور فکری روح غائب ہوتی ہے۔

اس کے نتیجے میں ایک ایسا ذہن پروان چڑھتا ہے جو دین کو امتحان میں آنے والا مضمون تو سمجھتا ہے، مگر زندگی کی رہنمائی کا ذریعہ نہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں نوجوان لاشعوری طور پر دین کو **''غیر متعلق''** سمجھنے لگتا ہے، حالانکہ اس نے کبھی کھل کر دین کو رد بھی نہیں کیا ہوتا۔

نبی کریم ﷺ نے اسی ذہنی تبدیلی کی طرف اشارہ فرمایا تھا: ''تم اپنے سے پہلی امتوں کی ایک ایک بالشت اور ایک ایک گز میں اتباع کرو گے، یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ

کے سوراخ میں داخل ہوئے ہوں گے تو تم اس میں بھی ان کی اتباع کرو گے۔'' ہم نے پوچھا: یا رسول اللہ! کیا یہود و نصاریٰ مراد ہیں؟ فرمایا پھر اور کون۔ (صحیح البخاری حدیث: 7320)

یہ پیروی صرف لباس یا زبان کی نہیں بلکہ فکر اور اقدار کی بھی ہوتی ہے۔

جدید ثقافت نے آزادی کو ذمہ داری سے الگ کر دیا ہے۔ آزادی اب **''جو دل چاہے''** کرنے کا نام بن چکی ہے، جبکہ اسلام میں آزادی ہمیشہ اخلاق اور جواب دہی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ جب خواہش کو معیار بنا لیا جائے تو دین رکاوٹ محسوس ہونے لگتا ہے، اور انسان آہستہ آہستہ اسے پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔

صارفیت (Consumerism) بھی لادینیت کا ایک بڑا مگر کم پہچانا سبب ہے۔ جدید انسان کی شناخت اس کی عبادت، کردار یا علم سے نہیں بلکہ اس کی خریداری، ظاہری حیثیت اور لائف اسٹائل سے جڑی ہوتی ہے۔ یہ طرزِ زندگی انسان کو مسلسل مصروف، خواہش منداور بے چین رکھتا ہے۔ ایسے ماحول میں عبادت، غور وفکر اور روحانی تربیت کے لیے نہ وقت بچتا ہے نہ دل۔

قرآنِ مجید نے اس ذہنیت کو یوں بیان کیا ہے:

کثرت کی چاہ نے تمہیں غافل کر دیا۔ (سورۃ التکاثر: آیت 1)

یہ غفلت صرف مال کی نہیں بلکہ مقصدِ حیات سے غفلت ہے۔

سوشل میڈیا نے اس غفلت کو مزید گہرا کر دیا ہے۔ مسلسل معلومات، تصاویر اور آراء کی یلغار نے انسان کو سوچنے سے روک دیا ہے۔ دین گہرے غور، سکون اور سنجیدگی کا مطالبہ کرتا ہے، جبکہ جدید ڈیجیٹل ثقافت سطحیت، تیزی اور فوری تسکین کو فروغ دیتی ہے۔

نتیجتاً دین **"مشکل"** اور **"بورنگ"** محسوس ہونے لگتا ہے۔

یہاں یہ بات نہایت اہم ہے کہ جدید نوجوان اکثر دین سے نفرت نہیں کرتا، بلکہ وہ دین سے مانوس ہی نہیں ہو پاتا۔ اس کے سامنے دین کی ایک ایسی تصویر رکھی جاتی ہے جو یا تو سخت، غیر سائنسی اور غیر متعلق ہوتی ہے، یا محض رسومات کا مجموعہ۔ جب دین کو زندگی کے سوالات سے جوڑ کر پیش نہ کیا جائے تو نوجوان کہیں اور جواب تلاش کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت (اللہ پر ایمان اور اچھائی کی محبت) پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں"۔ (صحیح مسلم حدیث:6755)

یہ فطرت دین سے دور نہیں ہوتی، بلکہ غلط ماحول اور تربیت اسے بدل دیتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جدید لادینیت زیادہ تر کسی فلسفیانہ بغاوت کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک ایسے ماحول کا پیدا کردہ ہے جو دین کو غیر اہم، غیر متعلق اور غیر عملی بنا کر پیش کرتا ہے۔ میڈیا، نصاب اور ثقافت مل کر ایک ایسی دنیا تشکیل دیتے ہیں جہاں دین کے بغیر جینا "نارمل" اور دین کے ساتھ جینا "مشکل" محسوس ہوتا ہے۔

(خاندانی نظام کی کمزوری، دینی تربیت کا فقدان، اور دین کی غلط نمائندگی)

جدید دور میں مسلمانوں کے اندر دین سے دوری کا ایک نہایت بنیادی، مگر اکثر نظر انداز کیا جانے والا سبب خاندانی نظام کی کمزوری ہے۔ اگر تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ دین کبھی بھی صرف مدرسے، مسجد یا کتاب کے ذریعے منتقل نہیں ہوا، بلکہ اس کا سب سے مضبوط ذریعہ ہمیشہ گھر رہا ہے۔ جب گھر مضبوط تھا تو معاشرہ مضبوط تھا، اور جب گھر کمزور ہوا تو دین کی منتقلی کا فطری نظام بھی ٹوٹنے لگا۔

اسلام نے خاندان کو محض سماجی اکائی نہیں بلکہ دینی تربیت کا مرکز قرار دیا۔ قرآنِ مجید میں صاف حکم دیا گیا:

اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔ (سورۃ التحریم: آیت 6)

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان کی حفاظت صرف فرد کی نہیں بلکہ خاندان کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔

لیکن جدید دور میں خاندان بتدریج ایک رہائشی یونٹ میں بدل گیا، تربیتی ادارہ نہیں رہا۔ والدین معاشی دباؤ، مصروفیت اور خود فکری انتشار کا شکار ہو گئے۔ دین بچوں کو سکھانے کے بجائے یہ فرض کر لیا گیا کہ اسکول، مدرسہ یا معاشرہ یہ کام خود کر لے گا۔ نتیجتاً بچوں کو معلومات تو ملیں، مگر دینی شعور، محبت اور وابستگی نہ مل سکی۔

یہاں ایک نہایت اہم نکتہ سامنے آتا ہے:

اکثر بچے دین سے اس لیے دور نہیں ہوتے کہ انہیں دین پسند نہیں، بلکہ اس لیے کہ انہیں دین سمجھایا ہی نہیں گیا۔ دین اگر صرف ڈانٹ، پابندی اور خوف کے ساتھ منتقل ہو تو وہ دل میں جگہ نہیں بناتا۔ نبی کریم ﷺ کا اسوہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ آپ ﷺ بچوں کے ساتھ شفقت، صبر اور حکمت سے پیش آتے تھے، اور دین کو بوجھ نہیں بلکہ رحمت بنا کر پیش کرتے تھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’عائشہ! اللہ تعالیٰ نرمی کرنے والا اور نرمی کو پسند فرماتا ہے اور نرمی کی بنا پر وہ کچھ عطا فرماتا ہے جو درشت مزاجی کی بنا پر عطا نہیں فرماتا، وہ اس کے علاوہ کسی بھی اور بات پر اتنا عطا نہیں فرماتا۔‘‘ (صحیح مسلم حدیث: 6601)

جب دین کی تعلیم میں نرمی، حکمت اور محبت ختم ہو جائے تو دین بدصورت نظر آنے لگتا ہے، اور یہی بدصورتی نوجوان کو دور لے جاتی ہے۔

خاندانی کمزوری کے ساتھ ساتھ دین کی غلط نمائندگی بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ بعض اوقات دین کو اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے جو نہ قرآن کا ہے، نہ سنت کا۔ دین کو یا تو صرف ظاہری علامات تک محدود کر دیا جاتا ہے، یا اسے سخت، غیر لچکدار اور سوال سے خالی نظام بنا کر دکھایا جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں سوال کرنے والا نوجوان **"باغی"** اور سوچنے والا **"گمراہ"** قرار پاتا ہے۔

حالانکہ اسلام سوال سے نہیں گھبراتا۔ قرآنِ مجید خود سوالات سے بھرا ہوا ہے، اور انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

پس اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے دریافت کرلو۔ (سورۃ النحل: آیت 43)

یہ آیت سوال کرنے کی حوصلہ افزائی ہے، نہ کہ اس کی ممانعت۔

جب نوجوان کے جائز سوالات کو دبایا جاتا ہے، تو وہ جواب کہیں اور تلاش کرتا ہے۔ اور بدقسمتی سے آج وہ **"کہیں اور"** زیادہ تر ایسا ماحول ہوتا ہے جو دین کے خلاف تعصب رکھتا ہے۔ یوں دین سے دوری اکثر غلط مذہبی رویّوں کا ردِعمل بن جاتی ہے، نہ کہ دین کی اصل تعلیمات کا انکار۔

ایک اور سنگین مسئلہ انتہا پسندی ہے، جو دین کی سب سے بدترین نمائندگی بن چکی ہے۔ جب دین کو تشدد، نفرت اور تنگ نظری کے ساتھ جوڑا جاتا ہے تو عام نوجوان کے لیے دین خوف کی علامت بن جاتا ہے۔ وہ لاشعوری طور پر دین سے فاصلے کو "محفوظ راستہ" سمجھنے لگتا ہے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ کی صبح مجھ سے: اور آپ اپنی سواری پر تھے کہ مجھ سے فرمایا "میرے لیے کنکریاں چن دو"۔ تو میں نے آپ کے لیے کنکریاں چنیں جو چھوٹی چھوٹی تھیں کہ چٹکی میں آ سکتی تھیں جب میں نے آپ کے ہاتھ میں انہیں رکھا تو آپ نے فرمایا: "ایسی ہی ہونی چاہیئے، اور تم اپنے آپ کو دین میں غلو سے بچاو؟ ۔ کیونکہ تم سے پہلے لوگوں کو ان کے دین میں غلو ہی نے ہلاک کر دیا ہے۔" (سنن نسائی حدیث: 3059)

غلو نہ صرف دین کو بگاڑتا ہے بلکہ لوگوں کو اس سے دور بھی کر دیتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی تسلیم کرنا ضروری ہے کہ بعض مذہبی طبقات نے جدید مسائل کا سامنا کرنے کے بجائے ان سے آنکھ چرا لی۔ نوجوان کے سوالات، جیسے آزادی، عورت، سیاست، سائنس، اخلاق اور مقصدِ حیات، ان سب پر سنجیدہ، مدلل اور باوقار گفتگو کم ہوتی چلی گئی۔ نتیجتاً دین "خاموش" اور جدید نظریات "بولنے والے" بن گئے۔

یہ صرف قول و فعل کے تضاد کی نہیں بلکہ دعویٰ اور کردار کے فرق کی نشاندہی ہے۔ جب دین کہنے والوں کے عمل میں نظر نہ آئے تو سننے والے بدظن ہو جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جدید لادینیت کا ایک بڑا سبب دین کی عدم منتقلی نہیں بلکہ غلط منتقلی ہے۔ کمزور خاندان، سخت یا غیر مربوط دینی اسلوب، سوال سے خوف، اور انتہا پسندی ــــ یہ سب مل کر دین کو نوجوان کے لیے غیر دلکش بنا دیتے ہیں، حالانکہ دین اپنی اصل میں فطرت کے عین مطابق ہے۔

(دین کی طرف واپسی کے امکانات، فکری اصلاح، اور متوازن دعوت کا راستہ)

جدید دور میں دین سے دوری کے تمام فکری، تہذیبی اور تربیتی اسباب پر گفتگو کے بعد سب سے اہم سوال یہ ہے کہ:

کیا یہ دوری مستقل ہے یا واپسی ممکن ہے؟

اسلامی تاریخ، قرآن وسنت اور انسانی فطرت — تینوں اس سوال کا جواب نہایت واضح انداز میں دیتے ہیں:

واپسی نہ صرف ممکن ہے بلکہ فطری بھی ہے۔

اسلام انسان کو مایوسی کا پیغام نہیں دیتا۔ قرآنِ مجید میں بار بار انسان کو یاد دلایا گیا ہے کہ گمراہی کے بعد ہدایت، کمزوری کے بعد قوت اور زوال کے بعد عروج ممکن ہے۔

کہہ دے اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ۔ (سورۃ الزمر: آیت 53)

یہ آیت صرف فرد کے لیے نہیں بلکہ امت کے لیے بھی امید کا اعلان ہے۔

دین کی طرف واپسی کا پہلا قدم فکری دیانت ہے۔ یعنی یہ تسلیم کرنا کہ جدید دنیا نے ہمیں سہولتیں تو دیں، مگر معنی نہیں دیے؛ معلومات دیں، مگر مقصد نہیں دیا؛ آزادی دی، مگر سکون نہیں دیا۔ جب یہ اعتراف ہو جاتا ہے تو دل دوبارہ سچائی کی تلاش میں نکلتا ہے، اور یہی تلاش ایمان کا دروازہ کھولتی ہے۔

یہاں یہ بات نہایت اہم ہے کہ واپسی کا مطلب ماضی میں چلے جانا نہیں، بلکہ اصولوں کے ساتھ حال میں جینا ہے۔ اسلام کوئی فرسودہ روایت نہیں بلکہ ایک زندہ، متحرک اور ہمہ گیر نظامِ حیات ہے۔ مسئلہ اسلام کی تعلیمات میں نہیں بلکہ اس کے پیش کرنے کے طریقے میں رہا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے دعوت کا جو اسلوب اختیار کیا، وہ نہ جبر تھا، نہ سختی، بلکہ حکمت، دلیل اور حسنِ اخلاق تھا۔

قرآنِ مجید نے اسی اسلوب کو اصول بنایا:

اپنے رب کی راہ کی طرف لوگوں کو حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ بلائیے۔ (سورۃ النحل: آیت 125)

یہ آیت اس بات کی واضح رہنمائی ہے کہ جدید دور میں دین کی طرف واپسی کا راستہ حکمت اور حسنِ بیان سے ہو کر گزرتا ہے، نہ کہ ڈانٹ اور نفرت سے۔

فکری اصلاح کا دوسرا اہم پہلو عقل اور وحی کی دوبارہ ہم آہنگی ہے۔ نوجوان کو یہ بتانا ہوگا کہ اسلام عقل کو دبانے نہیں بلکہ درست سمت دینے آیا ہے۔ سوال کرنا گناہ نہیں، بلکہ سوال کو صحیح جگہ لے جانا دین کا حسن ہے۔ جب دین کو سوچ کا دشمن بنا کر پیش کیا جاتا ہے تو ذہین لوگ اس سے دور ہو جاتے ہیں، اور جب دین کو عقل کا رہنما بنا کر پیش کیا جائے تو وہی ذہن اس کے قریب آ جاتے ہیں۔

اسی طرح دین کو محض فقہی مسائل یا رسومات تک محدود کرنے کے بجائے اسے زندگی کے بڑے سوالات سے جوڑنا ہوگا:

میں کون ہوں؟

میں کیوں زندہ ہوں؟

میں کیسے اچھا انسان بن سکتا ہوں؟

یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب جدید فلسفے پوری طرح نہیں دے سکے، مگر اسلام انہیں نہایت سادہ، گہرے اور مطمئن انداز میں حل کرتا ہے۔

دین کی طرف واپسی کا تیسرا بڑا ذریعہ کردار ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسلام سب سے زیادہ دلیل سے نہیں بلکہ کردار سے پھیلا۔ جب مسلمان انصاف پسند، دیانت دار، رحم دل اور بااخلاق ہوتے ہیں تو دین خود بولنے لگتا ہے۔ اور جب کردار ختم ہو جائے تو ہزار تقریریں بھی بے اثر ہو جاتی ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''مجھے تو صرف اس (مقصد) کے لیے مبعوث کیا گیا کہ اخلاقی اقدار کی تکمیل کر سکوں۔'' (سلسلہ احادیث صحیحہ حدیث: 2399)

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ دین کی اصل روح اخلاق ہے، اور اخلاق کے بغیر دین محض ایک ڈھانچہ رہ جاتا ہے۔

اصلاح کا ایک اہم پہلو خاندان کی بحالی ہے۔ اگر گھر دین کا پہلا مدرسہ بن جائے، اگر والدین خود سیکھنے والے اور سکھانے والے بن جائیں، اگر بچوں کے سوالات کو دبانے کے بجائے سمجھداری سے سنا جائے — تو آدھی جنگ وہیں جیت لی جاتی ہے۔ دین کو خوف نہیں بلکہ اعتماد کے ساتھ منتقل کرنا ہو گا۔

یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ جدید نوجوان کو وعظ سے زیادہ مکالمہ درکار ہے۔ وہ حکم نہیں بلکہ وجہ پوچھتا ہے۔ اگر ہم اس مکالمے سے بھاگیں گے تو وہ کہیں اور چلا جائے گا۔ اور اگر ہم اس مکالمے میں قرآن، سنت، عقل اور تجربے کے ساتھ شامل ہوں گے تو وہ دین کی گہرائی کو خود محسوس کرے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جدید لادینیت کا علاج نہ شدت میں ہے، نہ خاموشی میں، بلکہ علم، حکمت، اخلاق اور زندہ مثال میں ہے۔ دین سے دوری کا سفر انسان کو اندر سے مطمئن نہیں کر سکا، اور یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ فطرت ابھی زندہ ہے۔ جہاں فطرت زندہ ہو، وہاں ہدایت کا دروازہ بند نہیں ہوتا۔

باب 04

نفسیاتی، سماجی اور اخلاقی اسبابِ لادینیت

(انسانی نفس، خواہشات، اور دین سے تدریجی جذباتی دوری)

دین سے دوری کے اسباب کو اگر صرف تاریخی، سیاسی یا فکری زاویے سے دیکھا جائے تو تصویر ادھوری رہ جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین سے دوری کا ایک گہرا تعلق انسانی نفس، اس کی خواہشات اور اس کے جذباتی تجربات سے بھی ہے۔ بہت سے لوگ دین سے اس لیے دور نہیں ہوتے کہ وہ دین کو غلط سمجھتے ہیں، بلکہ اس لیے کہ دین ان کی خواہشات کے راستے میں حائل محسوس ہوتا ہے۔

قرآنِ مجید نے انسان کی نفسیات کو نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کیا ہے:

قسم ہے نفس کی اور اسے درست بنانے کی۔ پھر سمجھ دی اس کو بدکاری کی اور بچ کر چلنے کی۔(سورۃ الشّمس: آیات 8–7)

یہ آیات اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ انسان کے اندر خیر اور شر دونوں کے رجحانات موجود ہیں۔ دین انسان کو اس کشمکش میں رہنمائی دیتا ہے، مگر جب نفس کی خواہشات غالب آ جائیں تو دین **"رکاوٹ"** محسوس ہونے لگتا ہے۔

جدید دور نے انسان کی خواہشات کو نہ صرف آزاد کیا بلکہ انہیں حق کا درجہ دے دیا۔ جو دل چاہے، جیسا چاہے، جب چاہے — یہی جدید آزادی کا تصور ہے۔ ایسے ماحول میں دین کا ضبط، صبر اور حدود کا تصور نفسیاتی دباؤ بن جاتا ہے۔ انسان اس دباؤ سے نجات کے لیے دین کو مسئلہ قرار دینے لگتا ہے، حالانکہ اصل مسئلہ خواہشات کا بے قابو ہونا ہوتا ہے۔

قرآنِ مجید اس نفسیاتی حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے:

بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے۔ (سورۃ الجاثیہ: آیت 23)

جب خواہش خدا بن جائے تو انسان حق کو بھی اسی پیمانے سے تولنے لگتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں دین سے جذباتی دوری شروع ہوتی ہے، اور بعد میں فکری انکار کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

نفسیاتی طور پر انسان ہمیشہ آسان راستہ تلاش کرتا ہے۔ عبادت، ضبطِ نفس، اخلاقی ذمہ داری اور جواب دہی انسان سے محنت اور قربانی مانگتی ہے، جبکہ لادین طرزِ زندگی فوری تسکین فراہم کرتا ہے۔ یہ تسکین وقتی ہوتی ہے، مگر انسان اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ دل عبادت سے خالی اور خواہشات سے بھرا ہوتا چلا جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اسی کیفیت کی طرف اشارہ فرمایا: ''جنت ناپسندیدہ اور تکلیف دہ چیزوں سے گھری ہوئی ہے اور جہنم شہوتوں سے گھری ہوئی ہے۔'' (سنن ترمذی حدیث: 2559)

یہ حدیث دین اور نفس کی اس دائمی کشمکش کو نہایت مختصر مگر جامع انداز میں بیان کرتی ہے۔

دین سے دوری کا ایک اور نفسیاتی سبب مایوسی اور احساسِ جرم ہے۔ بہت سے لوگ اس لیے دین سے دور ہو جاتے ہیں کہ وہ خود کو دین کے معیار پر پورا نہیں اترتا ہوا پاتے۔ بار بار کی کوتاہی، گناہ اور کمزوری انسان کو یہ احساس دلاتی ہے کہ دین اس کے لیے نہیں۔ یوں وہ اصلاح کے بجائے دوری کا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔

حالانکہ اسلام گناہگار سے نہیں بلکہ گناہ پر اصرار سے ناراض ہوتا ہے۔قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ بار بار توبہ کا دروازہ کھلا رکھنے کا اعلان فرماتے ہیں۔

اللہ توبہ کرنے والوں کو اور پاک رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔''(سورۃ البقرہ: آیت 222)

لیکن جب دین کو صرف سزا اور خوف کے زاویے سے پیش کیا جائے تو کمزور انسان دین سے بھاگنے لگتا ہے، اللہ کی طرف آنے کے بجائے۔

سماجی سطح پر بھی انسان تنہائی سے ڈرتا ہے۔جب اس کا ماحول، میڈیا اور معاشرہ کسی خاص طرزِ زندگی کو معمول بنا دے تو اس سے مختلف ہونا نفسیاتی طور پر مشکل ہو جاتا ہے۔دین پر عمل کرنا ''**عجیب**''، ''**پرانا**'' یا ''**غیر فِٹ**'' محسوس ہونے لگتا ہے۔یوں بہت سے لوگ شعوری انکار کے بغیر ہی دین سے دور ہو جاتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے اسی سماجی دباؤ کی طرف اشارہ فرمایا تھا: ''آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، لہٰذا تم میں سے ہر شخص کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے''۔(سنن ابی داود حدیث: 4833)

یہ حدیث سماجی اثرات کی گہرائی کو واضح کرتی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ دین سے دوری محض علمی یا نظریاتی مسئلہ نہیں بلکہ ایک نفسیاتی سفر بھی ہے۔خواہشات، مایوسی، سماجی دباؤ اور فوری تسکین کی طلب —— یہ سب مل کر انسان کو آہستہ آہستہ دین سے جذباتی طور پر کاٹ دیتے ہیں، اور جب دل کٹ جائے تو عقل بھی بہانے تلاش کر لیتی ہے۔

(شناخت کا بحران، مادّی کامیابی، اور روحانی خالی پن)

جدید دور کا انسان بظاہر ترقی یافتہ، باخبر اور خود مختار نظر آتا ہے، مگر اس کے باطن میں ایک گہرا شناختی بحران جنم لے چکا ہے۔ وہ یہ تو جانتا ہے کہ وہ کیا کرتا ہے، مگر یہ نہیں جانتا کہ وہ کون ہے۔ یہی سوال — میں کون ہوں؟ — جب جواب کے بغیر رہ جائے تو انسان اضطراب، بے معنویت اور فکری بھٹکاؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔

اسلام نے انسان کی شناخت نہایت واضح انداز میں متعین کی ہے۔ قرآنِ مجید انسان کو محض حیوانِ ناطق نہیں بلکہ عبدِ خدا اور خلیفۃ الارض قرار دیتا ہے:

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ (سورۃ البقرہ: آیت 30)

یہ شناخت انسان کو مقصد، ذمہ داری اور وقار عطا کرتی ہے۔ مگر جدید تہذیب نے اس شناخت کو بتدریج کمزور کر دیا۔ انسان کو کبھی صرف معاشی اکائی، کبھی صارف، کبھی محض حیاتیاتی وجود بنا کر پیش کیا گیا۔ نتیجتاً انسان نے اپنی اصل پہچان کھو دی۔

یہ شناختی بحران اس وقت مزید گہرا ہو جاتا ہے جب مادّی کامیابی کو کامیابی کا واحد معیار بنا لیا جائے۔ تعلیم، کیریئر، دولت، شہرت اور سہولتیں — یہ سب اگرچہ ضروری ہیں، مگر جب یہی زندگی کا مقصد بن جائیں تو انسان اندر سے خالی رہ جاتا ہے۔ وہ سب کچھ پا لیتا ہے، سوائے سکون کے۔

قرآنِ مجید اس کیفیت کو نہایت جامع انداز میں بیان کرتا ہے:

جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ تکلیف میں پڑے گا۔ (سورۃ طٰہٰ: آیت 124)

ذکرِ الٰہی سے روگردانی کا نتیجہ تنگ زندگی ہے—اور یہ تنگی ہمیشہ ظاہری غربت کی صورت میں نہیں، بلکہ اکثر باطنی گھٹن کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

جدید معاشرہ انسان کو یہ یقین دلاتا ہے کہ زیادہ کمانا، زیادہ حاصل کرنا اور زیادہ دکھانا ہی خوشی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ خواہشات کی یہ دوڑ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ایک ہدف پورا ہوتا ہے تو دوسرا سامنے آجاتا ہے۔ انسان مسلسل بھاگتا رہتا ہے، مگر منزل کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ یہی کیفیت بالآخر ذہنی دباؤ، ڈپریشن اور وجودی بحران میں بدل جاتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اسی نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا تھا: ''اگر آدم کے بیٹے کے پاس مال کی (بھری ہوئی) دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری حاصل کرنا چاہے گا آدمی کا پیٹ مٹی کے سوا کوئی اور چیز نہیں بھر سکتی اور اللہ اسی کی طرف توجہ فرماتا ہے جو (اس کی طرف) توجہ کرتا ہے۔'' (صحیح مسلم حدیث: 2415)

یہ حدیث انسان کی لامحدود خواہشات اور محدود سکون کی حقیقت کو واضح کرتی ہے۔

شناختی بحران کا ایک اہم پہلو روحانی خالی پن ہے۔ جب عبادت، دعا، ذکر اور خدا سے تعلق زندگی سے نکل جائے تو دل ایک خلا محسوس کرتا ہے۔ جدید انسان اس خلا کو تفریح، نشے، مصروفیت یا تعلقات سے بھرنے کی کوشش کرتا ہے، مگر یہ سب عارضی سہولتیں ہیں، مستقل علاج نہیں۔ یوں خلا مزید گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج ذہنی بیماریوں، خودکشی، بے چینی اور عدمِ اطمینان کی شرح ان معاشروں میں زیادہ ہے جو بظاہر سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان محض روٹی، سہولت اور آزادی سے مطمئن نہیں ہوتا؛ اسے معنی چاہیے، اور معنی کا سب سے مضبوط سرچشمہ دین ہے۔

اسلام انسان کو یہ معنی عطا کرتا ہے کہ اس کی زندگی بے مقصد نہیں، اس کی آزمائش بے فائدہ نہیں، اور اس کی تکلیف رائیگاں نہیں۔

قرآنِ مجید فرماتا ہے:

کیا تم یہ گمان کیے ہوئے ہو کہ ہم نے تمہیں یوں ہی بیکار پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹائے ہی نہ جاؤ گے۔ (سورۃ المؤمنون: آیت 115)

یہ آیت جدید انسان کے سب سے بڑے سوال کا جواب ہے۔

شناختی بحران کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ جدید انسان دوسروں کی نظر میں اپنی قدر تلاش کرتا ہے۔ سوشل میڈیا، سماجی معیار اور ظاہری کامیابی اس کی خودی کا پیمانہ بن جاتے ہیں۔ جب تعریف ملتی ہے تو خوشی، اور جب نظر انداز ہوتا ہے تو مایوسی۔ یہ نفسیاتی انحصار انسان کو اندر سے کمزور کر دیتا ہے۔

اسلام انسان کو اس غلامی سے آزاد کرتا ہے۔ وہ اسے یہ سکھاتا ہے کہ اصل قدر اللہ کے نزدیک ہے، نہ کہ لوگوں کی نظر میں۔

ا للہ کے نزدیک تم سب میں باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ (سورۃ الحجرات: آیت 13)

یہ معیار انسان کو باطنی استحکام عطا کرتا ہے، جو جدید تہذیب دینے سے قاصر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دین سے دوری کا ایک بڑا نفسیاتی سبب شناخت کا بکھراؤ اور روحانی خلا ہے۔ مادّی کامیابی نے انسان کو مصروف تو کر دیا، مگر مطمئن نہیں کیا۔ جب دین کو زندگی کے مرکز سے ہٹا دیا جائے تو انسان کے پاس جینے کے اسباب تو ہوتے ہیں، مگر

جینے کی وجہ نہیں رہتی۔

(اخلاقی نسبیت، ضمیر کی کمزوری، اور گناہ کا معمول بن جانا)

دین سے دوری کا سب سے خطرناک مرحلہ وہ ہوتا ہے جب انسان نہ صرف عمل میں بلکہ اخلاقی شعور میں بھی تبدیلی قبول کر لیتا ہے۔ اس مرحلے پر وہ یہ کہنا چھوڑ دیتا ہے کہ **''یہ غلط ہے مگر میں کمزور ہوں''** اور یہ کہنا شروع کر دیتا ہے کہ **''یہ غلط ہی نہیں''**۔ یہی وہ مقام ہے جہاں لادینیت محض طرزِ زندگی نہیں بلکہ اخلاقی نظریہ بن جاتی ہے۔

جدید دنیا میں اس تبدیلی کا سب سے بڑا ذریعہ اخلاقی نسبیت (Moral Relativism) ہے۔ اس نظریے کے مطابق کوئی عمل بذاتِ خود اچھا یا برا نہیں ہوتا، بلکہ اچھائی اور برائی کا معیار ہر فرد، ہر معاشرے اور ہر زمانے کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ نتیجتاً حق و باطل ایک مستقل حقیقت کی بجائے ذاتی رائے بن جاتے ہیں۔

اسلام اس تصور کو بنیادی طور پر رد کرتا ہے۔ قرآنِ مجید نے واضح الفاظ میں حق و باطل کے فرق کو ایک مستقل حقیقت قرار دیا ہے:

اور کہہ دو کہ حق آ گیا اور باطل نابود ہو گیا۔ بیشک باطل نابود ہونے والا ہے۔
(سورۃ الإسراء: آیت 81)

یہ آیت اس بات کا اعلان ہے کہ حق اور باطل محض سماجی معاہدہ نہیں بلکہ الٰہی حقیقت ہیں۔

جب اخلاقی نسبیت قبول کر لی جائے تو ضمیر آہستہ آہستہ اپنی آواز کھو دیتا ہے۔ انسان ابتدا میں غلطی پر شرمندہ ہوتا ہے، پھر اس کا جواز ڈھونڈتا ہے، اور آخر کار اسے درست ثابت کرنے لگتا ہے۔ یہی وہ نفسیاتی عمل ہے جسے قرآن ''دلوں پر پردہ پڑ جانا'' قرار دیتا

ہے:

یوں نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کیا عمال کی وجہ سے زنگ (چڑھ گیا) ہے۔
(سورۃ المطففین: آیت 14)

یہ زنگ اچانک نہیں لگتا، بلکہ مسلسل گناہ اور مسلسل جواز تراشی سے پیدا ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے ضمیر کے اس تدریجی زوال کو نہایت بلیغ انداز میں بیان فرمایا:
''بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نکتہ پڑ جاتا ہے، پھر جب وہ گناہ کو چھوڑ دیتا ہے اور استغفار اور توبہ کرتا ہے تو اس کے دل کی صفائی ہو جاتی ہے (سیاہ دھبہ مٹ جاتا ہے) اور اگر وہ گناہ دوبارہ کرتا ہے تو سیاہ نکتہ مزید پھیل جاتا ہے یہاں تک کہ پورے دل پر چھا جاتا ہے''۔(سنن ترمذی حدیث: 3334)

یہ حدیث اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ گناہ محض قانونی یا سماجی مسئلہ نہیں بلکہ دل کی صحت کا مسئلہ ہے۔

جدید معاشرے میں گناہ کو نہ صرف معمول بنایا گیا بلکہ اکثر اسے **''ذاتی آزادی''** اور **''خود اظہار''** کا نام دے دیا گیا۔ شرم، حیا اور حدود جیسے تصورات کو پسماندگی کی علامت قرار دیا گیا۔ نتیجتاً انسان وہ کام بھی بلا جھجھک کرنے لگا جنہیں پہلے وہ خود بھی غلط سمجھتا تھا۔

یہ تبدیلی صرف فرد تک محدود نہیں رہی بلکہ اجتماعی سطح پر بھی نظر آنے لگی۔ میڈیا، تفریح اور سوشل نیٹ ورکس نے گناہ کو نارمل، پرکشش اور قابلِ تقلید بنا دیا۔ جو چیز بار بار دیکھی جائے، وہ آہستہ آہستہ دل میں ہلکی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بہت سے اعمال پر نہ دل دھڑکتا ہے، نہ ضمیر جاگتا ہے۔

قرآنِ مجید نے ایسے ہی معاشرتی زوال کے بارے میں خبردار فرمایا تھا:

اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو' (سورۃ المائدہ: آیت 2)

جب گناہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی تعاون کی صورت اختیار کر لے تو اس کا اثر کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔

اخلاقی نسبیت کا ایک اور خطرناک نتیجہ یہ ہے کہ نصیحت بے معنی ہو جاتی ہے۔ جب ہر شخص اپنی اخلاقیات خود طے کرے تو کسی کو کسی پر تنقید کا حق نہیں رہتا۔ یوں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسے بنیادی اسلامی تصورات بھی **"عدم رواداری"** قرار دے دیے جاتے ہیں۔

حالانکہ اسلام میں اخلاق محض ذاتی پسند نہیں بلکہ اجتماعی ذمہ داری ہے۔

قرآنِ مجید فرماتا ہے:

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے (سورۃ آل عمران: آیت 110)

یہ خیر اسی وقت باقی رہتی ہے جب معاشرہ اچھائی کو اچھا اور برائی کو برا کہنے کی جرات رکھتا ہو۔

ضمیر کی کمزوری کا ایک اور سبب مسلسل موازنہ ہے۔ انسان جب خود سے بدتر لوگوں کو دیکھتا ہے تو اپنی غلطیوں کو معمولی سمجھنے لگتا ہے۔ **"سب ہی تو ایسا کر رہے ہیں"** — یہ جملہ ضمیر کو خاموش کرنے کا سب سے آسان طریقہ بن چکا ہے۔ مگر اسلام فرد کو ہجوم کے بجائے حق کے ساتھ کھڑا ہونے کی دعوت دیتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دین سے دوری کا ایک انتہائی خطرناک نتیجہ اخلاقی بے حسی ہے۔ جب حق و باطل کی لکیر مٹ جائے، ضمیر خاموش ہو جائے، اور گناہ معمول بن جائے تو انسان

نہ صرف دین سے بلکہ خود اپنے انسان ہونے سے بھی دور ہو جاتا ہے۔

(اخلاقی زوال سے سماجی ٹوٹ پھوٹ تک: اعتماد، تعلقات اور اجتماعی ذمہ داری کا خاتمہ)

جب کسی معاشرے میں اخلاقی اقدار کمزور پڑ جائیں تو اس کا اثر صرف فرد کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ آہستہ آہستہ پورا سماجی ڈھانچہ متزلزل ہونے لگتا ہے۔ دین چونکہ اخلاق کو فرد اور معاشرے کے درمیان مضبوط رشتہ بناتا ہے، اس لیے دین سے دوری دراصل اعتماد کے نظام کو توڑ دیتی ہے۔ اور جب اعتماد ختم ہو جائے تو کوئی معاشرہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔

اسلامی تعلیمات میں معاشرے کی بنیاد باہمی اعتماد، امانت اور ذمہ داری پر رکھی گئی ہے۔ قرآنِ مجید نے اہلِ ایمان کی صفات میں امانت اور وعدے کی پاسداری کو بنیادی حیثیت دی ہے:

اور جو امانتوں اور اقراروں کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ (سورۃ المؤمنون: آیت 8)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ اخلاق محض ذاتی خوبی نہیں بلکہ معاشرتی بقا کی شرط ہے۔

جب دین زندگی کے مرکز سے ہٹ جاتا ہے تو امانت، دیانت اور سچائی جیسے اوصاف بھی ''اخلاقی ذمہ داری'' کے بجائے ''ذاتی انتخاب'' بن جاتے ہیں۔ نتیجتاً جھوٹ، دھوکہ، خودغرضی اور مفاد پرستی آہستہ آہستہ معمول بن جاتی ہے۔ لوگ قانون کی حد تک تو رک جاتے ہیں، مگر ضمیر کی سطح پر کوئی روک باقی نہیں رہتی۔

یہی وجہ ہے کہ دین سے دور معاشروں میں قوانین کی تعداد بڑھتی جاتی ہے مگر

انصاف کم ہوتا جاتا ہے۔ عدالتیں ہوتی ہیں، مگر اعتماد نہیں ہوتا۔ معاہدے ہوتے ہیں، مگر نیت کمزور ہوتی ہے۔ اسلام نے اسی خطرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ قانون اخلاق کے بغیر بے جان ہو جاتا ہے۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ہمیں کوئی خطبہ ایسا نہیں دیا جس میں یہ نہ فرمایا ہو کہ اس شخص کا ایمان نہیں جس کے پاس امانت داری نہ ہو اور اس شخص کا دین نہیں جس کے پاس وعدہ کی پاسداری نہ ہو۔ (صحیح ابن حبان حدیث: 194)

یہ حدیث اس بات کو واضح کرتی ہے کہ اخلاقی کمزوری دراصل ایمانی کمزوری کا اظہار ہے، اور یہی کمزوری معاشرتی زوال کا آغاز بنتی ہے۔

اخلاقی زوال کا ایک بڑا نتیجہ تعلقات کی ٹوٹ پھوٹ ہے۔ جب ہر شخص اپنی خواہش، فائدے اور سہولت کو اولیت دے تو رشتے بوجھ محسوس ہونے لگتے ہیں۔ خاندان، جو کبھی تحفظ اور تربیت کا مرکز تھا، اب مفادات کا میدان بن جاتا ہے۔ والدین اور اولاد، شوہر اور بیوی، بھائی اور بہن — سب کے درمیان اعتماد کمزور پڑنے لگتا ہے۔

اسلام نے خاندانی رشتوں کو محض جذباتی تعلق نہیں بلکہ دینی ذمہ داری قرار دیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اور رشتے ناطے توڑنے سے بھی بچو بے شک اللہ تعالیٰ تم پر نگہبان ہے۔" (سورۃ النساء: آیت 1)

جب رشتوں کا احترام ختم ہو جائے تو معاشرہ افراد کا ہجوم بن جاتا ہے، امت نہیں رہتا۔

سماجی سطح پر اخلاقی زوال کا ایک اور اثر اجتماعی بے حسی ہے۔لوگ ظلم، ناانصافی اور بدعنوانی دیکھتے ہیں مگر اسے ''**نارمل**'' سمجھ کر خاموش رہتے ہیں۔ یہ خاموشی خوف یا مجبوری نہیں بلکہ اخلاقی تھکن کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انسان جب مسلسل برائی دیکھتا ہے اور اس کے خلاف کھڑا نہیں ہوتا تو اس کا ضمیر آہستہ آہستہ سن ہو جاتا ہے۔

قرآنِ مجید نے ایسی خاموشی کو سخت الفاظ میں تنقید کا نشانہ بنایا ہے:

بنی اسرائیل کے کافروں پر (حضرت) داؤد (علیہ السلام) اور (حضرت) عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کی زبانی لعنت کی گئی اس وجہ سے کہ وہ نافرمانیاں کرتے تھے اور حد سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ آپس میں ایک دوسرے کو برے کاموں سے جو وہ کرتے تھے روکتے نہ تھے جو کچھ بھی یہ کرتے تھے یقیناً وہ بہت برا تھا۔ (سورۃ المائدہ: آیات 78–79)

یہ آیات واضح کرتی ہیں کہ معاشرتی زوال صرف برائی کرنے سے نہیں بلکہ برائی کو نہ روکنے سے بھی آتا ہے۔

دین سے دور معاشرے میں ''**میرا کیا فائدہ**'' اجتماعی سوچ پر غالب آ جاتا ہے۔ اجتماعی ذمہ داری، قربانی اور ایثار جیسے تصورات غیر عملی یا غیر ضروری سمجھے جانے لگتے ہیں۔ نتیجتاً غربت، ناانصافی اور محرومی بڑھتی ہے، اور طاقتور مزید طاقتور جبکہ کمزور مزید کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔

اسلام نے معاشرتی ذمہ داری کو ایمان کا حصہ قرار دیا ہے۔ زکوٰۃ، صدقہ، پڑوسی کے حقوق، یتیم کا خیال — یہ سب محض سماجی خدمات نہیں بلکہ دینی فرائض ہیں۔ جب دین سے دوری ان فرائض کو کمزور کر دیتی ہے تو معاشرہ طبقاتی تقسیم اور عدمِ توازن کا شکار ہو جاتا ہے۔

اخلاقی زوال کا آخری اور سب سے خطرناک مرحلہ مایوسی ہے۔ جب انسان کو نہ لوگوں پر اعتماد رہے، نہ نظام پر یقین، اور نہ مستقبل سے امید — تو وہ یا تو خودغرض ہو جاتا ہے یا بغاوت پر اتر آتا ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جہاں معاشرے اندر سے ٹوٹنے لگتے ہیں، چاہے ظاہری طور پر ترقی موجود ہو۔

قرآنِ مجید نے مایوسی کو ایمان کے منافی قرار دیا ہے:

یقیناً رب کی رحمت سے ناامید وہی ہوتے ہیں جو کافر ہوتے ہیں۔ (سورۃ یوسف: آیت 87)

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ امید کا ختم ہونا دراصل روحانی موت کی علامت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دین سے دوری صرف فرد کی عبادت پر اثر نہیں ڈالتی بلکہ پورے معاشرے کو اخلاقی، سماجی اور نفسیاتی بحران میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اعتماد ٹوٹ جاتا ہے، رشتے کمزور ہو جاتے ہیں، ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے، اور بالآخر معاشرہ افراد کے بے ربط مجموعے میں بدل جاتا ہے۔

(اخلاقی و سماجی بحالی: دین بطور شفا، امید اور اجتماعی ربط)

ہم نے دیکھا کہ دین سے دوری کس طرح فرد کے نفس سے شروع ہو کر اخلاق، تعلقات اور پھر پورے معاشرے کی ساخت کو متاثر کرتی ہے۔ اب آخری اور سب سے اہم سوال یہ ہے:

کیا یہ زوال قابلِ اصلاح ہے؟

اسلام اس سوال کا جواب نہایت واضح، پُرامید اور عملی انداز میں دیتا ہے:

ہاں، اصلاح ممکن ہے — بشرطیکہ ہم بیماری کو تسلیم کریں اور علاج کی طرف رجوع کریں۔

اسلام انسان کو صرف حکم نہیں دیتا بلکہ اسے امید بھی دیتا ہے۔ قرآنِ مجید انسان اور معاشرے دونوں کو یاد دلاتا ہے کہ کوئی بگاڑ دائمی نہیں ہوتا:

بیشک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ (سورۃ الم نشرح: آیت 6)

یہ اصول صرف فرد کی زندگی پر لاگو نہیں ہوتا بلکہ قوموں اور معاشروں پر بھی صادق آتا ہے۔

اخلاقی و سماجی بحالی کا پہلا قدم اندرونی بیداری ہے۔ یعنی فرد یہ تسلیم کرے کہ مسئلہ صرف ''دوسروں'' میں نہیں بلکہ مجھ میں بھی ہے۔ جب انسان خود کو مظلومِ حالات کے بجائے ذمہ دار انسان سمجھنا شروع کرتا ہے تو اصلاح کا دروازہ کھلتا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں دین انسان کو خود احتسابی سکھاتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

کسی قوم کی حالت اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اسے نہ بدلیں جو ان کے دلوں میں ہے۔ (سورۃ الرعد: آیت 11)

یہ آیت سماجی اصلاح کا بنیادی اصول ہے: تبدیلی باہر سے نہیں، اندر سے شروع ہوتی ہے۔

اخلاقی بحالی کا دوسرا اہم ستون ضمیر کی دوبارہ تربیت ہے۔ ضمیر مَر نہیں جاتا، بس دب جاتا ہے۔ جب انسان سچ، خیر اور حق کی صحبت اختیار کرتا ہے تو ضمیر دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔ نماز، دعا، ذکر اور قرآن محض عبادات نہیں بلکہ ضمیر کو جگانے کے عملی ذرائع ہیں۔ یہی

وجہ ہے کہ اسلام عبادت کو سماج سے الگ نہیں کرتا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: سن لو بدن میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو گا سارا بدن درست ہو گا اور جہاں بگڑا سارا بدن بگڑ گیا۔ سن لو وہ ٹکڑا آدمی کا دل ہے۔ (صحیح البخاری حدیث:52)

یہ حدیث فرد کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کا اصول بیان کرتی ہے۔

سماجی سطح پر اخلاقی بحالی کا تیسرا قدم اعتماد کی بحالی ہے۔ اعتماد زبردستی قائم نہیں ہوتا، بلکہ مسلسل سچائی، امانت اور انصاف سے پیدا ہوتا ہے۔ جب لوگ دیکھتے ہیں کہ دین صرف بات نہیں بلکہ عمل میں بھی نظر آتا ہے تو ان کا ٹوٹا ہوا یقین بحال ہونے لگتا ہے۔

اسلام نے اعتماد کی بحالی کے لیے عملی نظام دیا ہے:

- وعدے کی پاسداری
- لین دین میں دیانت
- کمزور کے حقوق کا تحفظ
- طاقتور کا احتساب

یہ سب اس بات کا ثبوت ہیں کہ دین محض روحانیت نہیں بلکہ سماجی شفا بھی ہے۔

اخلاقی بحالی میں خاندان کا کردار مرکزی ہے۔ اگر گھر میں سچ، احترام، صبر اور معافی کا ماحول ہو تو بچہ لاشعوری طور پر دین کے اخلاق سیکھ لیتا ہے۔ خاندان اگر دوبارہ تربیت کا مرکز بن جائے تو معاشرہ خود بخود سنبھلنے لگتا ہے۔

قرآنِ مجید نے خاندان کو سماجی اصلاح کی بنیاد قرار دیا ہے:

اور اُس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی۔(سورۃ الروم آیت 21)

یہ مودّت اور رحمت دین سے جڑی ہوں تو رشتے مضبوط رہتے ہیں، اور جب یہ رشتہ ٹوٹ جائے تو قانون بھی رشتوں کو نہیں بچا سکتا۔

معاشرتی سطح پر ایک اور اہم عنصر اجتماعی ذمہ داری کی بحالی ہے۔ اسلام فرد کو تنہا نہیں چھوڑتا بلکہ اسے امت کا حصہ بناتا ہے۔ امر بالمعروف، نہی عن المنکر، خدمتِ خلق اور اجتماعی خیر — یہ سب دین کو سماجی سطح پر زندہ رکھتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمانوں کی ایک دوسرے سے محبت، ایک دوسرے کے ساتھ رحم دلی اور ایک دوسرے کی طرف التفات وتعاون کی مثال ایک جسم کی طرح ہے، جب اس کے ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو باقی سارا جسم بیداری اور بخار کے ذریعے سے (سب اعضاء کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر) اس کا ساتھ دیتا ہے۔'' (صحیح مسلم حدیث:6586)

جب دین کو اس اجتماعی شعور کے ساتھ جیا جائے تو معاشرہ بکھرنے کے بجائے جُڑنے لگتا ہے۔

اخلاقی وسماجی بحالی کا آخری مگر سب سے اہم پہلو امید ہے۔ مایوسی معاشروں کو مار دیتی ہے، جبکہ امید انہیں زندہ رکھتی ہے۔ اسلام انسان کو یہ یقین دلاتا ہے کہ اگر نیت درست ہو تو اللہ کی مدد شاملِ حال ہوتی ہے، چاہے حالات کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں۔

باب چہارم کا مجموعی خلاصہ

باب چہارم نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ:

- دین سے دوری نفسیاتی، اخلاقی اور سماجی بحران پیدا کرتی ہے
- خواہشات، شناختی بحران اور اخلاقی نسبیت زوال کو تیز کرتے ہیں
- یہ زوال فرد سے شروع ہو کر پورے معاشرے تک پھیلتا ہے
- مگر دین کے ذریعے اخلاقی اور سماجی بحالی ممکن ہے

باب 05

تعلیمی، فکری اور ادارہ جاتی اسبابِ لادینیت

(تعلیم کا مقصد بدل جانا اور علم کا دین سے کٹ جانا)

کسی بھی قوم کی فکری سمت اس کے تعلیمی نظام سے متعین ہوتی ہے۔ تعلیم صرف معلومات کی منتقلی نہیں بلکہ اقدار، ترجیحات اور زندگی کے مقصد کی تشکیل کا ذریعہ ہوتی ہے۔ جب تعلیم کا مقصد بدل جائے تو نسلیں خاموشی سے بدل جاتی ہیں، اور یہی وہ نکتہ ہے جہاں سے مسلمانوں میں دین سے دوری نے ایک منظّم اور پائیدار شکل اختیار کی۔

اسلام میں علم کو ہمیشہ عبادت، ذمہ داری اور مقصد سے جوڑا گیا ہے۔ قرآنِ مجید کی پہلی وحی ہی تعلیم کی بنیاد پر نازل ہوئی:

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ (سورۃ العلق آیت 1)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ پڑھنا محض ذہنی سرگرمی نہیں بلکہ رب کے نام سے جڑی ہوئی فکری عبادت ہے۔ مگر جدید تعلیمی نظام میں **"اقرأ"** تو باقی رہا، **"باسم ربک"** آہستہ آہستہ حذف ہو گیا۔

مسلمانوں کے تعلیمی زوال کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ علم کو دین سے الگ شعبہ سمجھ لیا گیا۔ جدید نصاب میں سائنس، فلسفہ، معاشیات اور سماجیات کو اس انداز میں پڑھایا جاتا ہے گویا کائنات خود بخود وجود میں آ گئی ہو، اخلاق محض سماجی معاہدہ ہو، اور انسان صرف معاشی اکائی ہو۔ نتیجتاً طالبِ علم کے ذہن میں خدا، وحی اور آخرت غیر متعلق تصورات بن جاتے ہیں۔

یہ فکری تقسیم اسلامی روایت میں اجنبی ہے۔ اسلام میں علم "دینی" اور

''دنیاوی'' خانوں میں تقسیم نہیں تھا۔ امام غزالی، ابنِ سینا، ابنِ خلدون اور امام رازی جیسے علما نے سائنس، فلسفہ اور سماجیات پر کام کیا، مگر اللہ کو کائنات سے خارج نہیں کیا۔ علم ان کے نزدیک اللہ کی نشانیوں کو سمجھنے کا ذریعہ تھا، نہ کہ اس کی نفی کا۔

قرآنِ مجید بار بار انسان کو کائنات پر غور کی دعوت دیتا ہے:

آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے ہیر پھیر میں یقیناً عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ (سورۃ آل عمران آیت 190)

یہ آیت علم اور ایمان کے امتزاج کی بہترین مثال ہے، مگر جدید نصاب نے اس امتزاج کو توڑ دیا۔

تعلیمی نظام میں ایک اور بنیادی تبدیلی یہ آئی کہ تعلیم کا مقصد **''انسان بنانا''** کی بجائے **''کارآمد فرد''** بنانا قرار پایا۔ کامیابی کا معیار اخلاق، کردار اور دیانت کے بجائے تنخواہ، عہدہ اور مارکیٹ ویلیو بن گیا۔ نتیجتاً تعلیم یافتہ مگر اخلاقی طور پر کھوکھلے افراد پیدا ہونے لگے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا کرتے تھے ''اللہ! میں چار چیزوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں: ایسے علم سے جو نفع بخش اور مفید نہ ہو، ایسے دل سے جس میں (اللہ کا) ڈر نہ ہو، ایسے نفس سے جو سیراب نہ ہو، اور ایسی دعا سے جو (اللہ کے یہاں) قبول نہ ہو''۔ (سنن نسائی حدیث: 5469)

یہ دعا اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ ہر علم فائدہ مند نہیں، اور فائدہ وہی ہے جو انسان کو اللہ کے قریب کرے اور معاشرے کے لیے خیر کا باعث بنے۔

تعلیم کے نام پر جو فکری مواد نوجوانوں کو دیا جا رہا ہے، اس میں اکثر دین کو یا تو

نظرانداز کیا جاتا ہے یا قدامت پرستی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ تاریخ کے اسباق میں مذہب کو اکثر جنگ، جبر یا پسماندگی کے تناظر میں دکھایا جاتا ہے، جبکہ جدیدیت اور ترقی کو دین سے نجات کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ فکری پیغام غیر محسوس انداز میں ذہنوں میں بیٹھ جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے نوجوان کھلے عام دین کے مخالف نہیں ہوتے، مگر دل ہی دل میں اسے غیر ضروری سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ نماز، حجاب یا شرعی احکام کو "ذاتی پسند" تو مان لیتے ہیں، مگر زندگی کی رہنمائی کے لیے دین کو غیر متعلق سمجھتے ہیں۔ یہ کیفیت براہِ راست تعلیمی ماحول کی پیداوار ہوتی ہے۔

اسلامی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب تعلیم اور تربیت ایک ساتھ چلتی ہیں تو کردار بنتا ہے۔ مدینہ کا تعلیمی ماڈل محض درسگاہ نہیں تھا بلکہ تزکیہ، تربیت اور تعلیم کا جامع نظام تھا۔

قرآنِ مجید نبی ﷺ کے مشن کو یوں بیان کرتا ہے:

وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول انھی میں سے بھیجا، جو ان کے سامنے اس کی آیات پڑھتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، حالانکہ بلاشبہ وہ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں تھے۔ (سورۃ الجمعہ: آیت 2)

تزکیہ (اخلاقی تربیت) کو تعلیم پر مقدم رکھا گیا، مگر جدید نظام میں یہ ترتیب الٹ دی گئی۔

تعلیمی ادارے جب صرف ڈگری فیکٹریاں بن جائیں تو وہ سوچنے والے انسان کے بجائے منافع بخش مشینیں پیدا کرتے ہیں۔ ایسی تعلیم سوال تو سکھاتی ہے، مگر مقصد نہیں دیتی۔ شک تو پیدا کرتی ہے، مگر یقین کی رہنمائی نہیں کرتی۔ یہی فکری خلا آگے چل کر لادینیت یا شدید فکری انتشار میں بدل جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں بڑھتی ہوئی لادینیت کا ایک بنیادی سبب تعلیم کا دین سے کٹ جانا ہے۔ جب نصاب میں اللہ موجود نہ ہو، مقصد واضح نہ ہو، اور اخلاق غیر اہم ہو جائے تو تعلیم ترقی تو دیتی ہے، مگر ہدایت نہیں۔

(نوآبادیاتی تعلیمی ورثہ، فکری غلامی، اور مسلمان ذہن کی سیکولر تشکیل)

مسلمانوں میں دین سے دوری کو اگر صرف ذاتی کمزوری یا اخلاقی غفلت قرار دیا جائے تو یہ ایک سطحی تجزیہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دوری ایک منظّم فکری عمل کے نتیجے میں پیدا ہوئی، جس کی جڑیں نوآبادیاتی دور کے تعلیمی نظام میں پیوست ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمان سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ علمی و فکری غلامی کا بھی شکار ہوا۔

نوآبادیاتی طاقتوں نے جلد یہ سمجھ لیا تھا کہ قوموں کو ہمیشہ فوج کے ذریعے قابو میں رکھنا ممکن نہیں۔ اصل تسلط ذہنوں پر ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا تعلیمی نظام متعارف کروایا جو مقامی ثقافت، مذہب اور تاریخ سے کٹا ہوا تھا، اور جس کا مقصد ایسے افراد پیدا کرنا تھا جو ظاہری طور پر مقامی ہوں مگر فکری طور پر مغرب کے تابع ہوں۔

برطانوی تعلیمی پالیسی کا یہ تصور تاریخی طور پر واضح ہے۔ لارڈ میکالے کے مشہور تعلیمی منصوبے میں صاف الفاظ میں یہ ہدف بیان کیا گیا کہ ایسے لوگ پیدا کیے جائیں جو "خون اور رنگت میں ہندوستانی ہوں، مگر سوچ میں انگریز ہوں"۔ یہ پالیسی وقتی نہیں بلکہ نسل در نسل اثر انداز ہونے والی فکری حکمتِ عملی تھی۔

اس تعلیمی نظام میں دین کو یا تو نصاب سے خارج کر دیا گیا یا اسے محض ایک نجی اور غیر سائنسی معاملہ بنا کر پیش کیا گیا۔ نتیجتاً طالبِ علم کے ذہن میں یہ تصور بیٹھ گیا کہ علم، ترقی اور عقل کا تعلق دین سے نہیں بلکہ اس سے نجات میں ہے۔ یہ وہ لمحہ تھا جہاں سے سیکولر ذہن کی تشکیل شروع ہوئی۔

اسلامی تعلیمات کے برعکس، نوآبادیاتی نصاب میں کائنات کو ایک خودکار نظام کے طور پر پیش کیا گیا، جس میں خدا کا ذکر غیر ضروری سمجھا گیا۔ تاریخ کو محض طاقت، معیشت اور سیاست کے زاویے سے پڑھایا گیا، جبکہ وحی، اخلاق اور نبوت کو ''عقیدے'' کے خانے میں ڈال دیا گیا۔ اس تقسیم نے مسلمان طالبِ علم کے ذہن میں ایک خاموش مگر گہری دراڑ پیدا کر دی۔

فکری غلامی کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ غلام خود کو آزاد سمجھنے لگتا ہے۔ مسلمان نوجوان جب مغربی فلسفہ، تاریخ اور سماجی علوم کو بغیر تنقید کے قبول کرتا ہے تو وہ لاشعوری طور پر اپنے دین کو کمتر اور غیر متعلق سمجھنے لگتا ہے۔ وہ اسلام کو روحانیت یا ثقافت تو مان لیتا ہے، مگر علم، ریاست اور نظامِ زندگی کے لیے مغرب کو معیار سمجھتا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں لادینیت ایک نعرہ نہیں بلکہ ایک ذہنی کیفیت بن جاتی ہے۔ نوجوان کہتا ہے:

''میں دین کا مخالف نہیں، بس اسے ذاتی معاملہ سمجھتا ہوں''

یہ جملہ دراصل سیکولر ذہنیت کی مکمل عکاسی ہے۔

اسلام اس تقسیم کو بنیادی طور پر مسترد کرتا ہے۔ قرآنِ مجید زندگی کو ٹکڑوں میں نہیں بانٹتا بلکہ مکمل اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے:

ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی تابعداری نہ کرو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ (سورۃ البقرہ آیت 208)

یہ آیت دین کو نجی عبادت تک محدود کرنے کے تصور کی نفی کرتی ہے۔

نوآبادیاتی ورثے کا ایک اور اثر یہ ہوا کہ اسلامی علمی روایت کو غیر سائنسی اور غیر

معروضی قرار دیا گیا۔ مدارس اور دینی علوم کو جدید دنیا کے لیے غیر مفید دکھایا گیا، جبکہ مغربی فلسفے کو عقلِ مطلق کا درجہ دے دیا گیا۔ نتیجتاً مسلمان نوجوان اپنی ہی علمی روایت سے شرمندگی محسوس کرنے لگا۔

حالانکہ اسلامی تاریخ میں علم ہمیشہ سوال، تحقیق اور تنقید کے ساتھ پروان چڑھا۔ امام ابوحنیفہ کے حلقے، امام شافعی کے اصول، اور ابنِ خلدون کا فلسفہِ تاریخ—یہ سب اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام نے عقل کو دبایا نہیں بلکہ وحی کی روشنی میں رہنمائی دی۔

فکری غلامی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان ادارے، جامعات اور پالیسی ساز بھی مغربی ماڈلز کی اندھی تقلید کرنے لگے۔ تعلیمی ادارے مقامی اقدار کے بجائے عالمی رینکنگ، مارکیٹ ویلیو اور بیرونی منظوری کے پیچھے دوڑنے لگے۔ یوں تعلیم کا مقصد قوم سازی کے بجائے عالمی قبولیت بن گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں لادینیت کا ایک گہرا سبب نوآبادیاتی تعلیمی ورثہ اور فکری غلامی ہے۔ جب تعلیم خوداعتمادی کے بجائے احساسِ کمتری پیدا کرے، اور علم اپنی تہذیب سے کاٹ دے، تو دین زندگی کے حاشیے پر چلا جاتا ہے۔

(مغربی فلسفہ، فکری شکوک، اور مسلمان نوجوان کا ذہنی انتشار)

تعلیم اور فکری ماحول جب دین سے کٹ جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ صرف لاعلمی نہیں بلکہ شک ہوتا ہے۔ شک بذاتِ خود کوئی جرم نہیں؛ اسلام نے سوال کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ مگر جب سوال کو رہنمائی نہ ملے اور شک کو مقصد بنا لیا جائے تو یہی شک آہستہ آہستہ ایمان کی بنیادیں ہلا دیتا ہے۔

جدید تعلیمی اداروں میں مغربی فلسفہ ایک غالب فکری سانچے کے طور پر پڑھایا

جاتا ہے۔ سیکولرازم، لبرل ازم، مادیت (Materialism) اور عقلیتِ محض (Rationalism) کو ''عالمگیر سچائی'' کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، جبکہ دین کو ذاتی عقیدہ یا ثقافتی ورثہ بنا کر محدود کر دیا جاتا ہے۔ اس فکری عدم توازن کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ طالبِ علم کے ذہن میں وحی اور عقل کو متصادم بنا دیا جاتا ہے۔

اسلام عقل کو رد نہیں کرتا، بلکہ اسے وحی کی روشنی میں درست سمت دیتا ہے۔ قرآنِ مجید بار بار غور و فکر کی دعوت دیتا ہے:

﴿أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾

﴿أَفَلَا يَتَفَكَّرُونَ﴾

یہ آیات واضح کرتی ہیں کہ ایمان اندھی تقلید نہیں بلکہ باشعور قبولیت ہے۔ مگر جب عقل کو وحی سے آزاد کر دیا جائے تو وہ خود کو حتمی معیار سمجھنے لگتی ہے، اور یہی وہ نکتہ ہے جہاں فکری گمراہی شروع ہوتی ہے۔

مغربی فلسفے کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ما بعد الطبیعیات (Metaphysics) کو غیر سائنسی قرار دیتا ہے۔ خدا، وحی، فرشتے اور آخرت جیسے تصورات کو ''ناقابلِ تجربہ'' کہہ کر علم کے دائرے سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ نتیجتاً طالبِ علم کے ذہن میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ جو چیز لیبارٹری میں ثابت نہ ہو، وہ حقیقت نہیں۔

قرآنِ مجید اس تصور کو بنیادی طور پر رد کرتا ہے:

جو لوگ غیب پر ایمان لاتے ہیں (سورۃ البقرہ آیت 3)

ایمان بالغیب ایمان کی پہلی سیڑھی ہے، کیونکہ انسانی علم کی حدود ہیں، اور وحی ان حدود کے پار کی خبر دیتی ہے۔ مگر جدید فکری ماحول میں ان حدود کو تسلیم کرنے کے بجائے

انکار کو ذہانت سمجھا جانے لگا ہے۔

مسلمان نوجوان جب اس فکری دباؤ میں آتا ہے تو وہ دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک طرف اس کا مذہبی ورثہ ہوتا ہے، دوسری طرف تعلیمی اداروں میں پڑھایا جانے والا فلسفہ۔ چونکہ اکثر اوقات اسے ان دونوں کے درمیان مصالحت کا راستہ نہیں دکھایا جاتا، اس لیے وہ یا تو دین کو جذباتی خانہ بنا لیتا ہے یا پھر اسے سوالوں کے بوجھ تلے چھوڑ دیتا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں فکری انتشار جنم لیتا ہے۔ نوجوان کہتا ہے:

''اگر سائنس سب کچھ بیان کر سکتی ہے تو خدا کی کیا ضرورت؟''

''اگر اخلاق سماجی معاہدہ ہیں تو حلال و حرام کیوں؟''

یہ سوالات بذاتِ خود خطرناک نہیں، مگر جب ان کے جوابات اسلامی فکری روایت سے نہ ملیں تو یہی سوالات لادینیت کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔

اسلامی علمی روایت میں ان سوالات پر صدیوں سے گفتگو ہوتی رہی ہے۔ امام غزالی نے فلسفے کا تنقیدی جائزہ لیا، ابنِ تیمیہ نے عقل و نقل کی ہم آہنگی واضح کی، اور ابنِ رشد نے فلسفے اور شریعت کے تعلق پر بحث کی۔ مگر جدید مسلمان طالبِ علم کو اکثر اس روایت سے روشناس ہی نہیں کرایا جاتا۔

نبی کریم ﷺ نے فکری شکوک کے بارے میں نہایت متوازن رہنمائی فرمائی:
''تم میں سے کسی کے پاس شیطان آتا ہے اور تمہارے دل میں پہلے تو یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ فلاں چیز کس نے پیدا کی، فلاں چیز کس نے پیدا کی؟ اور آخر میں بات یہاں تک پہنچاتا ہے کہ خود تمہارے رب کو کس نے پیدا کیا؟ جب کسی شخص کو ایسا وسوسہ ڈالے تو اللہ سے پناہ مانگنی چاہئے، شیطانی خیال کو چھوڑ دے۔'' (صحیح البخاری حدیث: 3276)

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ شک آنا شیطان کی طرف سے ہے، مگر ان شکوک کا علاج علم، ذکر اور رہنمائی ہے، نہ کہ انکار۔

مغربی فلسفے کا ایک اور اثر یہ ہے کہ وہ انسان کو مرکزِ کائنات بنا دیتا ہے۔ فرد کی خواہش، آزادی اور مرضی کو حتمی قدر سمجھا جاتا ہے۔ اس تصور میں بندگی، اطاعت اور جواب دہی جیسے تصورات غیر ضروری یا جبر معلوم ہونے لگتے ہیں۔ نتیجتاً عبادت، شریعت اور حدود انسان کو قید محسوس ہونے لگتی ہیں۔

اسلام اس کے برعکس انسان کو باوقار مگر جواب دہ مخلوق قرار دیتا ہے:

اس دن ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ (سورۃ النور آیت 24)

یہ جواب دہی انسان کی آزادی کو ختم نہیں کرتی بلکہ اسے اخلاقی دائرہ فراہم کرتی ہے۔

فکری انتشار کا ایک افسوسناک نتیجہ یہ ہے کہ نوجوان یا تو مکمل انکار کی طرف چلا جاتا ہے یا شدید دوغلے پن کا شکار ہو جاتا ہے۔ بظاہر وہ مسلمان رہتا ہے، مگر عملی زندگی میں دین کو غیر متعلق سمجھتا ہے۔ یہی کیفیت آگے چل کر نسل در نسل منتقل ہوتی ہے، اور لادینیت ایک اجتماعی رجحان بن جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں بڑھتی ہوئی لادینیت کا ایک اہم سبب مغربی فلسفے کا غیر تنقیدی نفوذ اور فکری رہنمائی کا فقدان ہے۔ جب سوالات ہوں مگر جواب نہ ہوں، اور عقل ہو مگر وحی کی رہنمائی نہ ہو، تو ذہن انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔

(جامعات، میڈیا اور ادارے: دین مخالف بیانیے کی منظّم تشکیل)

کسی بھی معاشرے میں نظریات محض کتابوں سے نہیں پھیلتے بلکہ اداروں کے ذریعے ذہنوں میں راسخ ہوتے ہیں۔ جامعات، میڈیا، تحقیقی مراکز (Think Tanks) اور پالیسی ساز ادارے مل کر ایک ایسا فکری ماحول تشکیل دیتے ہیں جو یہ طے کرتا ہے کہ کیا **''معقول''** ہے، کیا **''جدید''** ہے، اور کیا **''قابلِ قبول''** ہے۔ مسلمانوں میں لادینیت کے پھیلاؤ میں اس ادارہ جاتی کردار کو نظر انداز کرنا ایک سنگین فکری غلطی ہوگی۔

جامعات کو بظاہر غیر جانبدار علمی مراکز سمجھا جاتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر جامعہ کسی نہ کسی فکری ورلڈ ویو کی نمائندگی کرتی ہے۔ جدید جامعات میں غالب ورلڈ ویو سیکولر ہے، جہاں مذہب کو تحقیق، سیاست اور سماجی تجزیے سے باہر رکھا جاتا ہے۔ نتیجتاً طالبِ علم کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ دین ایک ذاتی معاملہ ہے، جس کا اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔

اسلام اس تصور کو بنیادی طور پر رد کرتا ہے۔ قرآنِ مجید زندگی کو ایک وحدت کے طور پر دیکھتا ہے، نہ کہ الگ الگ خانوں میں:

کہہ دے بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے، جو جہانوں کا رب ہے۔ (سورۃ الأنعام: آیت 162)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ مسلمان کی زندگی کا کوئی پہلو اللہ کی رہنمائی سے باہر نہیں۔

جامعات میں **''علمی آزادی''** کے نام پر اکثر ایسے نظریات کو فروغ دیا جاتا ہے جو دین پر براہِ راست یا بالواسطہ سوال اٹھاتے ہیں، مگر دینی نقطہ نظر کو یا تو غیر علمی قرار دے دیا

جاتا ہے یا اسے جذباتی وعظ سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ یوں آزادی کا معیار یک طرفہ ہو جاتا ہے—شک کی اجازت ہوتی ہے، مگر یقین کی نہیں۔

یہی رویہ میڈیا میں اور زیادہ شدت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ میڈیا جدید دور کا سب سے طاقتور ادارہ ہے، کیونکہ وہ صرف خبر نہیں دیتا بلکہ معنی تخلیق کرتا ہے۔ دین کو اکثر میڈیا میں یا تو شدت پسندی کے ساتھ جوڑا جاتا ہے یا اسے پسماندہ، دقیانوسی اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ کے طور پر دکھایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس لادین یا سیکولر طرزِ زندگی کو آزاد، خوشحال اور روشن خیال بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

قرآنِ مجید نے اسی طرح کے فکری دباؤ کی طرف اشارہ کیا تھا:

تو تم جھٹلانے والوں کا کہانہ ماننا۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم نرمی اختیار کرو تو یہ بھی نرم ہو جائیں۔ (سورۃ القلم آیات 8-9)

یعنی وہ چاہتے ہیں کہ تم نرمی دکھاؤ، تاکہ وہ بھی نرمی دکھائیں—یہ نرمی دراصل حق سے دستبرداری کا مطالبہ ہوتی ہے۔

تھنک ٹینکس اور تحقیقی ادارے بھی اس فکری تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ پالیسی سازی، نصاب کی تشکیل، اور سماجی اصلاح کے نام پر جو رپورٹس تیار کی جاتی ہیں، ان میں اکثر دین کو مسئلہ (Problem) کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، حل (Solution) کے طور پر نہیں۔ مذہبی اقدار کو جدید ریاست، انسانی حقوق یا ترقی سے متصادم دکھایا جاتا ہے، حالانکہ یہ تصادم اکثر غلط مفروضات پر مبنی ہوتا ہے۔

اسلامی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ دین نے علم، تحقیق اور ریاستی نظم کو کبھی روکا نہیں، بلکہ انہیں اخلاقی بنیاد فراہم کی۔ خلافتِ راشدہ کے عدالتی نظام، تعلیمی ادارے اور فلاحی انتظامات اس بات کا عملی ثبوت ہیں کہ دین اور ادارہ سازی ایک دوسرے کے مخالف

نہیں بلکہ معاون ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''مجھے تو صرف اس (مقصد) کے لیے مبعوث کیا گیا کہ اخلاقی اقدار کی تکمیل کرسکوں۔'' (سلسلہ احادیث صحیحہ حدیث:2399)

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ دین کا مقصد فرد کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اجتماعی اخلاقی نظام کی تکمیل ہے۔

ادارہ جاتی لادینیت کا ایک خطرناک پہلو یہ ہے کہ یہ خود کو غیر محسوس انداز میں نافذ کرتی ہے۔ کوئی کھلے عام یہ نہیں کہتا کہ **''دین کو چھوڑ دو''**، بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ **''دین کو اپنی جگہ رکھو''**۔ یہی جملہ دراصل دین کو حاشیے پر دھکیلنے کا سب سے مؤثر طریقہ ہے۔

جب نصاب، میڈیا اور پالیسی سب ایک ہی فکری سمت میں چلنے لگیں تو نوجوان کے لیے مختلف سوچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ جو کچھ سوچتا ہے، وہی اسے **''نارمل''** لگنے لگتا ہے، اور دین آہستہ آہستہ غیر معمولی محسوس ہونے لگتا ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں لادینیت ایک سماجی نارم بننے لگتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں بڑھتی ہوئی لادینیت کا ایک اہم سبب ادارہ جاتی بیانیہ ہے، جو تعلیم، میڈیا اور پالیسی کے ذریعے دین کو غیر متعلق ثابت کرتا ہے۔ جب پورا فکری ماحول ایک ہی سمت میں ہو تو فرد کی مزاحمت کمزور پڑ جاتی ہے، اور دین خاموشی سے زندگی کے حاشیے پر چلا جاتا ہے۔

(مسلمان اداروں کی داخلی کوتاہیاں، تعلیمی خلیج، اور اصلاح کی عملی راہیں)

اس باب میں اب تک ہم نے دیکھا کہ نوآبادیاتی تعلیمی ورثہ، مغربی فلسفے کا غیر تنقیدی نفوذ، اور ادارہ جاتی بیانیہ کس طرح مسلمانوں میں لادینیت کے فروغ کا سبب

بنے۔ مگر ایک دیانت دار فکری تجزیہ یہ تقاضا کرتا ہے کہ ہم صرف بیرونی عوامل پر اکتفا نہ کریں بلکہ اپنی داخلی کمزوریوں کا بھی سنجیدگی سے جائزہ لیں۔ کیونکہ اگر اندر بنیاد مضبوط ہو تو بیرونی اثرات زیادہ دیر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

مسلمان معاشروں کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ دینی اور عصری تعلیم کے درمیان گہری خلیج پیدا ہو چکی ہے۔ ایک طرف دینی ادارے ہیں جو جدید دنیا، سائنسی ترقی اور عصری فکری سوالات سے کٹے ہوئے نظر آتے ہیں، اور دوسری طرف عصری تعلیمی ادارے ہیں جو دین، فقہ اور اسلامی فکری روایت سے ناآشنا ہیں۔ نتیجتاً ایک ہی معاشرے میں دو مختلف ذہن تیار ہوتے ہیں، جو ایک دوسرے کو سمجھنے کے بجائے ایک دوسرے پر شک کرتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات میں یہ تقسیم کبھی موجود نہیں تھی۔ قرآنِ مجید نے علم کو ایک وحدت کے طور پر پیش کیا ہے:

اور دعا کرو کہ میرے پروردگار مجھے اور زیادہ علم دے۔ (سورۃ طٰہٰ آیت 114)

یہ دعا کسی خاص قسم کے علم تک محدود نہیں، بلکہ ہر اس علم پر محیط ہے جو انسان کو حق کے قریب لے جائے۔ مگر جب علم کو خانوں میں بانٹ دیا جائے تو دین یا تو عملی زندگی سے کٹ جاتا ہے یا جدید دنیا سے۔

مسلمان اداروں کی ایک اور کمزوری فکری دفاع کا فقدان ہے۔ جدید دور کے سوالات — جیسے سائنس اور مذہب کا تعلق، آزادی اور شریعت، عورت کے حقوق، ریاست اور دین — ان پر سنجیدہ، علمی اور عصرِ حاضر کے مطابق گفتگو بہت کم نظر آتی ہے۔ اکثر اوقات یا تو ان سوالات کو "**غیر ضروری**" کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے، یا پھر جذباتی ردِعمل اختیار کیا جاتا ہے۔ نتیجتاً نوجوان اپنے سوالوں کے جوابات کہیں اور تلاش کرنے پر مجبور ہو جاتا

ہے۔

نبی کریم ﷺ کا اسلوب اس کے برعکس تھا۔ آپ ﷺ سوال سے گھبراتے نہیں تھے بلکہ اسے تربیت کا ذریعہ بناتے تھے۔

قرآنِ مجید میں بار بار آتا ہے:

﴿يَسْأَلُونَكَ ... قُلْ﴾

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سوال کا جواب دینا نبوی منہج کا حصہ ہے، نہ کہ کمزوری۔

مسلمان تعلیمی اداروں کی ایک اور بڑی کوتاہی کردار سازی پر کم توجہ ہے۔ بہت سے ادارے یا تو محض اسناد دینے میں مصروف ہیں یا صرف معلومات منتقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اخلاق، دیانت، خدمتِ خلق اور اجتماعی ذمہ داری جیسے اوصاف عملی تربیت کے بجائے نعروں تک محدود ہو گئے ہیں۔ حالانکہ اسلام میں علم کا مقصد کردار ہے، نہ کہ صرف معلومات۔

قرآنِ مجید نبی ﷺ کے مشن کو یوں بیان کرتا ہے:

وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے۔ یقیناً یہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔ (سورۃ الجمعہ آیت 2)

تزکیہ (کردار سازی) کو تعلیم پر مقدم رکھا گیا، مگر ہم نے اس ترتیب کو نظرانداز کر دیا۔

اصلاح کا پہلا قدم یہ ہے کہ دینی اور عصری تعلیم کے درمیان پل تعمیر کیا جائے۔

ایسا نصاب جو جدید علوم کو اسلامی ورلڈ ویو کے ساتھ جوڑے، اور طلبہ کو یہ احساس دے کہ دین سوالات سے نہیں گھبراتا بلکہ انہیں سمت دیتا ہے۔ اس کے لیے ایسے اساتذہ، محققین اور ادارے درکار ہیں جو دونوں دنیاو؟ں سے واقف ہوں۔

اصلاح کا دوسرا قدم فکری خوداعتمادی کی بحالی ہے۔ مسلمان نوجوان کو یہ احساس دلانا ضروری ہے کہ اس کا دین محض ماضی کا ورثہ نہیں بلکہ حال اور مستقبل کی رہنمائی کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسلامی تہذیب نے صدیوں تک علم، فلسفہ، سائنس اور ریاست کی رہنمائی کی ہے، اور آج بھی اس میں وہ صلاحیت موجود ہے—بشرطیکہ ہم اسے سمجھیں اور پیش کریں۔

قرآنِ مجید فرماتا ہے:

اور (دیکھو) بے دل نہ ہونا اور نہ کسی طرح کا غم کرنا اگر تم مومن (صادق) ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔ (سورۃ آل عمران آیت 139)

یہ آیت فکری مرعوبیت کے علاج کی بنیاد ہے۔

اصلاح کا تیسرا اور آخری قدم ادارہ جاتی تجدید ہے۔ مسلمان جامعات، مدارس، میڈیا اور تحقیقی مراکز کو محض ردِعمل کے بجائے مثبت متبادل بیانیہ پیش کرنا ہوگا۔ ایسا بیانیہ جو جدید دنیا کے مسائل کو سمجھے، مگر ان کا حل اسلامی اخلاق اور وحی کی روشنی میں دے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''چھوڑے جاتا ہوں میں تم میں دو چیزوں کو، نہیں گمراہ ہوگے جب تک پکڑے رہو گے ان کو، کتاب اللہ اور اس کے رسول کی سنت۔'' (موطا امام مالک حدیث:1620)

کتابُ اللہ اور سنت—یہ امت کی فکری اور عملی رہنمائی کا مکمل نظام ہیں،

بشرطیکہ ہم انہیں زندگی کے مرکز میں واپس لائیں۔

باب پنجم کا مجموعی خلاصہ

باب پنجم نے یہ حقیقت واضح کردی کہ:

- تعلیم اور ادارے ذہن سازی میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں
- نوآبادیاتی ورثہ اور مغربی فلسفہ لادینیت کو تقویت دیتے ہیں
- مگر مسلمان اداروں کی داخلی کمزوریاں بھی اس بحران کو بڑھاتی ہیں
- اصلاح کا راستہ تعلیم، فکر اور اداروں کی ہم آہنگ تجدید سے ہو کر گزرتا ہے

باب 06

سیاسی، معاشی اور عالمی اسبابِ لادینیت

(سیاست کا دین سے جدا ہونا اور ریاستی سطح پر سیکولرازم کا نفوذ)

انسان کی زندگی میں سیاست محض اقتدار کی کشمکش کا نام نہیں بلکہ اجتماعی فیصلوں، اقدار اور ترجیحات کی عکاس ہوتی ہے۔ جب سیاست اخلاق اور دین سے جڑی ہو تو وہ عدل، امانت اور خدمت کی شکل اختیار کرتی ہے، اور جب دین سے کٹ جائے تو طاقت، مفاد اور فریب کا کھیل بن جاتی ہے۔ مسلمانوں میں دین سے دوری کا ایک گہرا اور دیرپا سبب سیاسی نظام کا دین سے الگ ہو جانا ہے۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اسلام میں سیاست کوئی الگ شعبہ نہیں بلکہ عبادت، اخلاق اور جواب دہی کا تسلسل ہے۔ نبی کریم ﷺ صرف روحانی رہنما نہیں تھے بلکہ مدینہ کی ریاست کے سربراہ بھی تھے۔ آپ ﷺ نے سیاست کو اخلاق سے الگ نہیں کیا بلکہ اسے عدل اور ذمہ داری کے تابع رکھا۔

قرآنِ مجید اس اصول کو یوں بیان کرتا ہے:

بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو، یقیناً اللہ تمھیں یہ بہت ہی اچھی نصیحت کرتا ہے۔ بے شک اللہ ہمیشہ سے سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ (سورۃ النساء آیت 58)

یہ آیت ریاستی نظام کی اخلاقی بنیاد واضح کرتی ہے۔

مگر جدید دور میں مسلمانوں پر جو سیاسی ماڈل مسلط ہوا، وہ بنیادی طور پر سیکولر ریاست کا تصور تھا، جس میں دین کو سیاست اور قانون سازی سے الگ کر دیا گیا۔ اس تصور کے مطابق ریاست کا کوئی مذہب نہیں، اور دین محض فرد کا نجی معاملہ ہے۔ بظاہر یہ تصور غیر جانب دار نظر آتا ہے، مگر حقیقت میں یہ دین کو اجتماعی زندگی سے خارج کرنے کا مؤثر ذریعہ بن گیا۔

نوآبادیاتی دور کے بعد جب مسلم ممالک وجود میں آئے تو ان کے آئین، قوانین اور سیاسی ادارے زیادہ تر مغربی سیاسی فلسفے سے متاثر تھے۔ اسلام کو اکثر علامتی حیثیت دی گئی— کبھی دیباچے میں، کبھی قومی شعار میں— مگر عملی قانون سازی، معیشت اور خارجہ پالیسی میں اسے ثانوی یا غیر متعلق بنا دیا گیا۔ نتیجتاً عوام کے ذہن میں یہ تصور پختہ ہوتا گیا کہ دین عبادت تک محدود ہے، جبکہ ریاست ''دنیاوی معاملہ'' ہے۔

یہی تقسیم آگے چل کر ایک سنگین فکری تضاد پیدا کرتی ہے۔ مسلمان شہری جب دیکھتا ہے کہ ریاستی فیصلے، قوانین اور طاقت کے مراکز دین کے بغیر چل رہے ہیں تو وہ لاشعوری طور پر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ دین جدید اجتماعی زندگی کے لیے غیر ضروری ہے۔ یوں لادینیت کسی نظریے کے بجائے عملی تجربے سے پروان چڑھتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے سیاست میں دیانت اور جواب دہی کو بنیادی اصول قرار دیا تھا:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہر آدمی حاکم ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہوگا۔ امام حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔ مرد اپنے گھر کے معاملات کا افسر ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہوگا۔

عورت اپنے شوہر کے گھر کی افسر ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہوگا۔ خادم اپنے آقا (سید) کے مال کا محافظ ہے اور اس سے اس کے بارے میں سوال ہوگا''۔ (صحیح البخاری حدیث:2558)

یہ حدیث ریاستی منصب کو محض اختیار نہیں بلکہ امانت قرار دیتی ہے، مگر جب سیاست دین سے کٹ جائے تو اقتدار ذمہ داری کے بجائے مراعات بن جاتا ہے۔

سیاسی نظام میں دین سے دوری کا ایک اور نتیجہ عدل کے تصور کی کمزوری ہے۔ جب عدل کا معیار وحی کے بجائے طاقت، اکثریت یا مفاد بن جائے تو انصاف نسبتی (Relative) ہو جاتا ہے۔ قانون سب کے لیے برابر ہونے کے دعوے کے باوجود کمزور کے لیے سخت اور طاقتور کے لیے نرم ہو جاتا ہے۔ یہ تضاد عوام کو دین اور ریاست دونوں سے بدظن کر دیتا ہے۔

قرآنِ مجید نے خبردار فرمایا:

اے ایمان والو! تم اللہ کی خاطر حق پر قائم ہو جاؤ، راستی اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ، کسی قوم کی عداوت تمہیں خلاف عدل پر آمادہ نہ کر دے، عدل کیا کرو جو پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔ (سورۃ المائدہ آیت 8)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ عدل جذبات، مفادات اور دشمنی سے بالاتر اصول ہے — مگر جدید سیاست اکثر اس اصول کو نظرانداز کر دیتی ہے۔

سیاست میں دین کی غیر موجودگی نے ایک اور خطرناک رجحان کو جنم دیا: اخلاق کے بغیر مذہب اور مذہب کے بغیر اخلاق۔ ایک طرف کچھ لوگ دین کو صرف نعرے کے طور پر استعمال کرتے ہیں، دوسری طرف کچھ اسے مکمل طور پر غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ دونوں

صورتوں میں دین اپنی حقیقی اصلاحی قوت کھو دیتا ہے، اور عوام بداعتمادی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہ بداعتمادی آگے چل کر نوجوان نسل میں شدید ردِعمل پیدا کرتی ہے۔ وہ سیاست کو منافقت اور دین کو سیاسی ہتھیار سمجھنے لگتی ہے۔ نتیجتاً دین سے وابستگی کمزور پڑتی ہے، نہ اس لیے کہ دین غلط ہے، بلکہ اس لیے کہ اسے غلط انداز میں پیش کیا گیا۔

اسلام سیاست سے فرار کا نہیں بلکہ اصلاحِ سیاست کا دین ہے۔ خلافتِ راشدہ کی مثال اس بات کا عملی ثبوت ہے کہ دین، اقتدار اور اخلاق ایک ساتھ چل سکتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کا یہ قول تاریخ کا حصہ ہے کہ:

''اگر فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر گیا تو عمر سے پوچھ ہوگی''

یہ احساسِ جواب دہی وہ چیز ہے جو جدید سیاسی نظام میں ناپید ہوتی جا رہی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں بڑھتی ہوئی لادینیت کا ایک بڑا سبب ریاستی اور سیاسی سطح پر دین کا اخراج ہے۔ جب سیاست دین کے بغیر چلتی ہے تو عوام یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ دین اجتماعی زندگی کے لیے غیر متعلق ہے، اور یہی سوچ آہستہ آہستہ فرد کے ایمان اور عمل دونوں کو کمزور کر دیتی ہے۔

(معاشی نظام، سرمایہ دارانہ دباؤ، مادہ پرستی اور دین سے بدظنی)

انسان کی فکری اور روحانی کیفیت پر اس کے معاشی حالات کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ جب رزق، روزگار، ضروریاتِ زندگی اور معاشی تحفظ مسلسل خطرے میں ہوں تو انسان کا ذہن بقا کی جنگ میں الجھ جاتا ہے، اور دین — جو صبر، قناعت اور عدل کی دعوت دیتا ہے — اکثر پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں دین سے دوری کا ایک اہم سبب

معاشی نظام کا غیر منصفانہ اور مادہ پرستانہ ہونا ہے۔

اسلام میں معیشت محض دولت کمانے کا نام نہیں بلکہ ایک اخلاقی نظام ہے، جس کی بنیاد عدل، توازن اور رحمت پر ہے۔ قرآنِ مجید میں رزق کو اللہ کی عطا قرار دیا گیا ہے:

بے شک اللہ ہی بے حد رزق دینے والا، طاقت والا، نہایت مضبوط ہے۔ (الذاریات:58)

یہ آیت انسان کو یہ یقین دیتی ہے کہ رزق کا اصل مالک اللہ ہے، نہ کہ مارکیٹ، ریاست یا سرمایہ دار۔

مگر جدید معاشی نظام — خصوصاً سرمایہ دارانہ (Capitalist) نظام — نے رزق کو محض محنت، مقابلے اور طاقت کا نتیجہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اس نظام میں دولت کا ارتکاز چند ہاتھوں میں ہوتا ہے، جبکہ اکثریت مسلسل عدمِ تحفظ، مہنگائی اور قرض کے بوجھ تلے دبی رہتی ہے۔ جب مسلمان اس حقیقت کو دیکھتا ہے کہ **"محنت کے باوجود انصاف نہیں ملتا"** تو وہ یا تو مایوسی کا شکار ہوتا ہے یا دین سے بدظن ہو جاتا ہے۔

قرآنِ مجید نے دولت کے ارتکاز کو واضح طور پر ایک خرابی قرار دیا ہے:

جو کچھ بھی اللہ نے ان بستیوں والوں سے اپنے رسول پر لوٹایا تو وہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابت دار اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لیے ہے، تاکہ وہ تم میں سے مال داروں کے درمیان ہی گردش کرنے والا نہ۔ (سورۃ الحشر آیت 7)

یہ آیت اسلامی معیشت کے بنیادی اصول کو بیان کرتی ہے کہ دولت صرف امیروں کے درمیان گردش نہ کرے، مگر جدید معاشی نظام اس کے بالکل برعکس کام کرتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا ایک بڑا اثر مادہ پرستی (Materialism) کا فروغ ہے۔ انسان کی قدر اس کی دولت، پیداوار اور خریدنے کی طاقت سے ناپی جانے لگتی ہے۔ یوں عزت، وقار اور کامیابی کے معیارات بدل جاتے ہیں۔ جو زیادہ کماتا ہے وہ کامیاب، اور جو کمزور ہے وہ ناکام سمجھا جاتا ہے۔ اس ماحول میں دین کی تعلیمات — قناعت، سادگی اور آخرت کی فکر — غیر عملی محسوس ہونے لگتی ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے اس ذہنیت کے خطرے کی طرف متنبہ فرمایا تھا: ”دینار و درہم کے بندے، عمدہ ریشمی چادروں کے بندے، سیاہ کملی کے بندے، تباہ ہوگئے کہ اگر انہیں دیا جائے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں اور اگر نہ دیا جائے تو ناراض رہتے ہیں۔“ (صحیح البخاری حدیث:6435)

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ دولت جب مقصد بن جائے تو انسان غلام بن جاتا ہے، اور یہی غلامی روحانی زوال کا آغاز ہوتی ہے۔

معاشی ناانصافی کا ایک اور خطرناک پہلو یہ ہے کہ یہ دین کے بارے میں غلط تاثر پیدا کرتی ہے۔ جب غریب یہ دیکھتا ہے کہ مذہبی لوگ یا مذہبی ادارے بھی بعض اوقات ظلم یا استحصال کے نظام کا حصہ بن جاتے ہیں، تو اس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ”اگر دین حق ہوتا تو یہ سب کیوں ہوتا؟“

یہ سوال اکثر دین کے خلاف نہیں بلکہ دین کے غلط نمائندوں کے خلاف ہوتا ہے، مگر نتیجہ بہرحال دین سے دوری کی صورت میں نکلتا ہے۔

قرآنِ مجید نے اسی کیفیت کو یوں بیان کیا:

بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ ایک کنارے پر (کھڑے) ہو کر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ اگر کوئی نفع مل گیا تو دلچسپی لینے لگتے ہیں اور اگر کوئی آفت آ گئی تو اسی وقت منہ

پھیر لیتے ہیں، انہوں نے دونوں جہان کا نقصان اٹھالیا۔ واقعی یہ کھلا نقصان ہے۔ (سورۃ الحج: آیت 11)

یہ آیت اس نفسیاتی حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ جب دین کو صرف دنیاوی فائدے سے جوڑ دیا جائے تو آزمائش میں ایمان متزلزل ہو جاتا ہے۔

جدید معاشی دباؤ نے عبادت کے لیے وقت، ذہنی سکون اور توجہ بھی کم کر دی ہے۔ طویل اوقاتِ کار، مستقل مقابلہ، اور مالی عدمِ تحفظ انسان کو اس قدر تھکا دیتا ہے کہ نماز، مطالعہ قرآن اور دینی شعور بوجھ محسوس ہونے لگتے ہیں۔ یوں دین آہستہ آہستہ **"فرصت کی چیز"** بن جاتا ہے، اور جب فرصت ہی نہ ہو تو دین بھی غائب ہو جاتا ہے۔

اسلام اس کے برعکس معیشت کو عبادت کے تابع رکھتا ہے، عبادت کو معیشت کے تابع نہیں۔

قرآنِ مجید فرماتا ہے:

اور جب کوئی سودا بکتا دیکھیں یا کوئی تماشا نظر آ جائے تو اس کی طرف دوڑ جاتے ہیں اور آپ کو کھڑا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کے پاس جو ہے وہ کھیل اور تجارت سے بہتر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بہترین روزی رساں ہے۔ (سورۃ الجمعہ آیت 10)

یہ ترتیب واضح کرتی ہے کہ عبادت مرکز ہے، اور معاش اس کے بعد۔

معاشی ناانصافی کا ایک عالمی پہلو بھی ہے۔ عالمی مالیاتی ادارے، سودی نظام، اور قرضوں کی سیاست نے کئی مسلم ممالک کو مستقل معاشی غلامی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ جب ریاستیں خود معاشی طور پر بے اختیار ہوں تو وہ عوام کو بھی انصاف فراہم نہیں کر سکتیں۔ اس صورتِ حال میں دین اکثر کمزور طبقے کے لیے صرف تسلی بن کر رہ جاتا ہے، عملی حل

نہیں — حالانکہ اسلام ایک مکمل معاشی نظام پیش کرتا ہے۔

قرآنِ مجید سود کے بارے میں نہایت سخت زبان استعمال کرتا ہے:

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے وہ چھوڑ دو، اگر تم سچ مچ ایمان والے ہو۔ اور اگر ایسا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ، ہاں اگر توبہ کرلو تو تمہارا اصل مال تمہارا ہی ہے، نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔ (سورۃ البقرہ: آیات 278-279)

یہ اعلان اس بات کا ثبوت ہے کہ معاشی ظلم محض سماجی خرابی نہیں بلکہ اللہ اور رسول ﷺ کے خلاف جنگ کے مترادف ہے۔ مگر جب پورا عالمی نظام سود پر کھڑا ہو تو مسلمان خود کو بے بس محسوس کرتا ہے، اور یہی بے بسی دین سے بددلی میں بدل جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں دین سے دوری کا ایک گہرا سبب غیر منصفانہ معاشی نظام اور مادہ پرستانہ اقدار ہیں۔ جب رزق میں برکت نہ ہو، انصاف نظر نہ آئے، اور دولت ہی کامیابی کا معیار بن جائے تو دین یا تو رسمی رہ جاتا ہے یا بوجھ محسوس ہونے لگتا ہے۔

(عالمی طاقتیں، ثقافتی یلغار، تہذیبی دباؤ اور شناخت کا بحران)

دنیا آج جس عالمی نظام کے تحت چل رہی ہے، وہ محض ریاستوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک تہذیبی ڈھانچہ ہے، جس میں طاقت، علم، میڈیا اور معیشت ایک مخصوص ورلڈ ویو کے تحت کام کرتے ہیں۔ اس نظام میں مغربی تہذیب کو نہ صرف طاقت بلکہ معیار (Standard) کا درجہ حاصل ہے۔ جو چیز مغرب سے آئے وہ جدید، ترقی یافتہ اور قابلِ قبول سمجھی جاتی ہے، اور جو اس معیار سے مختلف ہو وہ پسماندہ، مشکوک یا خطرناک قرار پاتی

ہے۔

مسلمانوں میں دین سے دوری کے اسباب کو سمجھنے کے لیے اس عالمی تہذیبی دباؤ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہاں دین صرف ایک مذہبی عقیدہ نہیں بلکہ ایک مکمل تہذیبی شناخت ہے—اور یہی شناخت عالمی نظام کے لیے اکثر ایک چیلنج سمجھی جاتی ہے۔

عالمی طاقتیں جب کسی تہذیب پر غالب آتی ہیں تو سب سے پہلے اس کے بیانیے کو کمزور کرتی ہیں۔ میڈیا، فلم، ادب، تعلیمی مواد اور بین الاقوامی ادارے مل کر یہ تصور پھیلاتے ہیں کہ مذہب— خصوصاً اسلام— تشدد، جبر اور پسماندگی سے جڑا ہوا ہے، جبکہ سیکولر طرزِ زندگی آزادی، خوشحالی اور امن کی علامت ہے۔ یہ پیغام براہِ راست نہیں بلکہ بار بار کے تاثر سے ذہنوں میں راسخ ہوتا ہے۔

عالمی میڈیا کا کردار اس سلسلے میں نہایت فیصلہ کن ہے۔ فلموں، ڈراموں، خبروں اور سوشل میڈیا کے ذریعے ایک خاص طرزِ زندگی کو ''**نارمل**'' اور ''**آئیڈیل**'' بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ خاندانی نظام، حیا، مذہبی حدود اور اطاعت جیسے تصورات کو قدامت پرستی یا جبر کے طور پر دکھایا جاتا ہے۔ نتیجتاً مسلمان نوجوان اپنی ہی تہذیب اور دین کو بوجھ محسوس کرنے لگتا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں شناخت کا بحران جنم لیتا ہے۔ نوجوان یہ سوال کرنے لگتا ہے:

''کیا میں مسلمان ہو کر بھی جدید ہو سکتا ہوں؟''

''کیا دین میری ترقی کی راہ میں رکاوٹ تو نہیں؟''

جب ان سوالات کے جوابات اعتماد کے ساتھ نہ ملیں تو وہ یا تو دوہری زندگی

اختیار کرتا ہے یا اپنی دینی شناخت کو آہستہ آہستہ ترک کرنے لگتا ہے۔

اسلام نے شناخت کو عقیدے، اخلاق اور عمل سے جوڑا ہے، نہ کہ رنگ، نسل یا جغرافیے سے۔

یہ شناخت اعزاز بھی ہے اور ذمہ داری بھی۔ مگر عالمی تہذیبی دباؤ اس شناخت کو کمزور کر کے مسلمان کو ایک غیر واضح، معلق اور شرمندہ وجود میں بدل دیتا ہے۔

عالمی نظام کا ایک اور اہم ہتھیار انسانی حقوق کا یک رُخی بیانیہ ہے۔ اگرچہ انسانی حقوق کا تصور بذاتِ خود اسلام کے منافی نہیں، مگر جب اسے مذہب کے خلاف استعمال کیا جائے تو یہ فکری تصادم پیدا کرتا ہے۔ شریعت کے بعض احکام کو سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کیا جاتا ہے، اور اسلام کو ظالمانہ نظام کے طور پر دکھایا جاتا ہے، جبکہ مغربی نظام کی خامیوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

قرآنِ مجید نے انصاف کو عالمی اور غیر جانب دار اصول قرار دیا ہے:

اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو اور اللہ کے لئے سچی گواہی دو خواہ (اس میں) تمہارا یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کا نقصان ہی ہو۔ اگر کوئی امیر ہے یا فقیر تو اللہ ان کا خیر خواہ ہے۔ تو تم خواہش نفس کے پیچھے چل کر عدل کو نہ چھوڑ دینا۔ اگر تم پیچیدا شہادت دو گے یا (شہادت سے) بچنا چاہو گے تو (جان رکھو) اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔ (سورۃ النساء آیت 135)

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام عدل کو طاقت یا تہذیب سے مشروط نہیں کرتا، مگر عالمی نظام اکثر عدل کو مفاد کے تابع کر دیتا ہے۔

عالمی طاقتوں کی سیاسی مداخلت، جنگیں، پابندیاں اور دوہرا معیار بھی مسلمانوں

میں دین سے بدظنی پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ جب مسلمان یہ دیکھتا ہے کہ دنیا میں انصاف کا نعرہ لگانے والے خود ظلم کرتے ہیں، اور پھر بھی خود کو مہذب کہتے ہیں، تو اس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''اگر یہی جدید دنیا ہے تو دین کا کیا فائدہ؟''

یہ سوال بظاہر سیاسی ہوتا ہے، مگر انجام کار روحانی مایوسی میں بدل جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ دین کو ''**کمزوروں کی تسلی**'' سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اسلام نے مکہ کے کمزور مسلمانوں کو بھی یہی یقین دلایا تھا کہ حق وقتی طور پر دب سکتا ہے، مگر مٹ نہیں سکتا:

تم نہ سستی کرو اور غمگین ہو، تم ہی غالب رہو گے، اگر تم ایماندار ہو۔ (سورۃ آل عمران:139)

عالمی تہذیبی دباؤ کا ایک اور اثر ثقافتی نقالی ہے۔ لباس، زبان، رویے، حتیٰ کہ سوچنے کے انداز تک میں مغرب کی اندھی تقلید کو ترقی سمجھا جانے لگتا ہے۔ اس نقالی میں دین ایک رکاوٹ محسوس ہوتا ہے، کیونکہ دین سوال پوچھتا ہے، حدود مقرر کرتا ہے، اور جواب دہی کا احساس دلاتا ہے — جبکہ جدید ثقافت ''**جو دل چاہے**'' کا نعرہ لگاتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اسی اندھی تقلید سے خبردار فرمایا تھا: ''تم اپنے سے پہلی امتوں کی ایک ایک بالشت اور ایک ایک گز میں اتباع کرو گے، یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کے سوراخ میں داخل ہوئے ہوں گے تو تم اس میں بھی ان کی اتباع کرو گے۔'' ہم نے پوچھا: یا رسول اللہ! کیا یہود و نصاریٰ مراد ہیں؟ فرمایا پھر اور کون۔ (صحیح البخاری حدیث:7320)

یہ حدیث اس بات کی پیش گوئی ہے کہ تہذیبی غلامی ایمان کے لیے کتنا بڑا خطرہ بن سکتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں دین سے دوری کا ایک بڑا سبب عالمی تہذیبی دباؤ اور شناخت کا بحران ہے۔ جب طاقت، میڈیا اور ثقافت ایک ہی سمت میں کام کریں تو دین کو کمزور، غیر متعلق یا شرمناک بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس ماحول میں دین سے وابستہ رہنے کے لیے محض ایمان نہیں بلکہ فکری خود اعتمادی اور شعوری مزاحمت درکار ہوتی ہے۔

(عالمی نظام کے خلاف دینی ردِعمل: افراط، تفریط اور مزید لادینیت)

جب کسی معاشرے پر مسلسل سیاسی، معاشی اور تہذیبی دباؤ ڈالا جائے تو اس کے ردِعمل کی مختلف صورتیں سامنے آتی ہیں۔ مسلمانوں کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔ عالمی طاقتوں کی مداخلت، ثقافتی یلغار، ناانصافی اور دوہرے معیار کے جواب میں ایک متوازن، فکری اور اخلاقی ردِعمل کی بجائے اکثر دو انتہائیں پیدا ہو گئیں:

ایک طرف مکمل انکار اور لادینیت، اور دوسری طرف شدت پسندی اور افراط۔

بدقسمتی سے، دونوں راستے دین سے قربت کے بجائے مزید دوری کا سبب بنے۔

افراط کا پہلا مظہر یہ تھا کہ کچھ حلقوں نے دنیا کے تمام مسائل کا حل محض طاقت، غصے اور تصادم میں تلاش کرنا شروع کر دیا۔ عالمی ظلم کے جواب میں اخلاق، حکمت اور دعوت کے بجائے انتقامی بیانیہ اپنایا گیا۔ اس بیانیے میں دین کو امن، عدل اور رحمت کے بجائے غلبہ، نفرت اور تصادم کی علامت بنا دیا گیا۔

قرآنِ مجید نے اس طرزِ فکر کو واضح طور پر رد کیا ہے:

اپنے رب کی راہ کی طرف لوگوں کو حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ بلائیے اور ان سے بہترین طریقے سے گفتگو کیجیے، یقیناً آپ کا رب اپنی راہ سے بھٹکنے والوں کو بھی

بخوبی جانتا ہے اور وہ راہ یافتہ لوگوں سے بھی پورا واقف ہے۔ (سورۃ النحل آیت 125)

یہ آیت اس بات کا اعلان ہے کہ دین کا راستہ حکمت، صبر اور دلیل کا راستہ ہے، نہ کہ اندھا غصہ اور جذباتی ردِعمل۔

شدت پسندی کا سب سے خطرناک نتیجہ یہ ہوا کہ دین کا چہرہ مسخ ہو گیا۔ میڈیا اور عالمی طاقتوں کو وہ تصویر مل گئی جس کی انہیں تلاش تھی——ایک ایسا اسلام جو خوفناک، غیر منطقی اور تشدد پسند دکھایا جا سکے۔ اس کا سب سے بڑا نقصان خود مسلمانوں کو ہوا، خصوصاً نوجوان نسل کو، جو اس تصویر سے خوفزدہ ہو کر دین سے دور ہونے لگی۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ کی صبح مجھ سے فرمایا: اور آپ اپنی سواری پر تھے کہ "میرے لیے کنکریاں چن دو"۔ تو میں نے آپ کے لیے کنکریاں چنیں جو چھوٹی چھوٹی تھیں کہ چٹکی میں آ سکتی تھیں جب میں نے آپ کے ہاتھ میں انہیں رکھا تو آپ نے فرمایا: "ایسی ہی ہونی چاہیئے، اور تم اپنے آپ کو دین میں غلو سے بچاو؟۔ کیونکہ تم سے پہلے لوگوں کو ان کے دین میں غلو ہی نے ہلاک کر دیا ہے۔"
(سنن نسائی حدیث:3059)

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ افراط، چاہے نیت کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، دین کو نقصان پہنچاتا ہے۔

دوسری انتہا تفریط کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ کچھ لوگوں نے عالمی دباؤ سے تنگ آ کر یہ راستہ اختیار کیا کہ دین کو مکمل طور پر ذاتی معاملہ بنا لیا جائے، یا اسے جدید دنیا کے مطابق **"ڈھال"** دیا جائے——یہاں تک کہ اس کی بنیادی تعلیمات بھی غیر متعلق قرار پائیں۔ شریعت، حلال و حرام، اور اخلاقی حدود کو **"عصرِ حاضر سے متصادم"** کہہ کر پسِ پشت ڈال دیا گیا۔

یہ رویہ بظاہر امن اور ہم آہنگی کا پیغام دیتا ہے، مگر حقیقت میں یہ دینی خود سپردگی (Intellectual Surrender) ہے۔ قرآنِ مجید نے اس طرزِ فکر کو بھی واضح الفاظ میں رد کیا ہے:

بعض احکام پر ایمان رکھتے ہو اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ تم میں سے جو بھی ایسا کرے، اس کی سزا اس کے سوا کیا ہو کہ دنیا میں رسوائی اور قیامت کے دن سخت عذاب کی مار (سورۃ البقرہ: آیت 85)

یہ آیت دین کو ٹکڑوں میں بانٹنے کی شدید مذمت کرتی ہے۔

افراط اور تفریط — دونوں کا ایک مشترکہ نتیجہ یہ ہے کہ عام مسلمان الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک طرف اسے شدت اور نفرت نظر آتی ہے، دوسری طرف بے معنویت اور خالی آزادی۔ نتیجتاً وہ دونوں سے دور ہو کر ایک تیسرا راستہ اختیار کرتا ہے:

خاموش لا دینیت، بے تعلقی، یا صرف ثقافتی مسلمان ہونا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں دین سے دوری ایک فکری فیصلہ نہیں بلکہ نفسیاتی پناہ بن جاتی ہے۔ نوجوان کہتا ہے:

"اگر دین یہی دو چہرے رکھتا ہے، تو بہتر ہے میں اس سے فاصلہ رکھوں۔"

یہ جملہ دین کے خلاف نہیں بلکہ اس کی غلط نمائندگی کے خلاف ہوتا ہے — مگر نقصان دین ہی کو پہنچتا ہے۔

اسلام نے ان دونوں انتہاؤں کے مقابلے میں ہمیشہ اعتدال کا راستہ اختیار کیا ہے۔

یہ امتِ وسط ہونے کا اعزاز صرف نظریہ نہیں بلکہ ذمہ داری ہے — ایسا دین پیش

کرنا جو عدل، حکمت اور انسانیت کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔

نبی کریم ﷺ کا عملی اسوہ بھی یہی تھا۔ آپ ﷺ نے ظلم برداشت کیا مگر اخلاق نہیں چھوڑا، طاقت ملی تو معافی کو ترجیح دی، اور اختلاف ہوا تو مکالمہ کیا۔ یہی وہ توازن تھا جس نے دلوں کو فتح کیا، نہ کہ تلواروں نے۔

عالمی نظام کے مقابلے میں اگر مسلمانوں نے دین کو حکمت، علم اور اخلاق کے ساتھ پیش کیا ہوتا تو لادینیت کے پھیلاؤ کی رفتار کہیں کم ہوتی۔ مگر جب ردِعمل خود غیر متوازن ہو جائے تو وہ اصلاح کے بجائے مزید بگاڑ پیدا کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں دین سے دوری کا ایک اہم سبب غلط دینی ردِعمل بھی ہے۔ افراط نے دین کو خوفناک بنایا، تفریط نے اسے غیر ضروری، اور دونوں نے مل کر ایک ایسی فضا پیدا کی جس میں اعتدال خاموش ہو گیا۔

(اسلامی عالمی وژن: عدل، توازن، انسانی وقار اور فکری استقامت)

اب تک ہم نے جانا کہ سیاست کا دین سے الگ ہونا، غیر منصفانہ معاشی نظام، عالمی طاقتوں کا تہذیبی دباؤ، اور ان کے جواب میں پیدا ہونے والی افراط و تفریط کس طرح مسلمانوں میں دین سے دوری کا سبب بنتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ:

کیا اسلام کے پاس ان عالمی مسائل کا کوئی مثبت، عملی اور قابلِ فہم متبادل موجود ہے؟

اسلام اس سوال کا جواب نہایت اعتماد اور وضاحت کے ساتھ دیتا ہے:

ہاں — اور یہ متبادل محض نظری نہیں بلکہ تاریخی طور پر آزمودہ بھی ہے۔

اسلامی عالمی وژن کی بنیاد عدل ہے، طاقت نہیں۔ قرآنِ مجید نے عدل کو

ریاست، معیشت اور بین الاقوامی تعلقات — ہر سطح پر لازم قرار دیا ہے:

اللہ تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے۔ اور بےحیائی اور نامعقول کاموں سے اور سرکشی سے منع کرتا ہے (اور) تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔ (سورۃ النحل: آیت 90)

یہ آیت اسلامی نظام کی روح ہے۔ یہاں عدل محض قانون نہیں بلکہ اخلاقی ذمہ داری ہے، اور احسان طاقت کے باوجود رحم کا نام ہے۔

اسلام کا عالمی تصور اس خیال کو رد کرتا ہے کہ دنیا طاقتوروں کا کھیل ہے اور کمزور صرف قربانی ہیں۔ قرآن قوموں کے عروج و زوال کو اخلاقی اصولوں سے جوڑتا ہے، نہ کہ محض فوجی یا معاشی طاقت سے۔ یہ اصول عالمی نظام کے لیے ایک اخلاقی تنبیہ ہے — ظلم وقتی طور پر چل سکتا ہے، مگر دیرپا نہیں۔

اسلامی عالمی وژن کا دوسرا بنیادی ستون انسانی وقار ہے۔ اسلام انسان کی قدر اس کی نسل، قوم یا دولت سے نہیں بلکہ اس کے انسان ہونے سے جوڑتا ہے:

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے آدم کی اولاد کو بہت عزت بخشی (سورۃ الإسراء: آیت 70)

یہ آیت ہر قسم کی نسلی، تہذیبی اور جغرافیائی برتری کو رد کرتی ہے۔ اسلامی تصورِ انسانیت میں نہ کوئی "**تیسری دنیا**" ہے، نہ "**کم تر تہذیب**" — بلکہ سب انسان برابر ہیں۔

یہی تصور عالمی سیاست میں ایک انقلابی تبدیلی لاسکتا ہے، کیونکہ یہاں مفاد کے بجائے وقار کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ اسلام جنگ کو بھی اخلاقی حدود میں رکھتا ہے، اور امن کو

اصل حالت قرار دیتا ہے:

اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تو بھی اس کی طرف مائل ہو جا اور اللہ پر بھروسا کر۔ بے شک وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ (سورۃ الأنفال: آیت 61)

یہ آیت اس تصور کو رد کرتی ہے کہ طاقت ہی واحد زبان ہے جو دنیا سمجھتی ہے۔

اسلامی عالمی وژن کا تیسرا اہم پہلو توازن (Balance) ہے۔ نہ مکمل مادہ پرستی، نہ رہبانیت؛ نہ مطلق آزادی، نہ جبر۔

قرآنِ مجید نے اسی توازن کو امت کی پہچان بنایا:

ہم نے اسی طرح تمہیں عادل امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ (سورۃ البقرہ: آیت 143)

یہ وسطیت فرد، ریاست اور عالمی تعلقات — ہر سطح پر لاگو ہوتی ہے۔

اسلام معیشت میں بھی اسی توازن کا قائل ہے۔ نہ سرمایہ کی مطلق آزادی، نہ ریاستی جبر؛ بلکہ رزق میں گردش، کمزور کا تحفظ، اور دولت کی اخلاقی نگرانی۔ زکوٰۃ، صدقات اور سود کی ممانعت محض مذہبی احکام نہیں بلکہ عالمی معاشی انصاف کے اصول ہیں۔ یہ تصور عالمی مادہ پرستی کے لیے ایک اخلاقی چیلنج ہے۔

اسلامی وژن کا ایک اور اہم پہلو مکالمہ ہے، تصادم نہیں۔ قرآن اختلاف کے باوجود بات کرنے کا حکم دیتا ہے:

آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب! ایسی انصاف والی بات کی طرف آؤ جو ہم میں تم میں برابر ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک

بنائیں، نہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کو ہی رب بنائیں۔ پس اگر وہ منہ پھیر لیں تو تم کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں۔ (سورۃ آل عمران: آیت 64)

یہ آیت تہذیبی مکالمے کی بنیاد ہے— نہ خود سپردگی، نہ تصادم؛ بلکہ دلیل، احترام اور اصول پر بات۔

اب سوال یہ ہے کہ اس عالمی فکری جنگ میں مسلمان فرد کا کردار کیا ہے؟

اسلام مسلمان کو مایوسی یا غصے کے بجائے فکری استقامت سکھاتا ہے۔ نہ اندھی تقلید، نہ اندھا انکار؛ بلکہ شعور، علم اور کردار کے ساتھ جینا۔

قرآنِ مجید فرماتا ہے:

سو (اے پیغمبر) جیسا تم کو حکم ہوتا ہے (اس پر) تم اور جو لوگ تمہارے ساتھ تائب ہوئے ہیں قائم رہو۔ اور حد سے تجاوز نہ کرنا۔ وہ تمہارے سب اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ (سورۃ ہود: آیت 112)

یہ استقامت ہی وہ طاقت ہے جو لادینیت کے سیلاب میں بھی ایمان کو زندہ رکھتی ہے۔

مسلمان اگر دین کو صرف ردِ عمل کے بجائے مثبت متبادل کے طور پر پیش کرے— اپنے اخلاق، عدل، علم اور خدمت سے— تو دنیا کے سامنے ایک مختلف نقشہ ابھر سکتا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جو دین کو بوجھ نہیں بلکہ حل کے طور پر پیش کرتا ہے۔

باب ششم کا مجموعی خلاصہ

باب ششم نے یہ حقیقت واضح کی کہ:

- سیاست، معیشت اور عالمی نظام دین سے دوری پر گہرا اثر ڈالتے ہیں
- عالمی دباؤ اور غلط ردِعمل لادینیت کو بڑھاتے ہیں
- مگر اسلام کے پاس ایک متوازن، عادلانہ اور انسانی عالمی وژن موجود ہے
- اصل ضرورت اس وژن کو سمجھنے، جینے اور پیش کرنے کی ہے

باب 07

ذرائع ابلاغ، ٹیکنالوجی اور ڈیجیٹل دور میں دین سے دوری

(میڈیا کی طاقت، ذہن سازی، اور دین کا پس منظر میں چلے جانا)

ہر دور میں انسان کی فکر سازی کا کوئی نہ کوئی مرکزی ذریعہ رہا ہے۔ کبھی منبر، کبھی مدرسہ، کبھی خاندان اور کبھی کتاب — یہ سب ذہنوں کی تشکیل کرتے رہے ہیں۔ مگر موجودہ دور میں یہ کردار بڑی حد تک میڈیا اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجی نے سنبھال لیا ہے۔ آج انسان جو سوچتا ہے، جسے اہم سمجھتا ہے، جس سے متاثر ہوتا ہے — اس کا بڑا حصہ اسکرین کے ذریعے اس تک پہنچتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں دین سے دوری کو سمجھنے کے لیے میڈیا کے کردار کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔

میڈیا محض معلومات فراہم نہیں کرتا بلکہ ترجیحات طے کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں بتاتا کہ کیا سچ ہے، بلکہ یہ طے کرتا ہے کہ کیا اہم ہے۔ جب دین، عبادت، اخلاق اور آخرت میڈیا کے مرکزی بیانیے سے غائب ہو جائیں تو آہستہ آہستہ انسان کے ذہن میں بھی ان کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ یہ عمل خاموش ہوتا ہے، مگر اس کے اثرات گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں۔

قرآنِ مجید نے انسان کے دل اور کان کو حق قبول کرنے کے بنیادی ذرائع قرار دیا ہے:

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بہت سے جن اور انسان جہنم ہی کے لیے پیدا کیے ہیں، ان کے دل ہیں جن کے ساتھ وہ سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں جن کے ساتھ وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن کے ساتھ وہ سنتے نہیں، یہ لوگ چوپاؤں جیسے ہیں، بلکہ یہ زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں، یہی ہیں جو بالکل بے خبر ہیں۔ (سورۃ الأعراف آیت 179)

یہ آیت اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جب سننے اور سمجھنے کے ذرائع درست سمت میں استعمال نہ ہوں تو انسان حق سے محروم ہو جاتا ہے — خواہ معلومات کی کثرت ہی کیوں نہ ہو۔

جدید میڈیا کا سب سے بڑا اثر یہ ہے کہ اس نے تفریح کو مرکز اور سنجیدگی کو حاشیہ بنا دیا ہے۔ گھنٹوں کی ویڈیوز، مختصر کلپس، مسلسل اسکرولنگ — یہ سب انسان کو سوچنے، رکنے اور غور کرنے کا موقع نہیں دیتے۔ دین، جو تدبر، خاموشی اور اندرونی توجہ کا تقاضا کرتا ہے، اس شور میں دب جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "کسی شخص کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی اور فضول باتوں کو چھوڑ دے"۔ (سنن ترمذی حدیث: 2317)

یہ حدیث توجہ کے صحیح استعمال کا اصول بیان کرتی ہے۔ مگر ڈیجیٹل دور میں انسان کا زیادہ تر وقت انہی چیزوں میں صرف ہو رہا ہے جو نہ اس کے ایمان کو مضبوط کرتی ہیں، نہ اس کے کردار کو۔

میڈیا نے دین کو اکثر دو انتہاؤں میں پیش کیا ہے:

یا تو اسے انتہا پسندی سے جوڑ دیا جاتا ہے، یا پھر اسے محض ایک ذاتی، جذباتی تجربہ بنا کر دکھایا جاتا ہے۔ اس توازن کے فقدان نے عام مسلمان کے ذہن میں دین کی ایک واضح، متوازن تصویر قائم نہیں ہونے دی۔ نتیجتاً دین یا خوف کی علامت بن جاتا ہے یا غیر سنجیدہ چیز۔

قرآنِ مجید نے حق کو واضح، متوازن اور قابلِ فہم انداز میں پیش کرنے پر زور دیا ہے:

اور ہم اسی طرح اپنی آیتیں پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں تاکہ کافر یہ نہ کہیں کہ تم (یہ باتیں اہل کتاب سے) سیکھے ہوئے ہو اور تاکہ سمجھنے والے لوگوں کے لئے تشریح کردیں۔ (سورۃ الأنعام: آیت 105)

لیکن میڈیا کی سطحی اور سنسنی خیز پیشکش اس تفصیل اور توازن کو ختم کر دیتی ہے۔

ڈیجیٹل دور میں کرداروں (Influencers) نے علما، اساتذہ اور بزرگوں کی جگہ لے لی ہے۔ نوجوان انہی کی زبان، لباس، رویہ اور طرزِ زندگی کو معیار ماننے لگتا ہے۔ اگر یہ کردار دین سے بے نیاز ہوں یا دین کو غیر اہم سمجھیں تو یہ پیغام خاموشی سے نسلوں تک منتقل ہو جاتا ہے کہ ''کامیابی کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔''

یہی وہ لمحہ ہے جہاں دین شعوری طور پر رد نہیں ہوتا، بلکہ غیر متعلق بنا دیا جاتا ہے۔

قرآنِ مجید نے اسی رویے کو یوں بیان کیا:

آپ انہیں کھاتا، نفع اٹھاتا اور (جھوٹی) امیدوں میں مشغول ہوتا چھوڑ دیجئے یہ خود ابھی جان لیں گے۔ (سورۃ الحجر: آیت 3)

یہ آیت غفلت کی اس کیفیت کی نشاندہی کرتی ہے جہاں انسان کھانے، مزے اور امیدوں میں ایسا الجھ جاتا ہے کہ اصل مقصد نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

میڈیا کا ایک اور خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس نے علم اور رائے کے فرق کو مٹا دیا ہے۔ ہر شخص بول رہا ہے، مگر یہ واضح نہیں کہ کون علم کی بنیاد پر بات کر رہا ہے اور کون محض جذبات یا مفاد کی بنیاد پر۔ اس شور میں دینی علم بھی ایک ''رائے'' بن کر رہ جاتا ہے، جسے قبول یا رد کرنا محض ذاتی پسند نا پسند کا معاملہ بن جاتا ہے۔

قرآنِ مجید نے علم اور گمان کے فرق کو واضح کیا ہے:

اور اس چیز کا پیچھا نہ کر جس کا تجھے کوئی علم نہیں۔ (سورۃ الإسراء: آیت 36)

یہ آیت ڈیجیٹل دور میں پہلے سے زیادہ اہم ہو چکی ہے، جہاں بغیر علم کے بات پھیلانا معمول بن گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جدید میڈیا اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجی نے دین کو براہِ راست نشانہ بنانے کے بجائے اسے پس منظر میں دھکیل دیا ہے۔ جب انسان کی توجہ، وقت اور جذبات کسی اور سمت میں ہوں تو دین خود بخود کمزور پڑ جاتا ہے—بغیر کسی باضابطہ مخالفت کے۔

(سوشل میڈیا، فوری تسکین، ڈیجیٹل نشہ اور روحانی خلا)

ڈیجیٹل دور کی سب سے نمایاں خصوصیت رفتار ہے۔ معلومات، تفریح، رابطہ—سب کچھ فوری دستیاب ہے۔ انسان اب انتظار کا عادی نہیں رہا۔ ایک کلک، ایک اسکرول، ایک نوٹیفکیشن—اور ذہن کو تسکین مل جاتی ہے۔ یہی فوری تسکین (Instant Gratification) آج کے انسان کی نفسیات کو تشکیل دے رہی ہے، اور یہی نفسیات دین سے دوری کا ایک بڑا سبب بن رہی ہے۔

اسلام جس شخصیت کی تربیت کرتا ہے وہ صبر، ضبط اور تدریج کی حامل ہوتی ہے۔ عبادت میں تسلسل، علم میں گہرائی، اور اخلاق میں استقامت—یہ سب وقت مانگتے ہیں۔ مگر سوشل میڈیا نے انسان کو اس کے برعکس سکھایا ہے:

کم وقت، زیادہ مزہ، کم محنت، فوری نتیجہ۔

قرآنِ مجید نے انسانی نفس کی اسی کمزوری کی طرف اشارہ کیا ہے:

اور انسان ہمیشہ سے بہت جلد باز ہے۔ (سورۃ الإسراء: آیت 11)

ڈیجیٹل دنیا نے اس جلد بازی کو فطرت کے بجائے طرزِ زندگی بنا دیا ہے۔

سوشل میڈیا پلیٹ فارمز انسان کی توجہ کو زیادہ سے زیادہ قید رکھنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ لائکس، ویوز، کمنٹس — یہ سب دماغ میں وقتی خوشی کے کیمیکل پیدا کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ انسان اس خوشی کا عادی ہو جاتا ہے، اور یہی عادت ڈیجیٹل نشے میں بدل جاتی ہے۔ اس نشے میں انسان خاموشی، تنہائی اور غور و فکر سے گھبرانے لگتا ہے — حالانکہ یہی وہ کیفیات ہیں جہاں ایمان گہرا ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''دو نعمتیں ایسی ہیں کہ اکثر لوگ ان کی قدر نہیں کرتے، صحت اور فراغت۔'' (صحیح بخاری حدیث نمبر 6412)

ڈیجیٹل دور میں فرصت موجود ہے، مگر وہ اسکرین میں ضائع ہو رہی ہے، عبادت اور خود احتسابی میں نہیں۔

عبادت — خصوصاً نماز، تلاوت اور دعا — دل کی توجہ مانگتی ہے۔ مگر جب ذہن مسلسل بکھرا ہوا ہو، جب ہر چند منٹ بعد اسکرین پکار رہی ہو، تو یکسوئی ممکن نہیں رہتی۔ یوں عبادت بوجھ محسوس ہونے لگتی ہے، اور آہستہ آہستہ ترک ہونے لگتی ہے — بغیر کسی انکار کے۔

قرآنِ مجید نے خشوع کو ایمان کی علامت قرار دیا ہے:

یقیناً کامیاب ہو گئے مومن۔ وہی جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں۔ اور وہی جو لغو کاموں سے منہ موڑنے والے ہیں۔ (سورۃ المؤمنون: آیات 3–1)

مگر ڈیجیٹل شور نے خشوع کو نایاب بنا دیا ہے، اور بغیر خشوع کے عبادت محض ایک رسمی عمل بن جاتی ہے۔

سوشل میڈیا کا ایک اور اثر یہ ہے کہ اس نے موازنہ (Comparison) کو عام کر دیا ہے۔ لوگ دوسروں کی چمکتی ہوئی زندگیاں دیکھ کر اپنے حالات کو کمتر سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ احساسِ محرومی شکر، قناعت اور رضا جیسے دینی اوصاف کو کمزور کر دیتا ہے۔ انسان یہ بھول جاتا ہے کہ سوشل میڈیا پر نظر آنے والی زندگی اکثر حقیقت نہیں بلکہ منتخب لمحے ہوتے ہیں۔

قرآنِ مجید نے اسی نفسیاتی بیماری کا علاج سکھایا ہے:

اور کئی طرح کے لوگوں کو جو ہم نے دنیا کی زندگی میں آرائش کی چیزوں سے بہرہ مند کیا ہے تا کہ ان کی آزمائش کریں ان پر نگاہ نہ کرنا۔ (سورۃ طٰہٰ: آیت 131)

یہ آیت آج کے ڈیجیٹل ماحول میں پہلے سے کہیں زیادہ معنی خیز ہوگئی ہے۔

ڈیجیٹل دنیا میں آن لائن شخصیت اور حقیقی شخصیت کے درمیان ایک خلیج پیدا ہو چکی ہے۔ لوگ آن لائن کچھ اور دکھائی دیتے ہیں، آف لائن کچھ اور ہوتے ہیں۔ اس دوہرے پن سے انسان کے اندر سچائی، اخلاص اور خود احتسابی کمزور پڑنے لگتی ہے—اور یہی اوصاف ایمان کی بنیاد ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن سب سے پہلے (تین قسم کے) افراد کا فیصلہ کیا جائے گا: (۱) جس آدمی کو شہید کیا گیا، اسے لایا جائے گا، اللہ تعالی اسے اپنی نعمتوں کا تعارف کرائے گا، وہ پہچان لے گا۔ پھر اللہ تعالی پوچھے گا: تو کیا عمل کر کے لایا ہے؟ وہ کہے گا: میں نے تیرے راستے میں جہاد کیا، حتی کے شہید ہوگیا۔ اللہ تعالی فرمائے گا: تو جھوٹ بول رہا ہے، تو نے اس لئے جہاد کیا تھا تا کہ تجھے بہادر کہا جائے اور ایسے (دنیا میں) کہا جا چکا ہے۔ پھر اس کے بارے میں حکم دیا جائے گا اور اسے چہرے کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ (۲) علم سیکھنے سکھانے اور قرآن مجید پڑھنے والا آدمی، اسے لایا جائے گا،

اللہ تعالی اسے اپنی نعمتوں کا تعارف کرائے گا، وہ اقرار کرے گا۔ اللہ تعالی فرمائے گا: تو کون سا عمل کر کے لایا ہے؟ وہ کہے گا: میں تیری خاطر علم سیکھا سکھایا اور قرآن مجید پڑھا۔ اللہ تعالی فرمائے گا: تو جھوٹ بول رہا ہے، حصول علم سے تیرا مقصد یہ تھا کہ تجھے عالم کہا جائے اور قرآن اس لیے پڑھا کہ قاری کہا جائے، سو ایسے تو کہا جا چکا ہے۔ پھر اس کے بارے میں حکم دیا جائے گا کہ اسے چہرے کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ (۳) وہ آدمی جسے اللہ تعالی نے خوشحال اور مالدار بنایا اور اسے مال کی تمام اقسام عطا کیں، اسے لایا جائے گا، اللہ تعالی اسے اپنی نعمتوں کا تعارف کروائے گا، وہ پہچان لے گا۔ پھر اللہ تعالی فرمائے گا: تو کون سا عمل کر کے لایا ہے؟ وہ کہے گا: جن مصارف میں خرچ کرنا تجھے پسند تھا، میں نے ان تمام مصارف میں تیرے لیے خرچ کیا۔ اللہ تعالی فرمائے گا: تو جھوٹ بول رہا ہے، تیرا خرچ کرنے کا مقصد یہ تھا کہ تجھے سخی کہا جائے اور وہ تو کہہ دیا گیا ہے۔ پھر اس کے بارے میں حکم ہو گا، جس کے مطابق اسے چہرے کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔''
(سلسلہ احادیث صحیحہ حدیث: 147)

یہ حدیث ظاہر اور باطن کے تضاد کو رد کرتی ہے۔ مگر ڈیجیٹل دور میں یہ تضاد معمول بن چکا ہے۔

سوشل میڈیا نے دین کو بھی مواد (Content) بنا دیا ہے — مختصر کلپس، جذباتی جملے، اور فوری اثر۔ اگرچہ اس میں خیر کا پہلو بھی ہے، مگر خطرہ یہ ہے کہ دین گہرائی کے بجائے محض احساس بن کر رہ جائے۔ علم، تدبر اور فہم کے بغیر جذبات دیرپا نہیں ہوتے، اور یوں دین وقتی جوش کے بعد دوبارہ پس منظر میں چلا جاتا ہے۔

قرآنِ مجید نے دین کو سمجھنے پر زور دیا ہے، نہ کہ محض سننے پر:

بھلا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا (ان کے) دلوں پر قفل لگ رہے ہیں۔

(سورۃ محمد: آیت 24)

تدبر وقت، سکون اور توجہ مانگتا ہے — جو ڈیجیٹل عجلت میں ناپید ہو چکے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ سوشل میڈیا اور فوری تسکین کی ثقافت نے انسان کی توجہ، صبر اور یکسوئی کو کمزور کر دیا ہے۔ جب یہ اوصاف کمزور پڑ جائیں تو عبادت، علم اور روحانی گہرائی بھی متاثر ہوتی ہے۔ یوں دین رد نہیں ہوتا، مگر آہستہ آہستہ غیر متعلق ہو جاتا ہے۔

(آن لائن دینی مواد: فوائد، نقصانات، جعلی علم اور فکری انتشار)

ڈیجیٹل دور نے دین کی ترسیل کے دروازے وسیع کر دیے ہیں۔ آج قرآن کی تلاوت، حدیث کی شرح، فقہی مسائل اور دینی لیکچرز چند لمحوں میں دنیا کے کسی بھی کونے تک پہنچ سکتے ہیں۔ یہ سہولت بلاشبہ ایک نعمت ہے، اور اگر درست طور پر استعمال ہو تو یہ دین سے قربت کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے۔ مگر مسئلہ وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں رفتار نے معیار کو، اور مقبولیت نے صداقت کو پیچھے چھوڑ دیا۔

اسلام میں علم ہمیشہ ذمہ داری کے ساتھ منتقل ہوا ہے۔ قرآنِ مجید نے علم کو امانت قرار دیا ہے، اور اس کی بنیاد تحقیق، فہم اور دیانت پر رکھی ہے:

پس اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے دریافت کر لو۔ (سورۃ النحل: آیت 43)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ علم ہر ایک سے نہیں بلکہ اہلِ علم سے لیا جاتا ہے۔ مگر ڈیجیٹل دور میں یہ اصول کمزور پڑ گیا ہے۔

سوشل میڈیا نے ہر بولنے والے کو **"عالم"** اور ہر مقبول شخص کو **"مفتی"** بنا دیا ہے۔ چند آیات، چند احادیث اور جذباتی انداز — یہ سب مل کر ایک ایسی فضا پیدا کرتے ہیں جہاں علم اور رائے کے درمیان فرق ختم ہو جاتا ہے۔ عام مسلمان کے لیے یہ طے کرنا مشکل

ہو جاتا ہے کہ کون بات علم پر کر رہا ہے اور کون محض ذاتی تاثر یا مفاد پر۔

نبی کریم ﷺ نے اسی فتنہ کی پیش گوئی فرمائی تھی: ''اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں سے چھینتے ہوئے نہیں اٹھائے گا بلکہ وہ علماء کو اٹھا کر علم کو اٹھالے گا حتی کہ جب وہ (لوگوں میں) کسی عالم کو (باقی) نہیں چھوڑے گا تو لوگ (دین کے معاملات میں بھی) جاہلوں کو اپنے سربراہ بنالیں گے۔ان سے (دین کے بارے میں) سوال کیے جائیں گے تو وہ علم کے بغیر فتوے دیں گے، اس طرح خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔'' (صحیح مسلم حدیث:6796)

ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر دینی مواد اکثر الگورتھم کے تابع ہوتا ہے، نہ کہ علمی معیار کے۔ جو بات زیادہ چونکا دے، زیادہ جذبات ابھارے، یا زیادہ تنازع پیدا کرے—وہ زیادہ پھیلتی ہے۔اس ماحول میں سنجیدہ، متوازن اور تحقیقی دینی گفتگو پیچھے رہ جاتی ہے، اور سطحی یا انتہا پسند مواد آگے آجاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ دین کو یا تو انتہا پسندانہ سختی کے ساتھ جانتے ہیں، یا پھر بے حد نرم اور غیر سنجیدہ شکل میں۔ دونوں صورتوں میں اصل اسلامی توازن غائب ہو جاتا ہے۔نتیجتاً عام فرد کنفیوژن کا شکار ہو کر دین سے فاصلہ اختیار کر لیتا ہے۔

قرآنِ مجید نے دین میں توازن اور وضاحت پر زور دیا ہے:

عقل والوں کے لئے ہم نے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں۔ (سورۃ الأنعام: آیت 97)

یہ تفصیل علم، وقت اور سنجیدگی مانگتی ہے—جو مختصر ویڈیوز اور فوری پوسٹس میں ممکن نہیں۔

ایک اور بڑا مسئلہ سیاق و سباق کے بغیر علم کا پھیلاؤ ہے۔ آیات اور احادیث کو مکمل پس منظر کے بغیر پیش کیا جاتا ہے، جس سے غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں۔ کبھی سختی کا حکم نرمی کے موقع پر پیش کیا جاتا ہے، اور کبھی رعایت کو اصول بنا دیا جاتا ہے۔ اس بے ربطی سے دین ایک متضاد نظام محسوس ہونے لگتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے:

''تم ایک ایسی قوم میں ہو جہاں علما زیادہ اور خطیب کم ہیں، مگر ایک ایسا زمانہ آئے گا جہاں خطیب زیادہ اور علما کم ہوں گے۔''

یہ قول ڈیجیٹل دور پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

ڈیجیٹل دنیا نے دین کو مناظرے، **کلپس** اور ٹرینڈز تک محدود کر دیا ہے۔ دین سیکھنے کے بجائے ''**بحث جیتنے**'' کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس ماحول میں اخلاص، ادبِ اختلاف اور علم کی روح مجروح ہوتی ہے، اور عام فرد اس شور سے تنگ آ کر دین کو ہی چھوڑ دیتا ہے۔

قرآنِ مجید نے اختلاف کے باوجود اخلاق برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے:

اور اللہ کی اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرتے رہو، آپس میں اختلاف نہ کرو ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر و سہارا رکھو، یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (سورۃ الأنفال: آیت 46)

مگر ڈیجیٹل اختلاف اکثر فساد، تضحیک اور نفرت میں بدل جاتا ہے — جو ایمان کے لیے زہرِ قاتل ہے۔

ایک اور خطرناک پہلو یہ ہے کہ آن لائن دینی مواد نے استاد اور شاگرد کے رشتے

کو کمزور کر دیا ہے۔ علم اب صحبت، تربیت اور کردار کے ذریعے منتقل نہیں ہو رہا بلکہ محض اسکرین کے ذریعے۔ نتیجتاً علم تو ملتا ہے، مگر حکمت، حلم اور اخلاق نہیں۔

نبی کریم ﷺ کا اسوہ یہی تھا کہ آپ ﷺ صرف بات نہیں سکھاتے تھے بلکہ بن کر دکھاتے تھے۔

قرآن خود کہتا ہے:

یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے، ہر اس شخص کے لئے جو اللہ تعالیٰ کی اور قیامت کے دن کی توقع رکھتا ہے اور بکثرت اللہ تعالیٰ کی یاد کرتا ہے۔ (سورۃ الأحزاب: آیت 21)

یہ اسوہ محض ویڈیو سے منتقل نہیں ہوسکتا، اس کے لیے تعلق، صحبت اور عمل ضروری ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ڈیجیٹل دور میں دینی مواد کی کثرت کے باوجود دینی فہم کی قلت پیدا ہوگئی ہے۔ جعلی علم، خودساختہ رہنماؤں اور الگورتھم پر مبنی مقبولیت نے دین کو واضح راستے کے بجائے ایک الجھا ہوا منظرنامہ بنا دیا ہے۔ اس الجھن کا فطری نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ عام انسان دین سے فاصلے پر چلا جاتا ہے۔

(ڈیجیٹل دور میں دین سے جڑنے کے امکانات، میڈیا کا مثبت استعمال اور متوازن دینی رہنمائی)

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ ٹیکنالوجی بذاتِ خود نہ خیر ہے نہ شر — بلکہ یہ ایک آلہ (Tool) ہے۔ اس کا فائدہ یا نقصان اس بات پر منحصر ہے کہ اسے کس مقصد، کس نیت اور کس حکمت کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر میڈیا اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز نے دین کو

پس منظر میں دھکیلا ہے، تو یہی پلیٹ فارمز دین کو نئے دلوں تک پہنچانے کا ذریعہ بھی بن سکتے ہیں — بشرطیکہ ان کا استعمال شعور، توازن اور دینی بصیرت کے ساتھ ہو۔

قرآنِ مجید نے انسان کو وسائل کو خیر کے لیے استعمال کرنے کی ترغیب دی ہے:

اور جو کچھ اللہ نے تجھے دیا ہے اس میں آخرت کا گھر تلاش کر (سورۃ القصص: آیت 77)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ جو کچھ اللہ نے دیا ہے — چاہے وہ علم ہو، طاقت ہو یا ٹیکنالوجی — اسے آخرت کی بھلائی کے لیے استعمال کرنا ہی اصل کامیابی ہے۔

ڈیجیٹل میڈیا کا سب سے بڑا مثبت پہلو رسائی (Accessibility) ہے۔ آج وہ افراد بھی دینی علم تک پہنچ سکتے ہیں جو دور دراز علاقوں میں رہتے ہیں، یا جن کے پاس باقاعدہ اداروں تک رسائی نہیں۔ قرآن، حدیث، سیرت اور فقہ کے مستند ذخائر اب ایک کلک کی دوری پر ہیں۔ اگر یہ مواد مستند اور ذمہ دارانہ انداز میں پیش کیا جائے تو یہ دین سے دوری کے بجائے قربت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میرا پیغام لوگوں کو پہنچاؤ! اگرچہ ایک ہی آیت ہو اور بنی اسرائیل کے واقعات تم بیان کر سکتے ہو، ان میں کوئی حرج نہیں اور جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ باندھا تو اسے اپنے جہنم کے ٹھکانے کے لیے تیار رہنا چاہئے۔'' (صحیح البخاری حدیث: 3461)

یہ حدیث دین کی ترسیل کی ترغیب دیتی ہے، مگر ساتھ ہی یہ ذمہ داری بھی عائد کرتی ہے کہ بات درست، واضح اور حکمت کے ساتھ پہنچائی جائے۔

ڈیجیٹل دور میں دین کی پیشکش کے لیے لہجے اور اسلوب کی اہمیت پہلے سے کہیں

زیادہ بڑھ گئی ہے۔ سخت، تحقیر آمیز یا خوف پر مبنی انداز نوجوان نسل کو مزید دور دھکیل دیتا ہے۔ اس کے برعکس، قرآن حکمت، نرمی اور تدریج کا راستہ سکھاتا ہے:

(اے محمد ﷺ) اللہ کی مہربانی سے تمہاری افتادِ مزاج ان لوگوں کے لئے نرم واقع ہوئی ہے۔ اور اگر تم بدخو اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ (سورۃ آل عمران: آیت 159)

یہ نرمی ہی تھی جس نے دلوں کو جوڑا — اور یہی نرمی ڈیجیٹل دعوت میں بھی درکار ہے۔

میڈیا کا مثبت استعمال تب ممکن ہے جب مقصد شہرت نہیں بلکہ اصلاح ہو۔ اگر دینی مواد کا ہدف لائکس ویوز اور فالوورز بن جائیں تو پیغام کمزور ہو جاتا ہے۔ مگر اگر نیت رہنمائی، خدمت اور خیر خواہی ہو تو کم وسائل میں بھی گہرا اثر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اخلاص ہی وہ عنصر ہے جو ڈیجیٹل شور میں بھی سچائی کو نمایاں کرتا ہے۔

قرآنِ مجید فرماتا ہے:

آپ کہہ دیجئے میری راہ یہی ہے۔ میں اور میرے متبعین اللہ کی طرف بلا رہے ہیں، پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ۔ اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکوں میں نہیں۔ (سورۃ یوسف: آیت 108)

یہ بصیرت ہی ہے جو دعوت کو جذباتی نعرے کے بجائے فکری رہنمائی بناتی ہے۔

ڈیجیٹل دور میں دینی رہنمائی کے لیے ایک اور بنیادی اصول مستندیت (Authenticity) ہے۔ آن لائن مواد کو علما، اداروں اور معتبر علمی روایت سے جوڑنا ضروری ہے۔ جب نوجوان یہ دیکھتے ہیں کہ دین سنجیدگی، تحقیق اور علمی دیانت کے ساتھ پیش

ہو رہا ہے تو ان کا اعتماد بحال ہوتا ہے، اور دین ان کے لیے ایک معتبر رہنمائی بن جاتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ڈیجیٹل آداب کی تعلیم بھی ناگزیر ہے۔ اختلاف ہو تو ادب کے ساتھ، سوال ہو تو سیکھنے کی نیت سے، اور تنقید ہو تو اصلاح کے جذبے سے۔

قرآنِ مجید کا حکم ہے:

اور لوگوں سے اچھی بات کہو (سورۃ البقرہ: آیت 83)

یہ اصول آن لائن دنیا میں پہلے سے کہیں زیادہ اہم ہو چکا ہے۔

ایک مثبت امکان یہ بھی ہے کہ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز روحانی تربیت کے معاون بن سکتے ہیں—اگرچہ متبادل نہیں۔ تذکیر، محاسبہ، اور اخلاقی یاد دہانیاں انسان کو جھنجھوڑ سکتی ہیں، مگر اصل تربیت پھر بھی عملی زندگی، صحبتِ صالحین اور عبادت کے تسلسل سے ہی مکمل ہوتی ہے۔ ڈیجیٹل دین اگر اس حقیقت کو تسلیم کرے تو وہ فائدہ مند بن سکتا ہے، ورنہ گمراہ کن۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، لہٰذا تم میں سے ہر شخص کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے''۔ (سنن ابی داود حدیث: 4833)

یہ حدیث یاد دلاتی ہے کہ تعلق، صحبت اور ماحول ایمان پر گہرا اثر رکھتے ہیں—اور ڈیجیٹل تعلقات کو اس حقیقت کے متبادل کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ڈیجیٹل دور دین کے لیے صرف خطرہ نہیں بلکہ موقع بھی ہے۔ اگر میڈیا کو حکمت، اخلاص، علم اور توازن کے ساتھ استعمال کیا جائے تو یہ دین کو نئی نسل کے دلوں تک پہنچا سکتا ہے۔ اصل چیلنج ٹیکنالوجی نہیں بلکہ اس کے استعمال کا شعور ہے۔

(ڈیجیٹل دور میں فردِ مسلم کی ذمہ داریاں، توازن کا قیام اور ایمان کا تحفظ)

ڈیجیٹل دور میں سب سے بنیادی سوال یہ نہیں کہ ٹیکنالوجی موجود ہے یا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ انسان اس کے سامنے کس شعور کے ساتھ کھڑا ہے۔ ٹیکنالوجی انسان کو سہولت بھی دیتی ہے اور غفلت بھی۔ یہ انسان کو علم تک بھی لے جاتی ہے اور فتنہ تک بھی۔ اس دورُخی حقیقت میں ایک مسلمان فرد کے لیے سب سے اہم چیز خود آگاہی (Self-awareness) ہے۔

اسلام انسان کو سب سے پہلے اپنے نفس کو پہچاننے کی دعوت دیتا ہے۔

قرآنِ مجید فرماتا ہے:

بلکہ انسان آپ اپنا گواہ ہے۔ (سورۃ القیامہ: آیت 14)

ڈیجیٹل دور میں یہی بصیرت کمزور پڑ جاتی ہے، کیونکہ انسان مسلسل دوسروں کی زندگیاں دیکھ رہا ہوتا ہے، مگر اپنے باطن سے غافل ہو جاتا ہے۔

فردِ مسلم کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی توجہ کا محافظ بنے۔ ہر چیز جو اسکرین پر نظر آتی ہے، دیکھنے کے لائق نہیں؛ اور ہر آواز جو سنائی دیتی ہے، سننے کے قابل نہیں۔

قرآنِ مجید نے نگاہ اور سماعت کو جواب دہ قرار دیا ہے:

جس بات کی تجھے خبر ہی نہ ہو اس کے پیچھے مت پڑ۔ کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک سے پوچھ گچھ کی جانے والی ہے۔ (سورۃ الإسراء: آیت 36)

یہ آیت ڈیجیٹل اخلاقیات کی بنیاد فراہم کرتی ہے — کہ انسان اپنی آنکھ، کان اور دل کے استعمال کا جواب دہ ہے۔

دوسری بڑی ذمہ داری وقت کا نظم (Time Discipline) ہے۔ ڈیجیٹل دور میں وقت سب سے سستا اور سب سے زیادہ ضائع ہونے والا سرمایہ بن چکا ہے۔ اسکرولنگ، غیر ضروری ویڈیوز اور لاحاصل بحثیں انسان کے دن کو نگل جاتی ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ’’آدمی کا پاؤں قیامت کے دن اس کے رب کے پاس سے نہیں ہٹے گا یہاں تک کہ اس سے پانچ چیزوں کے بارے پوچھ لیا جائے: اس کی عمر کے بارے میں کہ اسے کہاں صرف کیا، اس کی جوانی کے بارے میں کہ اسے کہاں کھپایا، اس کے مال کے بارے میں کہ اسے کہاں سے کمایا اور کس چیز میں خرچ کیا اور اس کے علم کے سلسلے میں کہ اس پر کہاں تک عمل کیا‘‘ (سنن ترمذی حدیث: 2416)

یہ حدیث یاد دلاتی ہے کہ وقت محض دنیاوی اثاثہ نہیں بلکہ آخرت کا سوال ہے۔

ڈیجیٹل توازن کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ آن لائن زندگی کو آف لائن ایمان کا متبادل نہ بنایا جائے۔ دین صرف دیکھنے، سننے یا شیئر کرنے کا نام نہیں بلکہ جینے کا نام ہے۔ نماز، ذکر، خدمت، اخلاق — یہ سب اسکرین سے باہر انجام پاتے ہیں۔ اگر آن لائن دین ہمیں آف لائن عبادت سے دور کر دے تو یہ دین نہیں بلکہ فریب بن جاتا ہے۔

قرآنِ مجید نے عمل کو ایمان کا لازمی جزو قرار دیا ہے:

مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق (بات) کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔ (سورۃ العصر: آیت 3)

یہ ترتیب واضح کرتی ہے کہ ایمان عمل کے بغیر نامکمل ہے۔

فردِ مسلم کی ایک اور ذمہ داری ڈیجیٹل اخلاق ہے۔ اختلاف ہو تو تہذیب کے ساتھ، سوال ہو تو سیکھنے کے جذبے سے، اور خامی نظر آئے تو اصلاح کے ارادے سے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اسے چاہیئے کہ اچھی بات زبان سے نکالے ورنہ چپ رہے۔'' (صحیح البخاری حدیث:6138)

یہ اصول سوشل میڈیا پر پہلے سے کہیں زیادہ لاگو ہوتا ہے۔

ڈیجیٹل دنیا میں ایمان کے تحفظ کے لیے مستند دینی تعلق ناگزیر ہے۔ آن لائن مواد معاون ہوسکتا ہے، مگر اصل رہنمائی اہلِ علم، قابلِ اعتماد اساتذہ اور دینی صحبت سے ہی ملتی ہے۔ بغیر رہنمائی کے ڈیجیٹل دین انسان کو الجھن، سختی یا بے معنویت کی طرف لے جا سکتا ہے۔

اسی لیے قرآن کہتا ہے:

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔ (سورۃ التوبہ: آیت 119)

یہ ساتھ جسمانی بھی ہے اور فکری بھی۔

ڈیجیٹل دور میں ایک مسلمان کے لیے سب سے اہم چیز توازن (Balance) ہے۔ نہ مکمل کنارہ کشی، نہ اندھی وابستگی۔ ٹیکنالوجی کو استعمال کرنا، مگر اس کا غلام نہ بننا۔

یہی وہ حکمت ہے جو رسول اللہ ﷺ کی سیرت سے جھلکتی ہے— آپ ﷺ دنیا میں رہے، مگر دنیا کو دل میں جگہ نہ دی۔

آخر میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ڈیجیٹل دور میں دین سے دوری کوئی اچانک واقعہ نہیں بلکہ توجہ، وقت اور ترجیح کے مسلسل غلط استعمال کا نتیجہ ہے۔ اور اسی طرح دین سے قربت بھی کسی ایک ویڈیو یا پوسٹ سے نہیں بلکہ شعوری فیصلوں، عملی نظم اور مسلسل

خود احتسابی سے پیدا ہوتی ہے۔

باب ہفتم کا مجموعی خلاصہ

باب ہفتم نے یہ واضح کیا کہ:

- میڈیا اور ٹیکنالوجی نے دین کو پس منظر میں دھکیلنے میں کردار ادا کیا
- سوشل میڈیا، فوری تسکین اور جعلی علم نے فکری انتشار پیدا کیا
- مگر یہی ڈیجیٹل دنیا دین کے لیے موقع بھی ہے
- اصل مسئلہ ٹیکنالوجی نہیں بلکہ شعور، نیت اور توازن کا ہے

باب 08

تعلیمی نظام، نصاب اور فکری تربیت میں دین کی کمزوری

(تعلیم کی اہمیت، اسلامی تصورِ علم، اور جدید تعلیمی نظام کا فکری اثر)

تعلیم کسی بھی معاشرے کی فکری بنیاد ہوتی ہے۔ یہی تعلیم طے کرتی ہے کہ ایک نسل دنیا کو کیسے دیکھے گی، زندگی کا مقصد کیا سمجھے گی، اور حق و باطل میں فرق کس پیمانے پر کرے گی۔ مسلمانوں میں دین سے دوری کو اگر جڑ سے سمجھنا ہو تو سب سے پہلے تعلیمی نظام کا جائزہ لینا ناگزیر ہے، کیونکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں ذہن بنتے ہیں، سوالات جنم لیتے ہیں، اور اقدار خاموشی سے منتقل ہوتی ہیں۔

اسلام میں علم محض معلومات کا نام نہیں بلکہ ہدایت کا ذریعہ ہے۔ قرآنِ مجید کی پہلی وحی ہی علم سے متعلق ہے:

اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا۔ (سورۃ العلق: آیت 1)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ علم کا آغاز ہی اللہ کے نام سے ہونا چاہیے۔ یعنی علم، اگر رب سے کٹا ہوا ہو، تو وہ ہدایت کے بجائے گمراہی کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔

اسلامی تصورِ علم میں علم اور ایمان الگ نہیں۔ علم انسان کو عاجزی سکھاتا ہے، غرور نہیں؛ شعور دیتا ہے، بغاوت نہیں۔

قرآنِ مجید فرماتا ہے:

اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں (سورۃ فاطر: آیت 28)

یعنی اصل علم وہ ہے جو اللہ کا خوف اور ذمہ داری پیدا کرے۔

لیکن جب ہم جدید مسلم معاشروں کے تعلیمی نظام کو دیکھتے ہیں تو ایک گہرا تضاد سامنے آتا ہے۔ اسکول، کالج اور جامعات میں جو تعلیم دی جا رہی ہے، وہ اکثر مقصدِ حیات، اخلاقی ذمہ داری اور آخرت سے کٹی ہوئی ہوتی ہے۔ تعلیم کا ہدف اچھا انسان بنانا نہیں بلکہ **"کامیاب پیشہ ور"** (Successful Professional) بنانا قرار پاتا ہے۔

یہاں سے دین سے دوری کا پہلا خاموش قدم اٹھتا ہے۔ طالب علم برسوں تعلیم حاصل کرتا ہے، مگر اسے یہ نہیں سکھایا جاتا کہ:

- علم کیوں حاصل کرنا ہے؟
- اس علم کا اخلاقی استعمال کیا ہے؟
- انسان کی کامیابی کا آخری معیار کیا ہے؟

قرآنِ مجید نے ایسے علم کو بے فائدہ قرار دیا ہے جو انسان کو مقصد نہ دے:

یہ تو دنیا کی ظاہری زندگی کو جانتے ہیں۔ اور آخرت (کی طرف) سے غافل ہیں۔ (سورۃ الروم: آیت 7)

یہ آیت جدید تعلیمی ذہنیت کی بہترین عکاسی کرتی ہے — دنیا کا علم تو ہے، مگر آخرت کی فکر غائب ہے۔

جدید تعلیمی نصاب میں سیکولر تصورِ علم غالب ہے، جس کے مطابق مذہب کو ذاتی معاملہ سمجھا جاتا ہے، اور تعلیم کو **"غیر جانبدار"** بنانے کے نام پر اللہ، وحی اور اخلاقی مطلقات کو نصاب سے نکال دیا جاتا ہے۔ نتیجتاً طالب علم یہ سیکھتا ہے کہ:

- سائنس میں خدا کی ضرورت نہیں
- تاریخ طاقت کا کھیل ہے
- کامیابی کا معیار مفاد ہے
- اخلاق نسبتی (Relative) ہے

یہ سب باتیں براہِ راست دین کے خلاف نہیں ہوتیں، مگر دین کو غیر ضروری بنا دیتی ہیں۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا کرتے تھے ''اے اللہ! میں اس علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو مفید اور نفع بخش نہ ہو، اس دل سے جس میں (اللہ کا) ڈر نہ ہو، اس نفس سے جو سیر نہ ہو اور اس دعا سے جو قبول نہ ہو''۔ (سنن نسائی حدیث:5539)

یہ دعا ہمیں بتاتی ہے کہ ہر علم خیر نہیں، بلکہ وہی علم خیر ہے جو انسان کو بہتر بنائے۔

تعلیمی نظام کا ایک اور سنگین مسئلہ کردار سازی (Character Building) کی کمی ہے۔ امتحانات، گریڈز اور ڈگریاں تو اہم ہیں، مگر سچائی، دیانت، ذمہ داری اور امانت — یہ سب ثانوی بن جاتے ہیں۔ جب اخلاق نصاب سے نکل جائیں تو دین خود بخود کمزور ہو جاتا ہے، کیونکہ دین کا بڑا حصہ اخلاق پر قائم ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''مجھے تو صرف اس (مقصد) کے لیے مبعوث کیا گیا کہ اخلاقی اقدار کی تکمیل کر سکوں۔'' (سلسلہ احادیث صحیحہ حدیث:2399)

جب تعلیم اخلاق سے خالی ہو جائے تو وہ نبوی مشن سے کٹ جاتی ہے۔

ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ جدید تعلیمی اداروں میں دینی سوالات کو غیر علمی سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی طالب علم خدا، مقصدِ حیات یا اخلاقی اقدار پر سوال اٹھائے تو اسے فلسفیانہ یا ذاتی مسئلہ قرار دے کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس سے طالب علم یہ سیکھتا ہے کہ دین سنجیدہ علمی مکالمے کا حصہ نہیں۔

یہی سوچ آگے چل کر دین کو **"کم علمی"** یا **"پرانا تصور"** بنا دیتی ہے — حالانکہ اسلام نے علم اور عقل کو ہمیشہ عزت دی ہے۔

قرآنِ مجید بار بار سوال کرتا ہے:

﴿أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾، ﴿أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ﴾ ﴿يَتَدَبَّرُونَ﴾

یہ سوالات اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام اندھی تقلید نہیں بلکہ شعوری ایمان چاہتا ہے۔

(نوآبادیاتی تعلیمی نظام، میکالے ازم اور مسلم ذہن کی فکری غلامی)

مسلم معاشروں میں موجود جدید تعلیمی نظام محض ایک غیر جانبدار علمی ڈھانچہ نہیں بلکہ ایک تاریخی منصوبہ ہے، جس کی جڑیں نوآبادیاتی دور میں پیوست ہیں۔ اس نظام کا مقصد صرف علم کی ترسیل نہیں تھا بلکہ ذہنوں کی تشکیل اور تہذیبی ترجیحات کی تبدیلی بھی تھی۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں دین سے دوری محض اتفاق نہیں بلکہ ایک منظّم عمل کی صورت میں سامنے آتی ہے۔

جب یورپی طاقتیں مسلم دنیا پر سیاسی اور عسکری طور پر غالب آئیں تو انہیں جلد احساس ہو گیا کہ صرف زمین پر قبضہ کافی نہیں، بلکہ اگر اقتدار کو دیرپا بنانا ہے تو فکر پر قبضہ

ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کو سب سے مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ ہندوستان میں برطانوی راج اس کی واضح مثال ہے، جہاں تعلیمی اصلاحات کے نام پر ایک ایسا نظام متعارف کرایا گیا جو مقامی دینی اور تہذیبی شناخت سے کٹا ہوا تھا۔

لارڈ میکالے کی مشہور تعلیمی رپورٹ (1835) اسی ذہنیت کی نمائندہ تھی۔ اس رپورٹ کا مقصد ایسے افراد تیار کرنا تھا جو رنگ و نسل میں مقامی ہوں مگر سوچ، فکر اور اقدار میں مغربی ہوں۔ یوں ایک ایسی طبقاتی ذہنیت پیدا کی گئی جو نہ مکمل طور پر مغربی تھی، نہ اپنی تہذیب سے جڑی ہوئی—اور یہی فکری خلا آگے چل کر دین سے دوری کی صورت میں ظاہر ہوا۔

یہ نظام بظاہر علم، ترقی اور جدیدیت کا پیغام لے کر آیا، مگر اس کے باطن میں دین اور علم کے درمیان مصنوعی دیوار کھڑی کر دی گئی۔ مدرسہ دین کی علامت بن گیا اور اسکول دنیا کی۔ نتیجتاً طالب علم نے سیکھ لیا کہ دین اور جدید علم ایک دوسرے کے متبادل ہیں، نہ کہ تکمیل۔ یہی تصور بعد میں دین کو غیر ضروری یا غیر متعلق بنانے کا ذریعہ بنا۔

قرآنِ مجید نے اس دوئی کو کبھی قبول نہیں کیا۔ وہ علم کو ایک وحدت کے طور پر پیش کرتا ہے، جہاں کائنات کا علم بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ہے:

عنقریب ہم انہیں اپنی نشانیاں آفاق عالم میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی اپنی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر کھل جائے کہ حق یہی ہے، کیا آپ کے رب کا ہر چیز سے واقف و آگاہ ہونا کافی نہیں۔ (سورۃ فصلت: آیت 53)

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ فطرت، سائنس اور وحی ایک ہی سچ کے مختلف مظاہر ہیں، مگر نوآبادیاتی تعلیم نے انہیں ایک دوسرے سے کاٹ دیا۔

فکری غلامی کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ انسان اپنے آقا کی سوچ کو معیار

مان لیتا ہے۔ جب مغربی علم، تاریخ اور فلسفہ نصاب کا مرکز بن گئے اور اسلامی فکر کو ضمنی یا اختیاری بنا دیا گیا تو طالب علم کے ذہن میں یہ پیغام بیٹھ گیا کہ اصل علم وہ ہے جو مغرب سے آئے، اور دین محض نجی یا ثقافتی ورثہ ہے۔

قرآنِ مجید نے اسی ذہنی کیفیت کو اندھی تقلید قرار دیا ہے:

اوران سے جب کبھی کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب کی تابعداری کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا، گو ان کے باپ دادے بےعقل اور گم کردہ راہ ہوں۔ (سورۃ البقرہ: آیت 170)

یہ آیت صرف ماضی کی تقلید نہیں بلکہ ہر اس تقلید پر صادق آتی ہے جو شعور کے بغیر ہو—چاہے وہ مغرب کی ہو یا کسی اور کی۔

نوآبادیاتی تعلیمی نظام نے تاریخ کو بھی نئے زاویے سے لکھا۔ مسلم عروج کو اتفاق، تلوار یا جبر سے جوڑا گیا، جبکہ زوال کو مذہب سے منسوب کیا گیا۔ اس بیانیے نے نوجوان ذہن میں یہ تصور بٹھایا کہ اسلام ترقی کی راہ میں رکاوٹ رہا ہے—حالانکہ تاریخ اس کے برعکس گواہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ مسلمان اکثر اپنی تہذیب کے بارے میں احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی زبان، لباس، روایات حتیٰ کہ مذہبی علامات تک کو کمتر سمجھنے لگتا ہے۔ یہ احساسِ کمتری بالآخر دین سے عملی اور فکری دوری میں بدل جاتا ہے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی تو وہ انہیں میں سے ہے“۔ (سنن ابی داود حدیث: 4031)

یہ حدیث اندھی تقلید کے خطرات کی طرف اشارہ کرتی ہے — خاص طور پر اس وقت، جب تقلید سوچ اور اقدار تک پہنچ جائے۔

تعلیمی نظام میں دین کی غیر موجودگی کا ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ اخلاقیات کو نسبتی بنا دیا گیا۔ اچھا اور برا، حق اور باطل — یہ سب حالات اور مفاد کے تابع سمجھے جانے لگے۔ جبکہ اسلام اخلاق کو وحی سے جوڑتا ہے، نہ کہ اکثریت کی رائے سے۔

قرآنِ مجید فرماتا ہے:

اور دنیا میں زیادہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کا کہنا ماننے لگیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بے راہ کر دیں وہ محض بے اصل خیالات پر چلتے ہیں اور بالکل قیاسی باتیں کرتے ہیں۔ (سورۃ الأنعام: آیت 116)

یہ آیت اس خطرے کی نشاندہی کرتی ہے کہ اکثریت یا طاقت معیارِ حق نہیں ہوتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلم معاشروں میں دین سے دوری کا ایک گہرا سبب نوآبادیاتی تعلیمی ورثہ اور فکری غلامی ہے۔ جب تعلیم اپنی تہذیب، تاریخ اور دین سے کٹ جائے تو وہ ذہن تو بناتی ہے، مگر شناخت نہیں؛ معلومات تو دیتی ہے، مگر مقصد نہیں؛ اور ترقی تو دکھاتی ہے، مگر راستہ نہیں۔

(نصاب میں دین کی علامتی حیثیت، علوم کی تقسیم اور دوہری شخصیت کا بحران)

جب کوئی معاشرہ اپنے تعلیمی نظام میں دین کو مرکزی رہنمائی کے بجائے محض علامت (Symbol) بنا دے تو دین عملاً زندگی سے غائب ہونا شروع ہو جاتا ہے، چاہے وہ نصاب میں رسمی طور پر موجود ہی کیوں نہ ہو۔ آج بیشتر مسلم ممالک کے تعلیمی نصاب میں

دین ایک مضمون کے طور پر تو موجود ہے، مگر ایک زندہ فکری قوت کے طور پر نہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں دین سے دوری منظّم اور مستقل شکل اختیار کرتی ہے۔

جدید نصاب میں دینی تعلیم اکثر چند اسباق، اخلاقی کہانیوں یا امتحانی سوالات تک محدود ہوتی ہے۔ طالب علم نماز، روزہ، چند آیات یا احادیث تو رٹ لیتا ہے، مگر اسے یہ نہیں سکھایا جاتا کہ دین اس کی سوچ، ترجیحات، فیصلوں اور پیشہ ورانہ زندگی کی رہنمائی کیسے کرے گا۔ یوں دین ذہن میں محفوظ معلومات تو بن جاتا ہے، مگر زندگی کا اصول نہیں بنتا۔

قرآنِ مجید نے اس رویے کو نہایت واضح الفاظ میں رد کیا ہے:

اللہ کے نزدیک ناراض ہونے کے اعتبار سے بڑی بات ہے کہ تم وہ کہو جو تم نہیں کرتے۔ (سورۃ الصّف: آیت 3)

یہ آیت علم اور عمل کے درمیان خلیج کو اللہ کے نزدیک سخت ناپسندیدہ قرار دیتی ہے، مگر موجودہ نصاب اسی خلیج کو معمول بنا چکا ہے۔

اسی علامتی دین کا ایک بڑا نتیجہ دینی وعصری علوم کی تقسیم ہے۔ طالب علم صبح یونیورسٹی میں سائنس، معاشیات، قانون یا مینجمنٹ پڑھتا ہے — جہاں خدا، وحی اور اخلاقی مطلقات کا ذکر نہیں ہوتا — اور شام کو مدرسے یا اسلامیات کی کلاس میں دین پڑھتا ہے، جو اس کی پیشہ ورانہ تعلیم سے بالکل کٹا ہوا ہوتا ہے۔ نتیجتاً اس کے ذہن میں یہ تصور پختہ ہو جاتا ہے کہ:

- دین مسجد کے لیے ہے
- علم دنیا کے لیے ہے
- ایمان دل کا معاملہ ہے

- نظام عقل اور مفاد سے چلتے ہیں

یہی تقسیم آگے چل کر دین کو نجی عبادت اور دنیا کو بے دین حقیقت بنا دیتی ہے۔

قرآنِ مجید اس تقسیم کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا۔ وہ انسان کو ایک وحدت کے طور پر دیکھتا ہے:

آپ فرما دیجئے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو سارے جہان کا مالک ہے۔ (سورۃ الأنعام: آیت 162)

یہ آیت واضح اعلان ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ دین سے باہر نہیں۔

جب تعلیم اس وحدت کو توڑ دیتی ہے تو دوہری شخصیت (Split Personality) جنم لیتی ہے۔ ایک شخصیت مسجد میں نظر آتی ہے— نمازی، مؤدب، مذہبی؛ اور دوسری دفتر، عدالت، بازار یا سیاست میں— جہاں وہی شخص وہ سب کچھ کر لیتا ہے جو دین منع کرتا ہے۔ یہ تضاد شعوری منافقت نہیں بلکہ تعلیمی تربیت کا منطقی نتیجہ ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا، منافق کی علامتیں تین ہیں۔ جب بات کرے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے اس کے خلاف کرے اور جب اس کو امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔) صحیح البخاری حدیث: 33)

یہ حدیث اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ قول و عمل کا تضاد رفتہ رفتہ ایمان کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔

تعلیمی نصاب میں دین کی علامتی حیثیت کا ایک اور نقصان یہ ہے کہ دینی سوالات کو غیر عملی سمجھا جانے لگتا ہے۔ جب طالب علم پوچھتا ہے کہ:

- اسلامی اخلاق جدید معیشت میں کیسے نافذ ہوں؟
- شریعت اور ریاست کا تعلق کیا ہے؟
- سائنس اور ایمان میں ہم آہنگی کیسے پیدا ہو؟

تو اسے یا تو خاموش کرا دیا جاتا ہے، یا کہا جاتا ہے کہ **"یہ عملی دنیا نہیں، کتابی باتیں ہیں۔"**

یہی لمحہ ہوتا ہے جہاں نوجوان یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ دین نظریاتی تو ہے، مگر عملی نہیں۔

قرآنِ مجید نے اس سوچ کی نفی کرتے ہوئے ایمان کو عملی قوت قرار دیا ہے:

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں ان کے پاؤں جما دیں تو یہ پوری پابندی سے نمازیں قائم کریں اور زکوٰتیں دیں اور اچھے کاموں کا حکم کریں اور برے کاموں سے منع کریں۔ تمام کاموں کا انجام اللہ کے اختیار میں ہے۔ (سورۃ الحج آیت 41)

یعنی اقتدار، نظام اور زمین میں عمل — یہ سب دین سے جڑے ہوئے ہیں۔

نصاب میں دین کی کمزوری کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ دینی تاریخ اور فکری ورثہ کو یا تو مسخ کر کے پڑھایا جاتا ہے یا مکمل طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ابنِ سینا، امام غزالی، ابنِ خلدون اور شاہ ولی اللہ جیسے مفکرین کو یا تو صرف تاریخی نام بنا دیا جاتا ہے، یا انہیں جدید فکر سے غیر متعلق دکھایا جاتا ہے۔ اس سے طالب علم یہ سمجھنے لگتا ہے کہ دین نے ماضی تو دیا تھا، مستقبل نہیں۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تہذیب نے علم، فلسفہ، سائنس اور ریاست — ہر میدان میں انسانیت کو راستہ دکھایا۔

قرآنِ مجید خود انسان کو تدبر اور غور و فکر کی دعوت دیتا ہے:

﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ﴾

یہ سوالات اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام فکری جمود نہیں بلکہ فکری حرکت کا داعی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب تعلیمی نصاب میں دین کو محض علامت بنا دیا جائے، اور علم کو دینی و غیر دینی خانوں میں بانٹ دیا جائے، تو نتیجہ ایک ایسی نسل کی صورت میں نکلتا ہے جو معلومات رکھتی ہے مگر سمت نہیں، مہارت رکھتی ہے مگر اخلاق نہیں، اور کامیابی چاہتی ہے مگر مقصد نہیں۔ یہی کیفیت بالآخر دین سے خاموش دوری میں بدل جاتی ہے۔

(اساتذہ کا کردار، تعلیمی ماحول اور تعلیم و تربیت کے درمیان خلیج)

کوئی بھی تعلیمی نظام محض نصاب سے زندہ نہیں رہتا۔ اس کی اصل روح اساتذہ ہوتے ہیں، اور اس کی اصل تاثیر تعلیمی ماحول سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر نصاب بہترین ہو مگر استاد محض معلومات منتقل کرنے والا ہو، اور ماحول مقصد سے خالی ہو، تو تعلیم ذہن تو بنا سکتی ہے، انسان نہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں دین سے دوری محض فکری نہیں بلکہ تربیتی ناکامی بن جاتی ہے۔

اسلام میں استاد محض مضمون پڑھانے والا نہیں بلکہ مربی ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے خود کو اسی حیثیت سے متعارف کرایا:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ نے مجھے سختی کرنے والا نہیں بلکہ مجھے آسانی سے سکھانے والا بنا کر بھیجا ہے۔“ (صحیح مسلم حدیث نمبر 3690)

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ تعلیم نبوی مشن کا حصہ ہے، مگر یہ تعلیم محض معلومات

نہیں بلکہ تزکیہ، تربیت اور کردار سازی پر مشتمل ہے۔

قرآنِ مجید نے بھی رسول اللہ ﷺ کے تعلیمی کردار کو تین واضح مراحل میں بیان کیا:

وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے۔ یقیناً یہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔ (سورۃ الجمعہ: آیت 2)

یعنی پہلے تزکیہ (کردار و نفس کی اصلاح)، پھر علم۔ مگر جدید تعلیمی نظام نے اس ترتیب کو الٹ دیا — علم تو بہت ہے، تزکیہ تقریباً غائب۔

آج کے تعلیمی اداروں میں استاد کا کردار اکثر نوکری تک محدود ہو چکا ہے۔ وہ نصاب مکمل کرتا ہے، امتحان لیتا ہے، گریڈ دیتا ہے — مگر طالب علم کی فکری، اخلاقی اور روحانی تشکیل اس کی ذمہ داری نہیں سمجھی جاتی۔ نتیجتاً طالب علم علم تو سیکھتا ہے، مگر اقدار نہیں؛ مہارت تو حاصل کرتا ہے، مگر ذمہ داری نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ اکثر اخلاقی تضاد کا شکار نظر آتا ہے۔ وہ قانون جانتا ہے، مگر انصاف نہیں کرتا؛ وہ معاشیات پڑھتا ہے، مگر استحصال سے نہیں رکتا؛ وہ سائنس سمجھتا ہے، مگر خالق کو بھول جاتا ہے۔ یہ تضاد فرد کی ذاتی بددیانتی نہیں بلکہ تربیت کی کمی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

قرآنِ مجید نے اسی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے:

کیا لوگوں کو بھلائیوں کا حکم کرتے ہو؟ اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو باوجودیکہ تم کتاب پڑھتے ہو، کیا اتنی بھی تم میں سمجھ نہیں؟۔ (سورۃ البقرہ: آیت 44)

یہ آیت اس خطرے کی نشاندہی کرتی ہے کہ جب علم عمل سے جدا ہو جائے تو وہ خود اپنے حامل کے خلاف گواہ بن جاتا ہے۔

تعلیمی ماحول بھی دین سے قربت یا دوری میں فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ اگر ادارے کا ماحول مادہ پرستی، مقابلہ بازی، نمبروں کی دوڑ اور ظاہری کامیابی پر مرکوز ہو تو طالب علم لاشعوری طور پر یہی سیکھتا ہے کہ زندگی کا مقصد سبقت لے جانا ہے، نہ کہ بہتر انسان بننا۔ ایسے ماحول میں دین ایک غیر عملی، اضافی یا ذاتی چیز محسوس ہونے لگتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے ماحول اور صحبت کی اہمیت پر واضح مثال دی: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نیک اور برے دوست کی مثال مشک ساتھ رکھنے والے اور بھٹی دھونکنے والے کی سی ہے (جس کے پاس مشک ہے اور تم اس کی محبت میں ہو) وہ اس میں سے یا تمہیں کچھ تحفہ کے طور پر دے گا یا تم اس سے خرید سکو گے یا (کم از کم) تم اس کی عمدہ خوشبو سے تو محظوظ ہو ہی سکو گے اور بھٹی دھونکنے والا یا تمہارے کپڑے (بھٹی کی آگ سے) جلا دے گا یا تمہیں اس کے پاس سے ایک ناگوار بدبودار دھواں پہنچے گا۔ (صحیح البخاری حدیث: 5534)

یہ اصول تعلیمی ماحول پر بھی مکمل طور پر لاگو ہوتا ہے۔

ایک اور سنگین مسئلہ یہ ہے کہ جدید تعلیمی اداروں میں دین دار ہونا اکثر غیر پیشہ ورانہ یا کمزور ذہنیت سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی طالب علم یا استاد دینی اقدار پر سنجیدگی سے عمل کرے تو اسے قدامت پسند یا غیر جدید کہہ کر حاشیے پر ڈال دیا جاتا ہے۔ اس رویے سے طالب علم یہ سیکھتا ہے کہ ترقی اور دین ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔

یہی سوچ آگے چل کر دین کو زندگی کے مرکز سے نکال دیتی ہے۔ حالانکہ قرآنِ مجید نے واضح فرمایا:

اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے چھٹکارے کی شکل نکال دیتا ہے۔
(سورۃ الطلاق: آیت 2)

یعنی تقویٰ رکاوٹ نہیں بلکہ راستہ بناتا ہے۔

تعلیم اور تربیت کے درمیان فرق کو سمجھے بغیر دین سے قربت ممکن نہیں۔ تعلیم معلومات دیتی ہے، جبکہ تربیت شخصیت بناتی ہے۔ تعلیم عقل کو خطاب کرتی ہے، تربیت دل اور عمل کو۔ جدید نظام نے تربیت کو خاندان، مسجد یا فرد پر چھوڑ دیا—اور خود کو بری الذمہ قرار دے لیا۔ مگر جب خاندان کمزور ہو جائیں اور مسجد سماجی مرکز نہ رہے، تو تربیت کا خلا پیدا ہو جاتا ہے، جسے کوئی نہیں بھرتا۔

رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کا امتیاز یہی تھا کہ آپ ﷺ نے صحابہؓ کو صرف عالم نہیں بلکہ کردار کا نمونہ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علم جہاں گئے، وہاں تہذیب بھی گئی، عدل بھی گیا اور ایمان بھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ تعلیمی نظام میں دین کی کمزوری صرف نصاب کی خامی نہیں بلکہ مربی کی غیر موجودگی، ماحول کی مادیت، اور تربیت کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ جب استاد نمونہ نہ رہے، ماحول مقصد سے خالی ہو، اور تعلیم تربیت سے کٹ جائے— تو دین خود بخود غیر متعلق بن جاتا ہے، بغیر کسی باضابطہ انکار کے۔

(تعلیمی اصلاح، دینی و عصری علوم کا امتزاج، اور متوازن اسلامی تعلیمی وژن)

جب کسی مسئلے کی جڑ واضح ہو جائے تو سب سے اہم سوال یہ ہوتا ہے کہ اب راستہ کیا ہے؟

مسلمانوں میں دین سے دوری کے تعلیمی اسباب پر گفتگو کے بعد یہ حقیقت بالکل

واضح ہو چکی ہے کہ مسئلہ محض دین کی کمی کا نہیں بلکہ تعلیم کے مقصد کے بگڑ جانے کا ہے۔ چنانچہ اصلاح بھی اسی مقصد کی درستگی سے شروع ہوگی۔

اسلامی تصورِ تعلیم کی بنیاد یہ ہے کہ علم انسان کو اللہ سے جوڑے، خود شناسی دے، اور ذمہ داری کا احساس پیدا کرے۔ قرآنِ مجید نے تعلیم کو کبھی محض دنیا کمانے کا ذریعہ قرار نہیں دیا، بلکہ اسے امانت اور امتحان کہا ہے:

میرے پروردگار مجھے اور زیادہ علم دے۔ (سورۃ طٰہٰ: آیت 114)

یہ دعا اس بات کی علامت ہے کہ علم ایک مسلسل روحانی سفر ہے، محض پیشہ ورانہ مہارت نہیں۔

تعلیمی اصلاح کا پہلا قدم یہ ہے کہ دین کو نصاب کے حاشیے سے نکال کر مرکز میں لایا جائے — لیکن اس انداز میں کہ دین محض ایک مضمون نہ رہے بلکہ فکری بنیاد (Worldview) بنے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر کتاب مذہبی بنا دی جائے، بلکہ یہ کہ ہر علم کو اس کے اخلاقی، انسانی اور الٰہی تناظر میں پڑھایا جائے۔

مثلاً:

- سائنس کو خالق کی نشانیوں کے مطالعے کے طور پر
- معاشیات کو عدل، امانت اور فلاح کے اصولوں کے ساتھ
- سیاست کو خدمت اور جواب دہی کے تصور کے تحت
- قانون کو انصاف اور حق کے تحفظ کے لیے

دینی و عصری علوم کے امتزاج کا مطلب یہ نہیں کہ مدرسہ اور یونیورسٹی کو زبردستی

جوڑ دیا جائے، بلکہ یہ ہے کہ دین اور دنیا کے درمیان مصنوعی دیوار کو گرایا جائے۔ طالب علم کو یہ سکھایا جائے کہ دین اس کی سوچ، نیت اور مقصد کو درست کرتا ہے، جبکہ عصری علم اس مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے نیت کو ہر عمل کی بنیاد قرار دیا: ''اعمال کا مدار نیت پر ہی ہے۔''
(صحیح مسلم حدیث: 4927)

جب نیت درست ہو تو دنیاوی علم بھی عبادت بن جاتا ہے، اور جب نیت غائب ہو تو دینی علم بھی محض معلومات رہ جاتا ہے۔

تعلیمی اصلاح کا دوسرا اہم ستون اساتذہ کی تربیت ہے۔ جب تک استاد خود مقصدِ تعلیم کو نہ سمجھے، وہ طالب علم کو سمت نہیں دے سکتا۔ استاد کو محض لیکچر دینے والا نہیں بلکہ فکری رہنما اور اخلاقی نمونہ بنانا ہوگا۔ اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، اور امام احمد بن حنبلؒ جیسے اساتذہ نے نصاب سے زیادہ اپنے کردار سے شاگرد تیار کیے۔

تعلیم بھی ایک امانت ہے، اور استاد اس کا امین۔

تعلیمی ماحول کی اصلاح بھی ناگزیر ہے۔ ادارے کا ماحول اگر صرف مقابلہ، نمبر، مارکیٹ ویلیو اور دنیاوی کامیابی پر مرکوز رہے تو دین محض رسمی رہ جائے گا۔ مگر اگر ماحول میں سوال پوچھنے کی آزادی، اخلاقی گفتگو، مقصدِ حیات پر مکالمہ اور کردار کی قدر ہو — تو دین دوبارہ زندگی کا حصہ بن جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے تعلیم کو مسجد، بازار، گھر اور میدان — ہر جگہ زندہ رکھا۔ یہی جامع ماحول اسلام کی اصل طاقت تھا۔

تعلیمی نظام کا ایک اور اہم پہلو تنقیدی سوچ (Critical Thinking) ہے۔ دین سے دوری اکثر اس وقت پیدا ہوتی ہے جب نوجوان کے سوالات کا جواب دینے کے بجائے انہیں دبایا جاتا ہے۔ اسلامی تعلیم سوال سے نہیں گھبراتی، بلکہ اسے ایمان کی پختگی کا ذریعہ بناتی ہے۔

قرآنِ مجید نے حضرت ابراہیمؑ کے سوال کو نقل کیا:

اور جب ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا کہ اے میرے پروردگار! مجھے دکھا تو مُردوں کو کس طرح زندہ کرے گا؟ (سورۃ البقرہ: آیت 260)

یہ سوال ایمان کی کمزوری نہیں بلکہ یقین کی گہرائی کا راستہ تھا۔

اس باب کا آخری اور سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ تعلیمی اصلاح کسی ایک ادارے یا حکومت کا کام نہیں، بلکہ فرد، خاندان، استاد، عالم اور ریاست — سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ اگر ہم آنے والی نسلوں کو دین سے جوڑنا چاہتے ہیں تو ہمیں تعلیم کو دوبارہ مقصد، اخلاق اور ایمان سے جوڑنا ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں دین سے دوری محض فکری انحراف نہیں بلکہ ایک ایسا تعلیمی مسئلہ ہے جو دہائیوں سے پروان چڑھ رہا ہے۔ جب تعلیم ہدایت سے کٹ جائے تو ترقی بے سمت ہو جاتی ہے، اور جب علم مقصد سے خالی ہو جائے تو دین غیر متعلق محسوس ہونے لگتا ہے۔

باب 09

روحانی کمزوری، عبادات سے غفلت اور ایمان کی کم ہوتی حرارت

(ایمان کی حقیقت، دل کی کیفیت اور روحانی زوال کا آغاز)

دین سے دوری کا سب سے گہرا اور خاموش سبب دل کی دنیا میں پیدا ہونے والی کمزوری ہے۔ بہت سے لوگ بظاہر مسلمان رہتے ہیں، عقائد کا انکار نہیں کرتے، عبادات کو غلط نہیں کہتے— مگر اس کے باوجود دین ان کی زندگی کا محرک نہیں رہتا۔ اس کیفیت کو اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ ہے: ایمان کی حرارت کا ختم ہو جانا۔

اسلام میں ایمان محض نظری تصدیق کا نام نہیں، بلکہ ایک زندہ، متحرک اور اثر انداز ہونے والی حقیقت ہے۔ قرآنِ مجید ایمان کو دل سے جوڑتا ہے:

اللہ تعالیٰ نے ایمان کو تمہارے لئے محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں زینت دے رکھی ہے اور کفر کو اور گناہ کو اور نافرمانی کو تمہارے نگاہوں میں ناپسندیدہ بنا دیا ہے، یہی لوگ راہ یافتہ ہیں۔ (سورۃ الحجرات: آیت 7)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ ایمان صرف مان لینے کا نام نہیں بلکہ دل میں محبوب بن جانے کا نام ہے۔

جب ایمان دل میں محبوب نہ رہے تو دین بوجھ محسوس ہونے لگتا ہے۔ عبادات رسم بن جاتی ہیں، حرام و حلال نظری بحث رہ جاتی ہے، اور آخرت کا تصور کمزور پڑ جاتا ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں دین سے دوری کا آغاز ہوتا ہے— بغیر کسی بغاوت کے، بغیر کسی انکار کے۔

نبی کریم ﷺ نے ایمان کو دل کی کیفیت قرار دیا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے

تھے ’’سن لو بدن میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو گا سارا بدن درست ہو گا اور جہاں بگڑا سارا بدن بگڑ گیا۔ سن لو وہ ٹکڑا آدمی کا دل ہے۔‘‘) صحیح البخاری حدیث: 52)

یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ دین سے تعلق کا اصل مرکز دل ہے، نہ کہ ظاہری شناخت۔

روحانی کمزوری یکدم پیدا نہیں ہوتی۔ یہ ایک تدریجی عمل ہے۔ ابتدا غفلت سے ہوتی ہے — نماز میں توجہ کی کمی، دعا میں بے دلی، قرآن سے فاصلے، اور ذکر سے بے رغبتی۔ پھر یہ غفلت معمول بن جاتی ہے، اور معمول آخر کار طبعی کیفیت۔ یہی دل کی سختی دین سے دوری کی علامت بھی ہے اور سبب بھی۔

روحانی زوال کا ایک بڑا سبب دنیا میں حد سے زیادہ انہماک ہے۔ جب دنیا مقصد بن جائے اور آخرت محض ایک نظریہ رہ جائے تو ایمان کمزور پڑ جاتا ہے۔

قرآنِ مجید خبردار کرتا ہے:

جان لو کہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل ہے اور دل لگی ہے اور بناؤ سنگار ہے اور تمھارا آپس میں ایک دوسرے پر بڑائی جتانا ہے اور اموال اور اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے (سورۃ الحدید: آیت 20)

یہ آیت دنیا کی حقیقت کو واضح کرتی ہے — مگر جب دل اس حقیقت کو بھول جائے تو دنیا ہی سب کچھ بن جاتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اسی خطرے کو یوں بیان فرمایا: ’’قریب ہے کہ (گمراہ) قومیں تمہارے خلاف (لڑنے کے لیے) دوسری قوموں کو بلائیں جس طرح کھانے والے کھانے کے برتن کی طرف ایک دوسرے کو بلاتے ہیں۔‘‘ کسی نے عرض کیا: اس روز ہماری تعداد کم

ہونے کی وجہ سے ایسے ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں، بلکہ اس روز تم زیادہ ہوگے، لیکن تم سیلاب کی جھاگ کی طرح ہوگے، اللہ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہاری ہیبت نکال دے گا اور تمہارے دل میں وہن ڈال دے گا۔'' کسی نے عرض کیا، اللہ کے رسول! وہن کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''دنیا سے محبت اور موت سے نفرت۔'' (البیهقی حدیث: 534)

دنیا کی محبت جب دل پر غالب آ جائے تو گناہ، غفلت اور دین سے دوری خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔

ایمان کی کمزوری کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ ہم روحانی غذا کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ جیسے جسم کو خوراک نہ ملے تو وہ کمزور ہو جاتا ہے، ویسے ہی دل کو قرآن، ذکر، دعا اور عبادت کی غذا نہ ملے تو ایمان سوکھنے لگتا ہے۔ آج بہت سے مسلمان جسمانی صحت، ذہنی کامیابی اور معاشی ترقی پر تو توجہ دیتے ہیں، مگر دل کی غذا کو غیر ضروری سمجھ لیتے ہیں۔

قرآنِ مجید دل کی زندگی کو ذکرِ الٰہی سے جوڑتا ہے:

جو لوگ ایمان لائے ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ یاد رکھو اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو تسلی حاصل ہوتی ہے۔ (سورۃ الرعد: آیت 28)

جب ذکر کم ہو جائے تو سکون بھی رخصت ہو جاتا ہے—اور یہی بے سکونی انسان کو دین سے دور لے جاتی ہے۔

روحانی کمزوری کا ایک اور خطرناک نتیجہ یہ ہے کہ انسان گناہ کو معمولی سمجھنے لگتا ہے۔ ابتدا میں ضمیر ملامت کرتا ہے، مگر بار بار گناہ سے دل سیاہ پڑ جاتا ہے۔

قرآنِ مجید فرماتا ہے:

یوں نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کیا عمال کی وجہ سے زنگ (چڑھ گیا) ہے۔ (سورۃ المطففین: آیت 14)

جب گناہوں کا زنگ دل پر چڑھ جاتا ہے، اور پھر حق واضح ہو کر بھی اثر نہیں کرتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں دین سے دوری کا ایک بنیادی سبب ایمان کی اندرونی کمزوری ہے۔ جب دل زندہ نہ رہے، روحانی تعلق کمزور پڑ جائے، اور آخرت نگاہ سے اوجھل ہو جائے — تو دین محض شناخت رہ جاتا ہے، زندگی نہیں۔

(عبادات سے غفلت کے اسباب، نماز و قرآن سے دوری، اور روحانی خلا)

عبادات دین کا محض ظاہری ڈھانچہ نہیں بلکہ ایمان کی سانس ہوتی ہیں۔ جس طرح سانس کے بغیر جسم زندہ نہیں رہ سکتا، اسی طرح عبادات کے بغیر ایمان اپنی حرارت کھو دیتا ہے۔ مسلمانوں میں دین سے دوری کا ایک نمایاں مظہر یہ ہے کہ عبادات کو یا تو رسم بنا لیا گیا ہے یا پھر غیر ضروری بوجھ سمجھ لیا گیا ہے۔

اسلام میں عبادت کا مقصد اللہ سے تعلق کو زندہ رکھنا ہے، نہ کہ محض چند افعال کی ادائیگی۔

قرآنِ مجید نماز کے بارے میں فرماتا ہے:

جو کتاب آپ کی طرف وحی کی گئی ہے اسے پڑھئے اور نماز قائم کریں، یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے، بیشک اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے، تم جو کچھ کر رہے ہو اس سے اللہ خبر دار ہے۔ (سورۃ العنکبوت: آیت 45)

یعنی نماز انسان کے کردار اور عمل پر اثر ڈالتی ہے۔ مگر جب نماز یہ اثر کھو دے تو

سمجھ لینا چاہیے کہ نماز باقی ہے، مگر روح غائب ہو چکی ہے۔

عبادات سے غفلت کا پہلا سبب وقت کی ترجیحات کا بگڑ جانا ہے۔ جدید انسان کے پاس ہر چیز کے لیے وقت ہے— تعلیم، ملازمت، کاروبار، تفریح، سوشل میڈیا— مگر عبادت کے لیے وقت نکالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ وقت کی کمی کا نہیں بلکہ اہمیت کی کمی کا ہے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کون سا عمل زیادہ محبوب ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے وقت پر نماز پڑھنا، پھر پوچھا، اس کے بعد، فرمایا والدین کے ساتھ نیک معاملہ رکھنا۔ پوچھا اس کے بعد، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔ (صحیح البخاری حدیث:527)

جب نماز وقت پر ادا نہ ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ دل میں اس کی اہمیت کم ہو چکی ہے۔

عبادات سے دوری کا دوسرا بڑا سبب دنیا کی مسلسل مصروفیت ہے۔ جدید زندگی نے انسان کو ایک ایسے دائرے میں قید کر دیا ہے جہاں خاموشی، تنہائی اور غور و فکر کے لمحات نایاب ہو چکے ہیں۔ جبکہ عبادت کے لیے سکون، توجہ اور باطنی یکسوئی ضروری ہے۔

قرآنِ مجید نے اسی کیفیت کو "**غفلت**" کہا ہے:

اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے اللہ (کے احکام) کو بھلا دیا تو اللہ نے بھی انہیں اپنی جانوں سے غافل کر دیا، اور ایسے ہی لوگ نافرمان (فاسق) ہوتے ہیں۔ (سورۃ الحشر: آیت 19)

جب اللہ کو بھلا دیا جائے تو انسان خود کو بھی بھول جاتا ہے۔

قرآن سے دوری عبادات سے غفلت کا سب سے خطرناک پہلو ہے۔قرآن محض تلاوت کی کتاب نہیں بلکہ دلوں کی زندگی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے ایک روح کی وحی کی (سورۃ الشوریٰ: آیت 52)

اس آیت میں قرآن کو "روح" کہا گیا ہے، اور روح کے بغیر جسم مردہ ہو جاتا ہے۔

آج بہت سے مسلمان قرآن کو صرف رمضان، جنازے یا ثواب کی نیت تک محدود کر چکے ہیں۔اس سے ہدایت، رہنمائی اور فکری روشنی حاصل کرنے کا تصور کمزور ہو گیا ہے۔نتیجتاً زندگی کے فیصلے خواہش، ماحول اور مفاد کی بنیاد پر ہونے لگتے ہیں، نہ کہ وحی کی روشنی میں۔

عبادات سے غفلت کا ایک اور اہم سبب دعا سے بے اعتنائی ہے۔دعا ایمان کا اظہار اور بندگی کا اعتراف ہے۔مگر جب انسان خود کو خود کفیل سمجھنے لگے، تو دعا اس کی نظر میں غیر ضروری بن جاتی ہے۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اور تمھارے رب نے فرمایا مجھے پکارو، میں تمھاری دعا قبول کروں گا۔بے شک وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔ (سورۃ غافر: آیت 60)

اس آیت میں دعا کو بندگی قرار دیا گیا ہے، اور اس سے اعراض کو تکبر۔

عبادات سے غفلت صرف انفرادی مسئلہ نہیں بلکہ سماجی ماحول بھی اس میں کردار ادا کرتا ہے۔ جب معاشرہ مجموعی طور پر دین کو نجی معاملہ سمجھ لے، مساجد محض رسمی عبادت گاہیں بن جائیں، اور دینی گفتگو غیر متعلق سمجھی جائے — تو فرد کے لیے عبادت کو مرکز بنانا مشکل ہو جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے جماعت اور اجتماعی عبادت کی اہمیت اسی لیے واضح فرمائی تاکہ ایمان تنہا نہ پڑ جائے:

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''باجماعت نماز پڑھنا اکیلے کی نماز سے ستائیس درجے افضل ہے۔'' (صحیح مسلم حدیث: 1477)

عبادات سے دوری کا ایک اور نفسیاتی پہلو گناہوں کی کثرت ہے۔ جب انسان مسلسل گناہوں میں مبتلا رہے اور توبہ کو مؤخر کرتا جائے تو عبادت بوجھ بننے لگتی ہے۔ دل عبادت کی لذت سے محروم ہو جاتا ہے، کیونکہ گناہ اور نور ایک جگہ جمع نہیں ہوتے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اے مسلمانو! تم سب کے سب اللہ کی جناب میں توبہ کرو تاکہ تم نجات پاؤ۔ (سورۃ النور: آیت 31)

یعنی روحانی زندگی کی بحالی توبہ سے شروع ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عبادات سے غفلت محض سستی یا مصروفیت کا مسئلہ نہیں بلکہ ایمان کی کم ہوتی حرارت، دنیا کی ترجیح، اور روحانی غذا کی کمی کا نتیجہ ہے۔ جب نماز، قرآن اور دعا زندگی کے مرکز سے ہٹ جائیں تو دین نظریہ تو رہ جاتا ہے، مگر قوت نہیں رہتا۔

(روحانی خلا، جدید انسان کی بے چینی، اور سکون کی غلط تلاش)

جب ایمان کی حرارت کم ہو جائے، عبادات محض رسم بن جائیں، اور دل اللہ سے جڑا نہ رہے، تو انسان کے اندر ایک خاموش مگر شدید خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ خلا مادی نہیں ہوتا، اس لیے اسے دولت، سہولت یا کامیابی سے نہیں بھرا جا سکتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں جدید انسان شدید بے چینی، اضطراب اور عدم اطمینان کا شکار نظر آتا ہے — حالانکہ بظاہر اس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔

قرآنِ مجید نے اس کیفیت کو نہایت گہرے انداز میں بیان کیا ہے:

اور (ہاں) جو میری یاد سے روگردانی کرے گا اس کی زندگی تنگی میں رہے گی، اور ہم اسے بروزِ قیامت اندھا کر کے اٹھائیں گے۔ (سورۃ طٰہٰ: آیت 124)

یعنی جو اللہ کی یاد سے منہ موڑے گا، اس کی زندگی تنگ ہو جائے گی — چاہے وہ ظاہری طور پر کتنی ہی آسودہ کیوں نہ ہو۔

جدید دور کا انسان اسی "تنگ زندگی" کا عملی نمونہ ہے۔ ٹیکنالوجی، سہولت، رفتار اور معلومات کی فراوانی کے باوجود دل مطمئن نہیں، ذہن پرسکون نہیں، اور روح بے قرار ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ روح کی غذا غائب ہو چکی ہے، مگر جسم اور ذہن مسلسل مصروف ہیں۔

اسلام انسان کو محض جسم اور عقل نہیں بلکہ روح بھی قرار دیتا ہے۔

قرآنِ مجید فرماتا ہے:

پھر اُس کو درست کیا پھر اس میں اپنی (طرف سے) روح پھونکی اور تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے مگر تم بہت کم شکر کرتے ہو۔ (سورۃ السجدہ: آیت 9)

یہ روح اللہ کی طرف سے امانت ہے، اور اس کی ضرورتیں مادی چیزوں سے پوری نہیں ہوتیں۔

جب روحانی خلا پیدا ہوتا ہے تو انسان فطری طور پر اسے پُر کرنے کی کوشش کرتا ہے، مگر چونکہ وہ اصل سبب سے غافل ہوتا ہے، اس لیے غلط متبادل اختیار کر لیتا ہے۔ کوئی لذت میں سکون تلاش کرتا ہے، کوئی دولت میں، کوئی طاقت میں، کوئی شہرت میں، اور کوئی تعلقات میں۔ مگر یہ سب وقتی تسکین دیتے ہیں، دائمی سکون نہیں۔

نبی کریم ﷺ نے اسی حقیقت کو یوں بیان فرمایا: ''اگر آدم کے بیٹے کے پاس مال کی (بھری ہوئی) دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری حاصل کرنا چاہے گا آدمی کا پیٹ مٹی کے سوا کوئی اور چیز نہیں بھر سکتی اور اللہ اسی کی طرف توجہ فرماتا ہے جو (اس کی طرف) توجہ کرتا ہے۔'' (صحیح مسلم حدیث:2415)

یعنی انسان کی حرص کبھی ختم نہیں ہوتی — کیونکہ مسئلہ خواہش کا نہیں، روح کے خلا کا ہوتا ہے۔

جدید معاشروں میں اس روحانی خلا کا ایک بڑا اظہار ذہنی دباؤ، ڈپریشن اور اضطراب کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ علاج زیادہ تر کیمیائی، نفسیاتی یا تفریحی سطح پر کیا جاتا ہے، مگر روحانی پہلو کو یا تو نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا غیر سائنسی کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے۔

حالانکہ قرآنِ مجید نے سکون کا واضح نسخہ دیا ہے:

جو لوگ ایمان لائے ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ یاد رکھو اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو تسلی حاصل ہوتی ہے۔ (سورۃ الرعد: آیت 28)

یہ آیت کسی مخصوص قوم یا دور کے لیے نہیں، بلکہ انسان کی فطرت کے لیے ہے۔

روحانی خلا کا ایک اور خطرناک نتیجہ یہ ہے کہ انسان معنی (Meaning) کھو دیتا ہے۔ وہ جیتا ہے، کام کرتا ہے، کامیاب بھی ہوتا ہے — مگر یہ نہیں جانتا کہ کیوں؟ یہی کیفیت بالآخر وجودی بحران (Existential Crisis) میں بدل جاتی ہے، جس کا ذکر جدید فلسفہ اور نفسیات میں کثرت سے ملتا ہے۔

اسلام نے اس سوال کا جواب ابتدا ہی میں دے دیا تھا:

میں نے جنات اور انسانوں کو محض اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کریں۔ (سورۃ الذاریات: آیت 56)

جب عبادت (بندگی) زندگی کا مقصد بن جائے تو ہر عمل معنی پا لیتا ہے — اور جب یہ مقصد غائب ہو جائے تو کامیابی بھی بے معنی لگنے لگتی ہے۔

روحانی خلا انسان کو کبھی کبھی دین کے خلاف نہیں بلکہ دین سے بے نیاز بنا دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے: **''میں کسی کو نقصان نہیں پہنچا رہا، پھر عبادت کی کیا ضرورت ہے؟''**

یہ سوچ اس وقت جنم لیتی ہے جب عبادت کا مقصد اللہ سے تعلق کے بجائے محض اخلاقیات تک محدود کر دیا جائے۔

نبی کریم ﷺ نے اس سوچ کی اصلاح فرماتے ہوئے فرمایا: ''اللہ کا بندوں پر یہ حق ہے کہ وہ اللہ ہی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑی دیر چلتے رہے اور فرمایا، اے معاذ بن جبل! میں نے عرض کیا لبیک وسعدیک یا رسول اللہ! فرمایا، تمہیں معلوم ہے کہ جب بندے یہ کر لیں تو ان کا اللہ پر کیا حق ہے؟ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا کہ بندوں کا اللہ پر یہ حق

ہے کہ وہ انہیں عذاب نہ دے۔'' (صحیح البخاری حدیث:6500)

یعنی عبادت محض انسانوں کے لیے فائدہ نہیں بلکہ اللہ کا حق ہے — اور اسی میں انسان کی بھلائی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب عبادات کمزور پڑ جائیں تو ایک ایسا روحانی خلا پیدا ہوتا ہے جسے دنیا کی کوئی چیز مستقل طور پر نہیں بھر سکتی۔ انسان جتنا بھی بھاگے، جتنا بھی بدلاؤ آزمائے — آخرکار وہ اسی بے سکونی کی طرف لوٹ آتا ہے، جب تک وہ اپنے رب کی طرف نہ لوٹے۔

(روحانی خلا سے نکلنے کے راستے، توبہ ورجوع، اور ایمان کی تجدید)

اسلام انسان کو مایوسی میں نہیں چھوڑتا۔ دین سے دوری، روحانی خلا اور ایمان کی کمزوری — یہ سب ناقابلِ واپسی کیفیتیں نہیں۔ قرآنِ مجید کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ گمراہی کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ واپسی کا دروازہ بھی کھلا رکھتا ہے۔ یہی امید اسلام کی روح ہے۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

کہہ دے اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، بے شک اللہ سب کے سب گناہ بخش دیتا ہے۔ بے شک وہی تو بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔ (سورۃ الزمر: آیت 53)

یہ آیت روحانی زوال کے ہر مرحلے پر کھڑے انسان کو امید دیتی ہے کہ واپسی ممکن ہے — بلکہ محبوب ہے۔

روحانی احیا کا پہلا اور بنیادی راستہ توبہ ہے۔ توبہ صرف گناہ چھوڑنے کا نام نہیں

بلکہ دل کی سمت بدلنے کا نام ہے۔ یہ احساس کہ میں جس راستے پر ہوں، وہ مجھے اللہ سے دور لے جا رہا ہے—اور اب مجھے واپس پلٹنا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''سارے انسان خطا کار ہیں اور خطا کاروں میں سب سے بہتر وہ ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں''۔ (سنن ترمذی حدیث: 2499)

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ گناہ انسان کی فطرت ہے، مگر توبہ ایمان کی علامت ہے۔

توبہ کے بغیر عبادت بوجھ رہتی ہے، اور توبہ کے بعد عبادت لذت بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ کی زندگیوں میں بار بار توبہ، استغفار اور رجوع کا ذکر ملتا ہے— کیونکہ ایمان ایک مسلسل جدوجہد ہے، جامد کیفیت نہیں۔

روحانی خلا سے نکلنے کا دوسرا اہم راستہ ذکرِ الٰہی کی تجدید ہے۔ ذکر محض تسبیح کے دانے گننے کا نام نہیں بلکہ دل کو اللہ کی طرف متوجہ رکھنے کا عمل ہے۔

قرآنِ مجید فرماتا ہے:

مسلمانو! اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت زیادہ کرو۔ (سورۃ الأحزاب: آیت 41)

یعنی ذکر محدود لمحوں کا نہیں بلکہ کثرت اور تسلسل کا مطالبہ کرتا ہے۔

جب دل اللہ کے ذکر سے آباد ہو جائے تو دنیا کی آوازیں مدھم پڑ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اولیاء، صلحاء اور اہلِ ایمان کی زندگی میں ذکر مرکزی حیثیت رکھتا تھا— کیونکہ یہی دل کی غذا ہے۔

روحانی احیا کا تیسرا راستہ نماز کی کیفیت کی بحالی ہے۔ نماز اگر صرف حرکات و سکنات بن جائے تو وہ دل کو زندہ نہیں کرتی۔ مگر جب نماز شعور، حاضری اور عاجزی کے

ساتھ ادا کی جائے تو وہ ایمان کی حرارت کو دوبارہ زندہ کر دیتی ہے۔

قرآنِ مجید نے نماز کا مقصد یوں بیان کیا ہے:

بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔ (سورۃ طٰہٰ: آیت 14)

یعنی نماز ذکر کے لیے ہے—اور ذکر دل کو زندہ کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے''۔ (سنن نسائی حدیث: 3391)

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نماز بوجھ نہیں بلکہ سکون کا ذریعہ ہے—اگر اسے صحیح روح کے ساتھ ادا کیا جائے۔

قرآن سے تعلق کی تجدید روحانی زندگی کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ قرآن صرف پڑھنے کی کتاب نہیں بلکہ سننے، سمجھنے اور جینے کی کتاب ہے۔ جب انسان روزانہ کچھ وقت قرآن کے ساتھ تنہائی میں گزارتا ہے تو اس کی سوچ، ترجیحات اور فیصلے آہستہ آہستہ بدلنے لگتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید کو شفا قرار دیتے ہیں:

یہ قرآن جو ہم نازل کر رہے ہیں مومنوں کے لئے تو سراسر شفا اور رحمت ہے۔ (سورۃ الإسراء: آیت 82)

یہ شفا صرف جسمانی نہیں بلکہ روحانی بھی ہے۔

روحانی احیا کا ایک اور اہم پہلو نیک صحبت ہے۔ انسان تنہا ایمان کی جنگ نہیں

جیت سکتا۔ اگر ارد گرد کا ماحول غفلت میں ہو تو ایمان کمزور پڑ جاتا ہے، اور اگر صحبت صالح ہو تو ایمان مضبوط ہوتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، لہٰذا تم میں سے ہر شخص کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے''۔ (سنن ابی داود حدیث:4833)

یہ اصول آج بھی اتنا ہی سچا ہے جتنا چودہ سو سال پہلے تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ روحانی خلا کا علاج باہر نہیں بلکہ اندر ہے۔ دنیا کی کوئی کامیابی، کوئی تعلق، کوئی سہولت اس خلا کو مستقل طور پر نہیں بھر سکتی، جب تک دل اللہ کی طرف واپس نہ لوٹے۔ توبہ، ذکر، نماز، قرآن اور نیک صحبت — یہ سب وہ راستے ہیں جو ایمان کی حرارت کو دوبارہ زندہ کرتے ہیں۔

(ایمان کی حفاظت، روحانی زوال سے بچاؤ، اور زندہ ایمان والی زندگی)

ایمان کوئی جامد شے نہیں کہ ایک بار حاصل ہو جائے تو ہمیشہ محفوظ رہے۔ اسلام میں ایمان کو زندہ حقیقت قرار دیا گیا ہے — جو بڑھتا بھی ہے، گھٹتا بھی ہے؛ مضبوط بھی ہوتا ہے، کمزور بھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن وسنت میں ایمان کی حفاظت پر بار بار زور دیا گیا ہے، کیونکہ جو چیز زندہ ہو، اسے مسلسل نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔

قرآنِ مجید میں اہلِ ایمان کی ایک مستقل دعا نقل کی گئی ہے:

اے پروردگار جب تو نے ہمیں ہدایت بخشی ہے تو اس کے بعد ہمارے دلوں میں کجی نہ پیدا کر دیجیو اور ہمیں اپنے ہاں سے نعمت عطا فرما تو تو بڑا عطا فرمانے والا ہے۔ (سورۃ آل عمران: آیت 8)

یہ دعا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ہدایت کے بعد بھی دل کے پھسلنے کا خطرہ باقی رہتا ہے، اس لیے حفاظت ضروری ہے۔

ایمان کی حفاظت کا پہلا اصول غفلت سے بچاؤ ہے۔ غفلت وہ کیفیت ہے جس میں انسان گناہ بھی کرتا ہے، عبادت بھی چھوڑتا ہے، مگر دل میں خطرے کا احساس نہیں رہتا۔ یہی غفلت آہستہ آہستہ دین سے دوری کو معمول بنا دیتی ہے۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے غفلت کو سخت الفاظ میں بیان کیا ہے:

اور ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لیے پیدا کیے ہیں۔ ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ بالکل چارپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے۔ یہی وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ (سورۃ الأعراف: آیت 179)

یہ آیت بتاتی ہے کہ غفلت صرف لاعلمی نہیں بلکہ دل کی موت کا راستہ ہے۔

ایمان کی حفاظت کا دوسرا اصول عبادات میں تسلسل ہے، خواہ مقدار کم ہو مگر دوام ہو۔

عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کون سا عمل اللہ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے؟ فرمایا کہ جس پر ہمیشگی کی جائے، خواہ وہ تھوڑی ہی ہو اور فرمایا نیک کام کرنے میں اتنی ہی تکلیف اٹھاؤ جتنی طاقت ہے (جو ہمیشہ نبھ سکے)۔ (صحیح البخاری حدیث: 6465)

یہ حدیث ہمیں سکھاتی ہے کہ ایمان کو زندہ رکھنے کے لیے بڑے انقلابی اعمال نہیں بلکہ مسلسل چھوٹے اعمال زیادہ مؤثر ہوتے ہیں۔

جو شخص نماز، ذکر، قرآن اور دعا کو اپنی روزمرہ زندگی کا مستقل حصہ بنا لیتا ہے، اس کا ایمان کمزور ضرور ہو سکتا ہے مگر ختم نہیں ہوتا۔ یہی مستقل رشتہ انسان کو بڑے زوال سے بچا لیتا ہے۔

ایمان کی حفاظت کا تیسرا اہم اصول خود احتسابی (محاسبۂ نفس) ہے۔ جب انسان خود سے سوال کرنا چھوڑ دے — کہ میں کہاں کھڑا ہوں؟ میرا دل کس طرف جا رہا ہے؟ — تو زوال خاموشی سے شروع ہو جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ کا مشہور قول ہے:

''اپنا حساب خود لو، اس سے پہلے کہ تمہارا حساب لیا جائے۔''

یہ اصول ایمان کی حفاظت کی بنیاد ہے۔

روحانی زوال سے بچاؤ کا ایک اہم ذریعہ گناہ کو معمولی نہ سمجھنا ہے۔ جب گناہ چھوٹا لگنے لگے، اور توبہ مؤخر ہونے لگے، تو دل آہستہ آہستہ سیاہ پڑنے لگتا ہے۔

یعنی مومن گناہ کو پہاڑ کی طرح دیکھتا ہے، جبکہ غافل شخص اسے معمولی سمجھتا ہے۔

ایمان کی حفاظت کا ایک اور اہم اصول صحیح ترجیحات ہیں۔ اگر دنیا زندگی کا مرکز بن جائے اور آخرت حاشیہ — تو ایمان کمزور ہو جائے گا۔ مگر اگر آخرت مرکز میں رہے اور دنیا ذریعہ — تو ایمان مضبوط رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں کامیاب انسان کی تعریف یوں کی ہے:

مگر تم لوگ تو دنیا کی زندگی کو اختیار کرتے ہو۔ حالانکہ آخرت بہت بہتر اور پائندہ تر ہے۔(سورۃ الأعلیٰ: آیات 16–17)

یہ آیات ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ اصل خسارہ ترجیحات کے بگڑنے سے ہوتا ہے۔

زندہ ایمان والی زندگی کی سب سے نمایاں علامت یہ ہے کہ دین زندگی کو چلاتا ہے، زندگی دین کو نہیں۔ فیصلے خواہ مشکل ہوں، نقصان کا اندیشہ ہو، یا ماحول مخالفت کرے—ایمان انسان کو سیدھا رکھتا ہے، کیونکہ وہ اللہ پر اعتماد کرتا ہے، نہ کہ صرف حالات پر۔

قرآنِ مجید فرماتا ہے:

جن کی یہ حالت ہے کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے پھرتے ہیں، کیا ان کے پاس عزت کی تلاش میں جاتے ہیں؟ (تو یاد رکھیں کہ) عزت تو ساری کی ساری اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے۔ (سورۃ النساء: آیت 139)

یعنی عزت، طاقت اور کامیابی سب اللہ کے ہاتھ میں ہے—یہ یقین ایمان کو زندہ رکھتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں دین سے دوری کا ایک بڑا سبب روحانی غفلت اور ایمان کی کم ہوتی حرارت ہے۔ جب دل زندہ نہ رہے، عبادات کمزور پڑ جائیں، اور اللہ سے تعلق رسمی ہو جائے—تو دین زندگی سے ہٹنے لگتا ہے۔ مگر اسلام کی خوبصورتی یہ ہے کہ واپسی ہر وقت ممکن ہے۔

توبہ، ذکر، نماز، قرآن، خود احتسابی، نیک صحبت اور درست ترجیحات—یہ سب مل کر ایک ایسا مضبوط حصار بناتے ہیں جو ایمان کو زوال سے بچاتا ہے اور انسان کو دوبارہ اس کے رب سے جوڑ دیتا ہے۔

باب 10

خاندانی نظام کی کمزوری اور دینی تربیت کا فقدان

(خاندان کی دینی اہمیت، اسلامی تصورِ خاندان، اور دین کی منتقلی میں اس کا کردار)

اسلام میں دین کی منتقلی کا پہلا، فطری اور سب سے مضبوط ذریعہ خاندان ہے۔ نہ مدرسہ سب سے پہلے آتا ہے، نہ اسکول، نہ مسجد — بلکہ ماں کی گود، باپ کا رویہ اور گھر کا ماحول وہ پہلی درسگاہ ہے جہاں بچے کا ایمان، اخلاق اور زندگی کا زاویہ تشکیل پاتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ مجید میں خاندان کو دین کی حفاظت کا مرکز قرار دیا ہے:

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں، اس پر سخت دل، بہت مضبوط فرشتے مقرر ہیں، جو اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے جو وہ انھیں حکم دے اور وہ کرتے ہیں جو حکم دیے جاتے ہیں۔ (سورۃ التحریم: آیت 6)

یہ آیت واضح اعلان ہے کہ ایمان کی ذمہ داری صرف فرد تک محدود نہیں بلکہ اہلِ خانہ تک پھیلی ہوئی ہے۔

اس آیت میں ''بچاؤ'' کا لفظ محض زبانی نصیحت نہیں بلکہ عملی تربیت، نگرانی اور مثال کا تقاضا کرتا ہے۔ یعنی والدین کا کردار صرف کفالت تک محدود نہیں بلکہ دینی تشکیل (Religious Formation) تک پھیلا ہوا ہے۔

اسلامی تصورِ خاندان محض ایک سماجی معاہدہ نہیں بلکہ تربیتی ادارہ ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''آگاہ ہو جاؤ تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک

سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ پس امام (امیر المؤمنین) لوگوں پر نگہبان ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہوگا۔ مرد اپنے گھر والوں کا نگہبان ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہوگا اور عورت اپنے شوہر کے گھر والوں اور اس کے بچوں کی نگہبان ہے اور اس سے ان کے بارے میں سوال ہوگا اور کسی شخص کا غلام اپنے سردار کے مال کا نگہبان ہے اور اس سے اس کے بارے میں سوال ہوگا۔ آگاہ ہو جاؤ کہ تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے بارے میں پرسش ہوگی۔" (صحیح البخاری حدیث:7138)

اس حدیث میں والدین کو واضح طور پر ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ اپنی رعیت — یعنی اولاد — کی دینی و اخلاقی حالت کے نگہبان ہیں۔

جب خاندان مضبوط ہوتا ہے تو معاشرہ خود بخود سنبھل جاتا ہے، اور جب خاندان کمزور پڑ جائے تو بہترین تعلیمی نظام اور بہترین مذہبی ادارے بھی اس خلا کو مکمل طور پر پُر نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں دین سے دوری کا ایک بڑا سبب خاندانی تربیت کا بکھر جانا ہے۔

اسلامی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ صحابہؓ کے گھروں میں دین پڑھایا نہیں جاتا تھا بلکہ جیا جاتا تھا۔ بچے نماز کے احکامات سے پہلے نماز کا منظر دیکھتے تھے، سچائی کی تلقین سے پہلے سچائی کا عملی نمونہ دیکھتے تھے، اور اللہ کے خوف سے پہلے اللہ پر اعتماد کو محسوس کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو محض نیکی کا حکم نہیں دیتے تھے بلکہ خود اس پر سبقت لے جاتے تھے — تاکہ تربیت زبان سے نہیں بلکہ کردار سے ہو۔

خاندان میں دین کی منتقلی کا سب سے مؤثر ذریعہ عملی مثال ہے۔ اگر والدین خود نماز میں سستی کریں، حلال و حرام میں سمجھوتہ کریں، جھوٹ، غیبت یا ناانصافی کو معمول سمجھیں — تو بچے کے لیے دین محض ایک نصیحت بن کر رہ جاتا ہے، زندگی کا اصول نہیں بنتا۔

اللہ تعالیٰ نے اسی تضاد کو ناپسند فرمایا:

اللہ کے نزدیک ناراض ہونے کے اعتبار سے بڑی بات ہے کہ تم وہ کہو جو تم نہیں کرتے۔ (سورۃ الصّف: آیت 3)

جدید دور میں خاندانی نظام کو سب سے زیادہ نقصان طرزِ زندگی کی تبدیلی سے پہنچا ہے۔ مصروفیات، مادہ پرستی، اسکرین کلچر اور معاشی دوڑ نے گھر کے اندر مکالمہ، وقت اور مشترکہ دینی فضا کو کمزور کر دیا ہے۔ والدین اولاد کے ساتھ وقت تو گزارتے ہیں، مگر اکثر بغیر توجہ، بغیر گفتگو اور بغیر رہنمائی کے۔

نتیجتاً بچے دین سیکھتے ہیں سوشل میڈیا سے، اقدار لیتے ہیں ڈراموں اور فلموں سے، اور زندگی کا مقصد بناتے ہیں ماحول سے — نہ کہ والدین سے۔ یہی وہ لمحہ ہے جہاں دین سے دوری خاندانی ناکامی میں بدل جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا عمل بھی ختم ہو جاتا ہے سوائے تین عمل کے (جن سے اسے مرنے کے بعد بھی فائدہ پہنچتا ہے) ایک صدقہ جاریہ، دوسرا علم جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں، تیسرا نیک اور صالح بیٹا جو اس کے لیے دعا کرتا رہے“۔ (سنن نسائی حدیث: 3681)

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اولاد کی دینی تربیت محض دنیاوی ذمہ داری نہیں بلکہ آخرت کی سرمایہ کاری ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں دین سے دوری کا ایک بنیادی سبب خاندان کا بطور دینی ادارہ کمزور ہو جانا ہے۔ جب گھر میں دین گفتگو، ماحول اور عمل کی صورت میں موجود نہ رہے—تو مسجد، مدرسہ اور اسکول سب ثانوی ہو جاتے ہیں۔

(والدین کی ترجیحات، تربیتی غفلت، اور محبت و نظم کا عدم توازن)

خاندانی نظام کی کمزوری ہمیشہ ٹوٹے ہوئے گھروں سے پیدا نہیں ہوتی۔ اکثر اوقات گھر موجود ہوتے ہیں، والدین موجود ہوتے ہیں، سہولتیں بھی موجود ہوتی ہیں— مگر اس کے باوجود اولاد دین سے دور ہو جاتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ والدین کی ترجیحات بدل چکی ہوتی ہیں۔

آج کے بہت سے مسلمان والدین اولاد کے لیے سب کچھ چاہتے ہیں—اچھی تعلیم، بہترین اسکول، محفوظ مستقبل، مضبوط کیریئر— مگر یہ سب دین سے کٹے ہوئے اہداف بن چکے ہیں۔ دین اگر شامل بھی ہوتا ہے تو ایک اضافی خوبی (Extra Skill) کے طور پر، نہ کہ زندگی کی بنیاد کے طور پر۔

قرآنِ مجید نے اسی ترجیحی بگاڑ کی طرف توجہ دلائی ہے:

لیکن تم تو دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ (سورۃ الأعلیٰ: آیت 16)

یہ ترجیح اکثر نیت میں نہیں بلکہ عملی فیصلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔

والدین اکثر یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اولاد کو "آزاد" چھوڑ دیں گے تو وہ خود دین سیکھ لے گی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بچوں کی فطرت تربیت مانگتی ہے، خلا نہیں۔ اگر یہ خلا والدین نہ بھریں تو معاشرہ، میڈیا اور ماحول ضرور بھر دیتے ہیں—اور اکثر وہ دین کے حق میں نہیں ہوتے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت (اللہ پر ایمان اور اچھائی کی محبت) پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔'' (صحیح مسلم حدیث:6755)

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ فطرت توحید پر ہے، مگر سمت والدین دیتے ہیں۔ اگر سمت واضح نہ ہو تو فطرت بکھر جاتی ہے۔

تربیتی غفلت کی ایک بڑی صورت یہ ہے کہ والدین وقت دینے کو تربیت سمجھ لیتے ہیں، جبکہ اصل ضرورت توجہ (Attention) کی ہوتی ہے۔ بچے کے ساتھ بیٹھ جانا، موبائل ہاتھ میں ہو، یا خاموشی سے وقت گزار لینا — یہ تربیت نہیں۔ تربیت مکالمہ مانگتی ہے، سوال سننے کا حوصلہ مانگتی ہے، اور رہنمائی کا تسلسل مانگتی ہے۔

اسلامی تربیت کا طریقہ حکم دینا نہیں بلکہ سمجھانا اور ساتھ چلنا ہے۔ قرآنِ مجید نے حضرت لقمانؑ کی تربیت کو بطور نمونہ پیش کیا ہے، جہاں وہ اپنے بیٹے کو مسلسل مکالمے کے انداز میں نصیحت کرتے ہیں:

اور جب لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا، جب کہ وہ اسے نصیحت کر رہا تھا اے میرے چھوٹے بیٹے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا، بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔ (سورۃ لقمان آیت 13)

یہ خطاب محبت، قربت اور رہنمائی — تینوں کو یکجا کرتا ہے۔

والدین کی ایک اور بڑی کوتاہی یہ ہے کہ وہ دین کو سزا یا دباؤ کے ذریعے نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ نماز نہ پڑھنے پر سختی، سوال کرنے پر ڈانٹ، اور اختلاف پر خاموشی — یہ سب دین سے قربت کے بجائے نفرت یا بے نیازی پیدا کرتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کا تربیتی انداز اس کے بالکل برعکس تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:
''آسانی پیدا کرو، تنگی نہ پیدا کرو، لوگوں کو تسلی اور تشفی دو نفرت نہ دلاؤ۔'' (صحیح البخاری حدیث:6125)

یہ اصول خاص طور پر بچوں کی دینی تربیت میں نہایت اہم ہے۔

دوسری طرف ایک انتہا یہ بھی ہے کہ والدین محبت کے نام پر حدود ختم کر دیتے ہیں۔ ہر خواہش پوری کرنا، ہر غلطی نظر انداز کرنا، اور ہر سوال پر **''جو تمہارا دل چاہے''** کہ دینا—یہ تربیت نہیں بلکہ بے سمتی ہے۔ اسلام محبت اور نظم دونوں کا مطالبہ کرتا ہے۔

جب محبت کے بغیر نظم ہو تو بغاوت پیدا ہوتی ہے، اور جب نظم کے بغیر محبت ہو تو لاپروائی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے گھروں میں بچے یا تو دین سے خوف زدہ ہوتے ہیں یا دین سے بے نیاز—جبکہ مطلوب یہ ہے کہ وہ دین سے محبت اور احترام دونوں محسوس کریں۔

ایک اور سنگین مسئلہ یہ ہے کہ والدین خود دینی نمونہ نہیں بنتے۔ وہ اولاد کو نماز، سچائی اور حلال کی نصیحت تو کرتے ہیں، مگر خود عمل میں کوتاہی کرتے ہیں۔ بچہ الفاظ نہیں، رویّے یاد رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس تضاد کو سخت ناپسند فرمایا:

کیا لوگوں کو بھلائیوں کا حکم کرتے ہو؟ اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو (سورۃ البقرہ: آیت 44)

خلاصہ یہ ہے کہ خاندانی تربیت کی ناکامی اکثر نیت کی خرابی نہیں بلکہ ترجیحات کی غلطی، توجہ کی کمی، اور توازن کے فقدان سے پیدا ہوتی ہے۔ والدین اولاد سے محبت بھی

کرتے ہیں، مگر سمت نہیں دیتے؛ خواہشیں پوری کرتے ہیں، مگر اقدار منتقل نہیں کرتے؛ اور مستقبل بناتے ہیں، مگر مقصد نہیں دیتے۔

(والدین و اولاد کے درمیان فکری خلا، نوجوانوں کے سوالات، اور خاندانی خاموشی)

ہر نسل اپنے ساتھ سوالات لے کر پیدا ہوتی ہے۔ یہ سوالات فطرت کے خلاف نہیں بلکہ فطرت کا تقاضا ہوتے ہیں۔ مسئلہ سوال کرنے میں نہیں، بلکہ اس بات میں ہے کہ سوال کہاں، کس سے اور کس ماحول میں پوچھا جائے۔ آج مسلمانوں میں دین سے دوری کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ نوجوانوں کے بنیادی دینی سوالات گھروں میں سنے ہی نہیں جاتے۔

جدید مسلم خاندان میں ایک خاموش مگر گہرا فکری خلا پیدا ہو چکا ہے۔ والدین ایک ایسی دنیا میں جوان ہوئے جہاں دین معاشرتی طور پر غالب تھا، سوال کم تھے اور اطاعت زیادہ۔ جبکہ آج کی نسل ایک ایسی دنیا میں جوان ہو رہی ہے جہاں معلومات کی یلغار ہے، سوالات عام ہیں، اور ہر عقیدے کو چیلنج کیا جا رہا ہے۔ یہ فرق اگر سمجھا نہ جائے تو نسلی تصادم جنم لیتا ہے۔

قرآنِ مجید نے انسانی فطرت کو سوال کرنے والی فطرت قرار دیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا سوال، حضرت موسیٰؑ کا استفسار، اور صحابہؓ کے سوالات — یہ سب اس بات کی دلیل ہیں کہ سوال ایمان کی نفی نہیں بلکہ فہم کی تلاش ہوتا ہے۔

قرآن میں آتا ہے:

پس اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے دریافت کر لو۔ (سورۃ النحل: آیت 43)

یہ آیت سوال کرنے کی حوصلہ افزائی ہے، نہ کہ ممانعت۔

آج کا نوجوان یہ سوال کرتا ہے:

- اگر اسلام حق ہے تو مسلمان پیچھے کیوں ہیں؟
- اللہ ہے تو دنیا میں ظلم کیوں ہے؟
- عبادت میری عملی زندگی میں کیا بدلتی ہے؟
- حرام و حلال آج کے نظام میں کیسے ممکن ہے؟

یہ سوالات بغاوت نہیں بلکہ سمجھنے کی کوشش ہیں۔ مگر افسوس کہ بہت سے گھروں میں ان سوالات کا جواب دلیل سے نہیں بلکہ خاموشی، ڈانٹ یا خوف سے دیا جاتا ہے۔ یہی رویہ نوجوان کو گھر سے نہیں بلکہ انٹرنیٹ، سوشل میڈیا اور غیر معتبر ذرائع کی طرف دھکیل دیتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا طرزِ تربیت اس کے بالکل برعکس تھا۔ صحابہ کھل کر سوال کرتے تھے، حتیٰ کہ بعض اوقات بہت نازک سوالات بھی — اور آپ ﷺ انہیں نہ جھڑکتے تھے، نہ شرمندہ کرتے تھے۔

ایک نوجوان کا واقعہ مشہور ہے جو آپ ﷺ کے پاس آیا اور ایک گناہ کی اجازت مانگی۔ آپ ﷺ نے اسے ڈانٹنے کے بجائے مکالمے کے ذریعے اس کے دل کو قائل کیا۔

یہ واقعہ ہمیں بتاتا ہے کہ دل دلیل اور محبت سے بدلتے ہیں، دباؤ سے نہیں۔

فکری خلا کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ والدین اکثر یہ سمجھتے ہیں کہ دین سکھانا علماء کا کام ہے۔ وہ خود دینی مکالمے سے کتراتے ہیں، یا خود کو اس قابل نہیں سمجھتے۔ نتیجتاً گھر میں دین ایک زندہ گفتگو کے بجائے خاموش موضوع بن جاتا ہے۔

حالانکہ قرآنِ مجید میں حضرت لقمانؑ کا اسلوب ہمیں سکھاتا ہے کہ دینی گفتگو کے لیے عالم ہونا شرط نہیں، فکرمند اور مخلص ہونا کافی ہے:

اے میرے پیارے بیٹے! تو نماز قائم رکھنا، اچھے کاموں کی نصیحت کرتے رہنا، برے کاموں سے منع کیا کرنا اور جو مصیبت تم پر آجائے صبر کرنا (یقین مانو) کہ یہ بڑے تاکیدی کاموں میں سے ہے۔ (سورۃ لقمان: آیت 17)

یہ مکالمہ باپ اور بیٹے کے درمیان مسلسل، محبت بھرے اور حکمت والے انداز میں چلتا ہے۔

جب گھر میں دینی مکالمہ نہ ہوتو نوجوان کے ذہن میں دین ایک غیر متعلق یا کمزور نظام بننے لگتا ہے۔ وہ دین کو عملی زندگی سے کٹا ہوا سمجھتا ہے، کیونکہ اس نے کبھی گھر میں یہ نہیں دیکھا کہ دین پر بات کی جائے، اختلاف سنا جائے، یا سوال کا جواب تلاش کیا جائے۔

ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ بعض والدین نوجوان کے سوال کو اپنی بے عزتی یا خطرہ سمجھ لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سوال اٹھانا بدتمیزی یا نافرمانی ہے۔ اس سوچ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نوجوان خاموش ہو جاتا ہے — مگر اس کا دل مطمئن نہیں ہوتا۔ خاموش دل زیادہ خطرناک ہوتا ہے، کیونکہ وہ جواب باہر تلاش کرتا ہے۔

قرآنِ مجید نے منافقین کی ایک علامت یہی بتائی ہے کہ وہ دل میں سوال رکھتے ہیں مگر سچائی کی تلاش نہیں کرتے:

ان کے دلوں میں بیماری تھی اللہ تعالیٰ نے انہیں بیماری میں مزید بڑھا دیا اور ان کے جھوٹ کی وجہ سے ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (سورۃ البقرہ: آیت 10)

یہ بیماری سوال کی نہیں بلکہ رہنمائی سے محرومی کی ہے۔

خاندان میں دینی مکالمے کی کمی کا ایک اور نتیجہ یہ ہے کہ اولاد دین کو جذباتی یا

ثقافتی شناخت سمجھنے لگتی ہے، نہ کہ فکری اور عملی نظام۔ وہ دین کو تہوار، رسم یا وراثت کے طور پر تو قبول کر لیتی ہے، مگر اسے اپنی عقل اور زندگی کے فیصلوں سے جوڑ نہیں پاتی۔

نبی کریم ﷺ نے ایمان کو دل اور زبان دونوں کا عمل قرار دیا — یعنی سمجھنا، ماننا اور جینا۔

یہ توازن اگر گھر میں پیدا نہ ہو تو باہر کہیں اور پیدا ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں دین سے دوری کا ایک اہم سبب خاندانی مکالمے کی خاموشی ہے۔ جب سوال دبائے جائیں، گفتگو نہ ہو، اور دین پر بات چیت نہ ہو — تو نئی نسل دین سے بغاوت نہیں کرتی، بلکہ خاموشی سے دور ہو جاتی ہے۔

(میڈیا، اسکرین کلچر، بیرونی فکری اثرات اور گھر کے اندر دینی ماحول کی شکست)

تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کسی قوم کے گھروں میں فکری قیادت کمزور پڑی، تو باہر کی طاقتیں خاموشی سے اندر داخل ہو گئیں۔ آج کے مسلم گھر میں یہ داخلہ تلوار، فوج یا قانون کے ذریعے نہیں ہوا، بلکہ اسکرین کے ذریعے ہوا ہے — موبائل، ٹی وی، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے راستے۔

یہ اسکرین کلچر محض تفریح نہیں رہا، بلکہ ایک خاموش استاد بن چکا ہے جو اقدار سکھاتا ہے، ترجیحات بناتا ہے، اور زندگی کا مقصد متعین کرتا ہے — وہ بھی والدین کی اجازت کے بغیر۔

قرآنِ مجید نے اس خطرے کو اصولی انداز میں پہلے ہی واضح کر دیا تھا:

اور شیطانی راہ پر نہ چلو، وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ (سورۃ البقرہ: آیت 168)

شیطان کے قدم ہمیشہ واضح نہیں ہوتے، وہ آہستہ آہستہ داخل ہوتا ہے — بالکل

اسی طرح جیسے میڈیا اقدار بدلتا ہے، بغیر یہ احساس دلائے کہ ایمان کمزور ہو رہا ہے۔

جدید میڈیا کی سب سے خطرناک خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کو دین سے الگ کر کے دکھاتا ہے۔ فلمیں، ڈرامے، سوشل کانٹینٹ — سب ایک ایسا ماڈل پیش کرتے ہیں جس میں کامیابی، خوشی، محبت اور آزادی کا تصور اللہ، عبادت اور آخرت کے بغیر مکمل دکھایا جاتا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں نوجوان کے دل میں سوال پیدا ہوتا ہے:

"اگر ان لوگوں کی زندگی میں دین کے بغیر سب کچھ چل رہا ہے، تو مجھے دین کی ضرورت کیوں ہے؟"

یہ سوال کسی کتاب سے نہیں، بلکہ اسکرین سے سیکھا جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، لہٰذا تم میں سے ہر شخص کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے"۔ (سنن ابی داود حدیث: 4833)

آج کا سب سے قریبی "دوست" اکثر اسکرین ہے — جو خاموشی سے اثر انداز ہو رہا ہے۔

اسکرین کلچر نے خاندانی تربیت کے تین بنیادی ستون گرا دیے ہیں:

1. وقت — خاندان کے ساتھ بیٹھنے کا وقت ختم
2. مکالمہ — بات چیت کی جگہ خاموش اسکرولنگ
3. مثال — والدین خود بھی اسی اسکرین کے اسیر

جب والدین خود اسکرین کے سامنے بے بس ہوں، تو وہ اولاد کے لیے اخلاقی اتھارٹی کھو دیتے ہیں۔ بچہ وہی کرتا ہے جو وہ دیکھتا ہے، نہ کہ وہ جو اسے کہا جاتا ہے۔

قرآنِ مجید نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا:

یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے (سورۃ الأحزاب: آیت 21)

یعنی نمونہ سب سے طاقتور ذریعہ ہے—اور جب نمونہ کمزور ہو جائے تو نصیحت بے اثر ہو جاتی ہے۔

اسکرین کے ذریعے جو اقدار منتقل ہو رہی ہیں، ان میں چند نمایاں یہ ہیں:

- آزادی بغیر ذمہ داری
- خواہش بغیر حدود
- محبت بغیر نکاح
- کامیابی بغیر اخلاق
- اظہار بغیر حیا

یہ سب تصورات براہِ راست دین سے ٹکراتے ہیں، مگر چونکہ یہ تفریح کے پیکج میں آتے ہیں، اس لیے ان کا زہر محسوس نہیں ہوتا۔

قرآنِ مجید نے اسی کیفیت کو یوں بیان کیا:

مرغوب چیزوں کی محبت لوگوں کے لئے مزین کر دی گئی ہے، جیسے عورتیں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے جمع کئے ہوئے خزانے اور نشاندار گھوڑے اور چوپائے اور کھیتی، یہ

دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور لوٹنے کا اچھا ٹھکانا تو اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ (سورۃ آل عمران: آیت 14)

خواہشات کو خوبصورت بنا کر پیش کرنا — یہی ہر دور کا فتنہ رہا ہے، بس شکل بدل گئی ہے۔

ایک اہم پہلو یہ ہے کہ والدین اکثر یہ سمجھتے ہیں کہ کنٹرول ختم ہو چکا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"اب بچوں کو روکا نہیں جا سکتا"

"یہ زمانے کا تقاضا ہے"

"ہر گھر میں یہی ہو رہا ہے"

یہ جملے دراصل ذمہ داری سے دستبرداری کی علامت ہوتے ہیں، حالانکہ اسلام ذمہ داری حالات سے مشروط نہیں کرتا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "آگاہ ہو جاؤ تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔" (صحیح البخاری حدیث: 7138)

ذمہ داری تب بھی رہتی ہے جب ماحول مشکل ہو — بلکہ تب زیادہ ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ خاندانی نظام کی کمزوری میں میڈیا اور اسکرین کلچر نے فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ یہ وہ بیرونی قوت ہے جو گھر کے اندر بیٹھ کر دین، حیا، اطاعت اور روحانیت کو آہستہ آہستہ غیر متعلق بناتی جا رہی ہے — اور والدین اکثر اس کا ادراک تب کرتے ہیں جب بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

(گھر میں دینی ماحول کی بحالی، والدین کے لیے عملی حکمتِ عملیاں، اور نسلوں کی واپسی کا راستہ)

اسلام نا اُمیدی کا مذہب نہیں۔ اگر خاندان بکھر چکا ہو، اگر اولاد دین سے دور ہو گئی ہو، اگر گھر میں اسکرین غالب آ چکی ہو— تب بھی واپسی ممکن ہے۔ کیونکہ اسلام انسان کو ماضی کی غلطیوں سے نہیں، موجودہ نیت اور آئندہ عمل سے جانچتا ہے۔

قرآنِ مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(اے پیغمبر میری طرف سے لوگوں کو) کہہ دو کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہونا۔ خدا تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ (اور) وہ تو بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورۃ الزمر: آیت 53)

یہ آیت صرف فرد کے لیے نہیں بلکہ خاندانوں اور نسلوں کے لیے بھی امید کا دروازہ ہے۔

خاندانی دینی اصلاح کا پہلا اصول یہ ہے کہ تبدیلی والدین سے شروع ہوتی ہے، بچوں سے نہیں۔ جب والدین خود بدلنے کو تیار نہ ہوں تو تربیت محض خواہش بن کر رہ جاتی ہے۔ بچوں کو کہنے سے پہلے، والدین کو خود سے یہ سوال کرنا ہوتا ہے:

کیا میرا گھر واقعی دین کو ترجیح دیتا ہے؟

کیا میری زندگی میں اللہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے؟

کیا میری روزمرہ گفتگو، مصروفیات اور فیصلے دین کی گواہی دیتے ہیں؟

قرآنِ مجید نے اسی اصول کو یوں بیان کیا:

کسی قوم کی حالت اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اسے نہ بدلیں جوان کے دلوں میں ہے۔ (سورۃ الرعد: آیت 11)

گھر میں دینی ماحول کی بحالی کا دوسرا بنیادی قدم عبادت کا اجتماعی رنگ ہے۔ نماز، دعا، ذکر اور قرآن اگر صرف انفرادی اعمال بن جائیں تو گھر کی فضا نہیں بدلتی۔ مگر جب نماز باجماعت گھر میں پڑھی جائے، دعا مل کر مانگی جائے، اور قرآن کبھی کبھار مل بیٹھ کر سنا جائے — تو دین خاموشی سے دلوں میں اترنے لگتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا معمول تھا کہ آپ ﷺ گھر میں بھی عبادت کو زندہ رکھتے تھے، حتیٰ کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ گھر کے کام بھی کرتے تھے اور اللہ کو یاد بھی رکھتے تھے۔ یہ امت کے لیے پیغام ہے کہ دین صرف مسجد کا نہیں، گھر کا بھی نظام ہے۔

تیسرا اہم اصول دینی مکالمے کی بحالی ہے۔ لیکچر نہیں، مکالمہ۔ حکم نہیں، گفتگو۔ سوال سے فرار نہیں، سوال کا استقبال۔ اگر اولاد دین پر بات کرنا شروع کرے یہاں تک کہ اگر اس کے سوال سخت ہوں — تو یہ دین کی شکست نہیں بلکہ واپسی کا دروازہ ہوتا ہے۔

حضرت علیؓ کا قول ہے:

''اولاد کو اپنے زمانے کے مطابق سمجھاؤ''

اس کا مطلب یہ نہیں کہ دین بدلا جائے، بلکہ دین کو اس زبان میں بیان کیا جائے جو نسل سمجھ سکے۔

گھر میں دینی ماحول کی بحالی کا ایک نہایت عملی قدم یہ ہے کہ اسکرین کو بے لگام نہ رہنے دیا جائے۔ اسلام مکمل پابندی نہیں بلکہ حدود سکھاتا ہے۔ اسکرین وقت، مواد اور مقصد — تینوں پر شعوری نگرانی ضروری ہے۔ مگر یہ نگرانی حکم کے ذریعے نہیں بلکہ مشترکہ

اصولوں کے ذریعے ہو۔

جب والدین خود اسکرین کے غلام بنے رہیں، تو اولاد پر کوئی اصول لاگو نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اصلاح کا پہلا مرحلہ پھر وہی ہے: اپنی ذات۔

ایک اور بنیادی نکتہ یہ ہے کہ والدین دین کو صرف "نصیحت" نہ بنائیں بلکہ زندگی کا فائدہ بنا کر پیش کریں۔ جب بچہ دیکھے کہ دین والدین کو صبر دیتا ہے، فیصلوں میں توازن دیتا ہے، مشکل میں سہارا بنتا ہے — تو وہ دین کو بوجھ نہیں بلکہ طاقت سمجھے گا۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا ہے:

جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت، لیکن باایمان ہو تو ہم اسے یقیناً نہایت بہتر زندگی عطا فرمائیں گے۔ اور ان کے نیک اعمال کا بہتر بدلہ بھی انہیں ضرور ضرور دیں گے۔ (سورۃ النحل: آیت 97)

یعنی ایمان اچھی زندگی دیتا ہے — یہ پیغام گھر کے اندر نظر آنا چاہیے۔

ایک نہایت اہم عملی پہلو یہ ہے کہ والدین کمال نہیں، تسلسل اختیار کریں۔ ہر دن مکمل اسلامی ماحول ممکن نہیں، مگر ہر دن ایک چھوٹا قدم ممکن ہے۔ کبھی ایک نماز، کبھی ایک گفتگو، کبھی ایک دعا — یہی چھوٹے عمل وقت کے ساتھ بڑے نتائج پیدا کرتے ہیں۔

عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کون سا عمل اللہ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے؟ فرمایا کہ جس پر ہمیشگی کی جائے، خواہ وہ تھوڑی ہی ہو اور فرمایا نیک کام کرنے میں اتنی ہی تکلیف اٹھاؤ جتنی طاقت ہے (جو ہمیشہ نبھ سکے)۔ (صحیح البخاری حدیث:6465)

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں دین سے دوری کا ایک بڑا سبب خاندانی نظام کا

بطور دینی ادارہ ناکام ہو جانا ہے۔ مگر یہ ناکامی حتمی نہیں۔ گھر اب بھی اصلاح کی سب سے مضبوط بنیاد ہے، بشرطیکہ والدین خود کو ذمہ دار سمجھیں، خاموشی توڑیں، اور دین کو دوبارہ گھر کی فضا میں زندہ کریں۔

یہی گھر اگر درست ہو جائے تو مدرسہ مضبوط ہو جاتا ہے، مسجد آباد ہو جاتی ہے، اور معاشرہ خود بخود سنبھلنے لگتا ہے۔

باب 11

تعلیمی نظام، اسکول اور دین سے دوری کے منظّم اسباب

(تعلیم کا مقصد، علم و ایمان کی جدائی، اور جدید تعلیمی فلسفے کا فکری اثر)

اسلام میں تعلیم محض معلومات حاصل کرنے کا نام نہیں بلکہ انسان سازی کا عمل ہے۔ علم کا مقصد صرف روزگار، ترقی یا سماجی حیثیت نہیں بلکہ اللہ کی معرفت، اخلاق کی اصلاح اور زندگی کی درست سمت متعین کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید کی پہلی وحی ''**اقرأ**'' سے شروع ہوئی— مگر رب کے نام کے ساتھ۔

قرآن فرماتا ہے:

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ (سورۃ العلق: آیت 1)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ علم جب رب کے نام سے کٹ جائے تو وہ روشنی کے بجائے اندھیرا بھی بن سکتا ہے۔

جدید تعلیمی نظام کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اس نے علم کو اقدار سے الگ کر دیا ہے۔ اسکول اور جامعات علم تو دیتی ہیں، مہارتیں تو سکھاتی ہیں، مگر یہ سوال نہیں اٹھاتیں کہ:

یہ علم کس مقصد کے لیے ہے؟

یہ طاقت کس اخلاقی دائرے میں استعمال ہوگی؟

یہ کامیابی کس جواب دہی کے ساتھ جڑی ہے؟

نتیجتاً ایک ایسا انسان تیار ہوتا ہے جو ذہین، باصلاحیت اور پُراعتماد تو ہوتا ہے— مگر روحانی طور پر خالی۔

قرآنِ مجید نے ایسے علم کی مثال یوں دی ہے:

یہ تو دنیا کی ظاہری زندگی کو جانتے ہیں۔ اور آخرت (کی طرف) سے غافل ہیں۔ (سورۃ الروم: آیت 7)

مسلم معاشروں میں تعلیمی نظام کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ دین اور دنیا کو دو الگ خانوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ایک طرف **"مذہبی تعلیم"** ہے — جسے اکثر غیر عملی یا ثانوی سمجھا جاتا ہے — اور دوسری طرف "اصل تعلیم" ہے جو کیریئر اور کامیابی کی ضامن سمجھی جاتی ہے۔

یہ تقسیم نہ قرآن میں ہے، نہ سیرت میں، نہ اسلامی تاریخ میں۔ اسلام میں علم ہمیشہ مقصدِ حیات سے جڑا ہوا رہا ہے۔ امام غزالی، ابنِ سینا، ابنِ خلدون — یہ سب عالم بھی تھے، مفکر بھی، اور دین سے جڑے ہوئے بھی۔

جدید نصاب کی ایک اور سنگین خرابی یہ ہے کہ وہ انسان کو مرکزِ کائنات بنا دیتا ہے۔ خدا، وحی اور آخرت یا تو نصاب سے غائب ہوتے ہیں یا محض ثقافتی حوالہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں انسان کی عقل، خواہش اور آزادی کو حتمی معیار بنا دیا جاتا ہے۔

قرآنِ مجید اس ذہنیت کو یوں بیان کرتا ہے:

کیا آپ نے اسے بھی دیکھا؟ جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے (سورۃ الجاثیہ: آیت 23)

جب خواہش معبود بن جائے تو علم ہدایت نہیں دیتا، بلکہ جواز فراہم کرتا ہے۔

اسکول اور جامعات میں دین سے دوری اکثر کھلی مخالفت کی صورت میں نہیں

آتی، بلکہ خاموش نظراندازی کی شکل میں آتی ہے۔

نماز کو ذاتی عمل کہا جاتا ہے،

اخلاق کو نسبتی (Relative) قرار دیا جاتا ہے،

اور حق و باطل کو ’’رائے کا فرق‘‘ بنادیا جاتا ہے۔

یہ فکری ماحول نوجوان کو یہ پیغام دیتا ہے کہ دین ایک نجی معاملہ ہے، جس کا اجتماعی، سماجی یا علمی فیصلوں سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی سوچ آگے چل کر سیکولر ذہن پیدا کرتی ہے — خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔

نبی کریم ﷺ نے علم کو ایمان سے جدا نہیں کیا۔ آپ ﷺ کی دعا تھی:

’’اے اللہ! میں اس علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو مفید اور نفع بخش نہ ہو‘‘۔ (سنن نسائی حدیث:5539)

یہ دعا واضح کرتی ہے کہ ہر علم فائدہ مند نہیں — وہی علم مفید ہے جو انسان کو اللہ کے قریب کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں دین سے دوری کا ایک بڑا، منظّم اور دیرپا سبب جدید تعلیمی نظام کا فکری ڈھانچہ ہے، جو علم کو ایمان سے، اور کامیابی کو اخلاق سے الگ کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ ایک ایسا مسلمان ہے جو تعلیم یافتہ تو ہے، مگر دین کو زندگی کے فیصلوں میں غیر متعلق سمجھتا ہے۔

(نصابِ تعلیم، اساتذہ کا فکری کردار، اور طالب علم کی ذہنی تشکیل)

کسی بھی تعلیمی نظام کا سب سے طاقتور ہتھیار اس کی عمارت، اس کی فیس یا اس

کے امتحانات نہیں ہوتے، بلکہ اس کا نصاب (Curriculum) ہوتا ہے۔نصاب یہ طے کرتا ہے کہ کیا پڑھایا جائے، کیا چھوڑ دیا جائے، اور کس زاویے سے حقیقت کو دیکھا جائے۔یہی نصاب خاموشی سے طالب علم کو یہ سکھاتا ہے کہ زندگی میں کیا اہم ہے اور کیا غیر اہم۔

مسلم معاشروں میں ایک المیہ یہ ہے کہ نصاب سے دین کو یا تو مکمل طور پر خارج کر دیا گیا ہے، یا اسے محض ایک اختیاری، غیر مؤثر مضمون بنا دیا گیا ہے۔دین کو زندگی کے مرکز کے بجائے ایک سائیڈ سبجیکٹ بنا دینا دراصل طالب علم کو یہ پیغام دینا ہے کہ دین اصل علم نہیں۔

قرآنِ مجید نے علم کی اس تقسیم کو رد کیا ہے:

بھلا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو نہیں رکھتے دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ (سورۃ الزمر: آیت 9)

یہاں علم سے مراد محض معلومات نہیں بلکہ وہ علم ہے جو انسان کو حقیقت سے جوڑے، مقصد دے اور اللہ کی پہچان کرائے۔

جدید نصاب کی ایک خطرناک خصوصیت یہ ہے کہ وہ تاریخ، سائنس، سماجیات اور فلسفے کو خالص مادّی اور سیکولر زاویے سے پیش کرتا ہے۔

- تاریخ میں تہذیبوں کے عروج و زوال کو اللہ کی سنتوں کے بجائے محض معاشی یا عسکری عوامل سے جوڑا جاتا ہے
- سائنس میں کائنات کو خالق کے بغیر ایک خودکار نظام کے طور پر پڑھایا جاتا ہے

- سماجیات میں اخلاق کو نسبتی (Relative) اور بدلنے والا تصور قرار دیا جاتا ہے

یہ سب مل کر طالب علم کے ذہن میں ایک ایسی دنیا بناتے ہیں جہاں اللہ غیر ضروری اور دین غیر متعلق نظر آنے لگتا ہے۔

قرآنِ مجید اس ذہنیت کی نشان دہی یوں کرتا ہے:

حالانکہ ان کو اس کی کچھ خبر نہیں۔ وہ صرف ظن پر چلتے ہیں۔ اور ظن یقین کے مقابلے میں کچھ کام نہیں آتا۔ (سورۃ النجم: آیت 28)

یعنی جب علم وحی سے کٹ جائے تو وہ قیاس اور گمان بن جاتا ہے۔

نصاب کے بعد دوسرا سب سے مؤثر عنصر استاد ہوتا ہے۔ استاد محض مضمون نہیں پڑھاتا، وہ طالب علم کو سوچنے کا طریقہ سکھاتا ہے۔ اگر استاد خود دین کو غیر سائنسی، غیر عملی یا ذاتی معاملہ سمجھتا ہو تو طالب علم یہی رویہ لاشعوری طور پر اپنا لیتا ہے۔

بدقسمتی سے بہت سے تعلیمی اداروں میں استاد کا کردار دینی طور پر غیر جانبدار نہیں بلکہ غیر محسوس طور پر دین بیزار ہو چکا ہے۔

دین پر سوال اٹھانا "**تنقیدی سوچ**" کہلاتا ہے، مگر دین کے حق میں بات کرنا "تعصب" سمجھا جاتا ہے۔

یہ دوہرا معیار طالب علم کو یہ سکھاتا ہے کہ دین علمی دنیا میں کمزور موقف رکھتا ہے۔

اسلام میں استاد کا مقام محض معلومات دینے والا نہیں بلکہ راہ دکھانے والا ہے۔

اسکول سے یونیورسٹی تک طالب علم ایک ایسے ماحول میں رہتا ہے جہاں:

- نماز ذاتی معاملہ ہے
- حلال و حرام پر گفتگو غیر ضروری ہے
- اخلاق **"ہر ایک کی اپنی رائے"** ہے
- کامیابی کا مطلب زیادہ تنخواہ اور اسٹیٹس ہے

یہ ماحول طالب علم کو یہ سکھاتا ہے کہ دین اگر ہے بھی تو زندگی کے کنارے پر ہے، مرکز میں نہیں۔

قرآنِ مجید نے اسی ذہنی کیفیت کو یوں بیان کیا:

اور انھوں نے ظلم اور تکبر کی وجہ سے ان کا انکار کر دیا (سورۃ النمل: آیت 14)

یعنی دل میں سچ جانتے ہیں، مگر عملاً اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ایک اور سنگین مسئلہ یہ ہے کہ تعلیمی نظام طالب علم کو سوال کرنا تو سکھاتا ہے، مگر جواب تلاش کرنے کا درست ذریعہ نہیں دیتا۔ سوالات کا رخ اکثر وحی، نبوت اور شریعت کی طرف ہوتا ہے، مگر جواب کے لیے قرآن، حدیث اور اسلامی فکر کی طرف رہنمائی نہیں کی جاتی۔

نتیجتاً طالب علم یا تو کنفیوژن کا شکار ہو جاتا ہے یا پھر دین کو **"ناقابلِ دفاع"** سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے — حالانکہ مسئلہ دین میں نہیں، رہنمائی کی کمی میں ہوتا ہے۔

قرآنِ مجید نے اسی لیے علم کے ساتھ ہدایت کو لازم قرار دیا ہے:

اس کتاب (کے اللہ کی کتاب ہونے) میں کوئی شک نہیں پرہیزگاروں کو راہ دکھانے والی ہے۔ (سورۃ البقرہ: آیت 2)

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں دین سے دوری کا ایک بڑا سبب تعلیمی نصاب اور ماحول کی منظّم ذہن سازی ہے۔ یہ عمل شور کے ساتھ نہیں بلکہ خاموشی سے ہوتا ہے—سالوں میں، کتابوں کے ذریعے، کلاس روم کے رویّوں سے—اور آخر کار ایک ایسا مسلمان تیار ہوتا ہے جو دین سے دشمن نہیں، مگر دین کو غیر ضروری سمجھتا ہے۔

(یونیورسٹی کلچر، لبرل فکر، اور تعلیم یافتہ مسلمانوں میں عملی لادینیت)

اگر اسکول طالب علم کے ذہن میں دین کو غیر مرکزی بناتا ہے، تو یونیورسٹی اس غیر مرکزیت کو فکری جواز فراہم کر دیتی ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں نوجوان نہ صرف دین سے دور ہوتا ہے بلکہ اکثر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ دین سے دوری ہی ترقی، آزادی اور عقل مندی کی علامت ہے۔

یونیورسٹی کا ماحول بظاہر علم، تحقیق اور سوال کی آزادی کا علمبردار ہوتا ہے، مگر حقیقت میں یہ ایک خاص فکری سانچے میں سوچنے کی تربیت دیتا ہے۔ اس سانچے میں خدا، وحی اور آخرت کو یا تو ذاتی معاملہ کہا جاتا ہے یا علمی بحث سے باہر کر دیا جاتا ہے۔

قرآنِ مجید نے اسی ذہنی کیفیت کی طرف اشارہ کیا ہے:

اور کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو صرف دنیا ہی کی ہے کہ (یہیں) مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں تو زمانہ مار دیتا ہے۔ اور ان کو اس کا کچھ علم نہیں۔ صرف ظن سے کام لیتے ہیں۔ (سورۃ الجاثیہ: آیت 24)

یہ وہی سوچ ہے جو جدید لادین فکر میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے— کہ زندگی بس یہی دنیا ہے۔

یونیورسٹی کلچر میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا لفظ "**آزادی**" ہے۔ مگر یہ

آزادی اکثر ذمہ داری سے کٹی ہوئی ہوتی ہے۔ طالب علم کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ وہ ہر روایت پر سوال اٹھائے، ہر قدر کو چیلنج کرے، اور ہر حد کو توڑنے کو ترقی سمجھے— مگر اس سے یہ نہیں پوچھا جاتا کہ

یہ آزادی کس مقصد کے لیے ہے؟

اس کا انجام کیا ہے؟

اور اس کے اخلاقی اثرات کون برداشت کرے گا؟

قرآنِ مجید اس آزادی کے دھوکے کو یوں بے نقاب کرتا ہے:

پھر کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنا معبود اپنی خواہش کو بنا لیا اور اللہ نے اسے علم کے باوجود گمراہ کر دیا اور اس کے کان اور اس کے دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا۔ پھر اللہ کے بعد اسے کون ہدایت دے، تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ (سورۃ الجاثیہ: آیت 23)

جب خواہش رہنما بن جائے تو آزادی دراصل نئی غلامی بن جاتی ہے۔

یونیورسٹی میں لبرل ازم ایک نظریے کے طور پر نہیں بلکہ ماحول کے طور پر داخل ہوتا ہے۔

- دین کو قدامت پسندی کہا جاتا ہے
- شریعت کو ذاتی رائے
- اخلاق کو سماجی معاہدہ
- اور ایمان کو غیر سائنسی تصور

اس فضا میں اگر کوئی طالب علم دین کی بات کرے تو اسے غیر علمی، جذباتی یا انتہا پسند سمجھا جاتا ہے۔ یہی وہ دباؤ ہے جو نوجوان کو خاموش کر دیتا ہے — اور خاموشی آہستہ آہستہ لاتعلقی میں بدل جاتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اس کیفیت کی پیش گوئی فرمائی تھی: ''قریب ہے کہ لوگوں پر ایک ایسا دور آئے جب اسلام کا صرف نام اور قرآن کا صرف رسم الخط باقی رہ جائے گا، ان کی مساجد آباد ہوں گی لیکن وہ ہدایت سے خالی ہوں گی، ان کے علما آسمان تلے بدترین لوگ ہوں گے، ان کے پاس سے فتنہ ظاہر ہوگا اور انہی میں لوٹ جائے گا۔'' (مشکوۃ حدیث: 276)

یہ حدیث صرف کھلے انکار کی نہیں بلکہ آہستہ آہستہ ایمان کے چھن جانے کی خبر دیتی ہے۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک خاص قسم کی دین سے دوری پیدا ہوتی ہے جسے ہم عملی لادینیت کہہ سکتے ہیں۔ یہ لوگ دین کے منکر نہیں ہوتے، مگر دین کو

- فیصلوں میں شامل نہیں کرتے
- معاشی معاملات میں نظر انداز کرتے ہیں
- سماجی اقدار میں غیر متعلق سمجھتے ہیں

وہ کہتے ہیں: **''میں دل سے مسلمان ہوں''**

مگر زندگی کے نظام میں دین کی کوئی عملی جھلک نظر نہیں آتی۔

اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں اس تضاد کو یوں بیان کیا ہے:

یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے۔ (سورۃ الفتح: آیت 11)

یہ آیت ایمان کے دعوے اور عمل کے فقدان کے فرق کو واضح کرتی ہے۔

یونیورسٹی کلچر کا ایک اور گہرا اثر یہ ہے کہ وہ دین کو اجتماعی نظام کے بجائے محض انفرادی روحانیت تک محدود کر دیتا ہے۔

نماز — ذاتی

روزہ — ذاتی

اخلاق — ذاتی

مگر معیشت، سیاست، قانون اور سماج — سب **"غیر مذہبی"**

یہ تقسیم اسلام کے مزاج کے خلاف ہے، کیونکہ اسلام مکمل ضابطہ؟ حیات ہے، محض عبادات کا مجموعہ نہیں۔

قرآنِ مجید اعلان کرتا ہے:

ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی تابعداری نہ کرو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ (سورۃ البقرہ: آیت 208)

یعنی اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ — جزوی نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ یونیورسٹی کا ماحول مسلمانوں میں دین سے دوری کو فکری پختگی دے دیتا ہے۔ یہاں دین کو رد نہیں کیا جاتا، بلکہ غیر ضروری ثابت کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بہت سے مسلمان ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر اور ماہر تو ہیں — مگر دین ان کی زندگی کے

نظام میں شامل نہیں۔

(تعلیم یافتہ طبقے کی مذہبی بے حسی، سیکولر کامیابی، اور روحانی خلا)

جدید مسلم معاشروں میں ایک عجیب اور تکلیف دہ منظر عام ہے:

تعلیم یافتہ افراد کی تعداد بڑھ رہی ہے، ڈگریاں، مہارتیں اور کامیابیاں بھی— مگر اسی تناسب سے دین کی عملی گرفت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ یہ لوگ دین کے مخالف نہیں ہوتے، مگر دین ان کی ترجیحات میں پیچھے چلا جاتا ہے۔ یہی کیفیت مذہبی بے حسی (Religious Apathy) کہلاتی ہے۔

یہ بے حسی کسی ایک دن میں پیدا نہیں ہوتی۔ یہ اسکول کے نصاب سے شروع ہوتی ہے، یونیورسٹی کے ماحول میں پختہ ہوتی ہے، اور پھر عملی زندگی میں معمول بن جاتی ہے۔ انسان آہستہ آہستہ اس سوچ کا عادی ہو جاتا ہے کہ دین **"اہم تو ہے، مگر فوری نہیں"**۔

قرآنِ مجید نے اسی ذہنیت کو یوں بیان کیا ہے:

آپ انہیں کھاتا، نفع اٹھاتا اور (جھوٹی) امیدوں میں مشغول ہوتا چھوڑ دیجئے یہ خود ابھی جان لیں گے۔ (سورۃ الحجر: آیت 3)

جدید تعلیم کا سب سے بڑا فریب یہ ہے کہ وہ کامیابی کو مادی پیمانوں سے ناپتی ہے:

اچھی نوکری، اعلیٰ تنخواہ، سماجی حیثیت، اور پروفیشنل شناخت۔

یہ سب چیزیں اپنی جگہ جائز ہیں، مگر جب انہیں زندگی کا مقصد بنا لیا جائے تو انسان کے اندر ایک خاموش خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ سب کچھ حاصل کر لیتا ہے، مگر دل میں سکون نہیں ہوتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تعلیم یافتہ مگر روحانی طور پر خالی انسان جنم لیتا ہے۔

قرآنِ مجید اس خلا کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے:

سن لو! اللہ کی یاد ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں۔ (سورۃ الرعد: آیت 28)

دل کا اطمینان صرف اللہ کے ذکر سے ہے — ڈگری، تنخواہ یا مقام سے نہیں۔

سیکولر تعلیمی ماحول انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ مذہب ذاتی سہارا تو ہو سکتا ہے، مگر زندگی کا نظام نہیں۔ چنانچہ تعلیم یافتہ مسلمان عبادت تو کر لیتا ہے، مگر

کاروبار میں دین کو شامل نہیں کرتا،

فیصلوں میں حلال و حرام کو ثانوی سمجھتا ہے،

اور سماجی اقدار میں شریعت کو غیر عملی خیال کرتا ہے۔

یہی رویہ عملی لادینیت کی سب سے واضح علامت ہے۔

قرآنِ مجید نے اسی تضاد کو یوں بیان کیا ہے:

پھر کیا تم کتاب کے بعض پر ایمان لاتے ہو اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ (سورۃ البقرہ: آیت 85)

یعنی دین کے کچھ حصے مان لینا اور کچھ کو نظر انداز کر دینا — یہ رویہ تباہ کن ہے۔

تعلیم یافتہ طبقے کی مذہبی بے حسی کا ایک اور سبب روحانی تربیت کا فقدان ہے۔ تعلیمی ادارے ذہن کو مصروف رکھتے ہیں، مگر روح کو غذا نہیں دیتے۔ نتیجتاً انسان اندر سے تھک جاتا ہے، بے مقصد محسوس کرتا ہے، اور کبھی کبھی شدید ذہنی دباؤ اور ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے — حالانکہ بظاہر سب کچھ ٹھیک ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی یہ دعا اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہے: ”اللہ! میں چار

چیزوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں: ایسے علم سے جو نفع بخش اور مفید نہ ہو، ایسے دل سے جس میں (اللہ کا) ڈر نہ ہو، ایسے نفس سے جو سیراب نہ ہو، اور ایسی دعا سے جو (اللہ کے یہاں) قبول نہ ہو"۔ (سنن نسائی حدیث:5469)

یعنی ایسا دل جو خشوع سے خالی ہو — وہ سب کچھ ہونے کے باوجود محروم ہوتا ہے۔

جدید تعلیمی کامیابی کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ انسان خود کو خودکفیل سمجھنے لگتا ہے۔ علم، مہارت اور وسائل اسے یہ احساس دلاتے ہیں کہ اسے اب اللہ کی کم ضرورت ہے۔ یہ احساس اکثر زبان پر نہیں آتا، مگر فیصلوں میں جھلکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں انسان کی اس نفسیات کو یوں بیان کیا ہے:

مگر انسان سرکش ہو جاتا ہے۔ جب کہ اپنے آپ کو غنی دیکھتا ہے۔ (سورۃ العلق: آیات 7–6)

خلاصہ یہ ہے کہ جدید تعلیمی نظام نے ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا ہے جو بظاہر کامیاب، مہذب اور روشن خیال ہے — مگر روحانی طور پر کمزور ہے۔ دین اس کی شناخت تو ہے، مگر اس کی زندگی کی سمت نہیں۔ یہی مذہبی بے حسی معاشروں میں دین کے اجتماعی کمزور ہونے کی سب سے بڑی وجہ بنتی جا رہی ہے۔

(تعلیم اور ایمان کے رشتے کی بحالی، اصلاحی حکمتِ عملیاں، اور علم کو ہدایت سے جوڑنے کا راستہ)

اسلام میں علم کبھی بھی ایمان سے جدا نہیں رہا۔ جب بھی یہ جدائی پیدا ہوئی، اس کا نتیجہ یا تو خشک عقل کی صورت میں نکلا یا بے سمت طاقت کی شکل میں۔ اسی لیے قرآنِ مجید

میں علم کے ساتھ ہدایت کا ذکر لازم وملزوم رکھا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لائے، وہ انھیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے (سورۃ البقرہ: آیت 257)

یہ نور محض معلومات نہیں بلکہ ہدایت یافتہ علم ہے — ایسا علم جو انسان کو اندھیروں سے نکال کر مقصدِ حیات کی طرف لے جائے۔

تعلیمی اصلاح کا پہلا اور بنیادی اصول یہ ہے کہ علم کا مقصد دوبارہ متعین کیا جائے۔ تعلیم کا مقصد صرف روزگار نہیں، صرف ترقی نہیں، صرف مسابقت نہیں — بلکہ ایسا انسان تیار کرنا ہے جو اللہ کو پہچانتا ہو، اپنی ذمہ داری کو سمجھتا ہو، اور علم کو امانت سمجھ کر استعمال کرتا ہو۔

قرآنِ مجید نے اہلِ علم کی اصل پہچان یوں بیان کی ہے:

اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے صرف جاننے والے ہی ڈرتے ہیں (سورۃ فاطر: آیت 28)

یعنی حقیقی عالم وہ ہے جس کا علم اسے اللہ کے خوف اور شعور تک لے جائے۔

دوسرا اہم اصلاحی پہلو نصابِ تعلیم کی فکری سمت ہے۔ نصاب میں دین کو محض ایک مضمون کے طور پر نہیں بلکہ فکری بنیاد کے طور پر شامل کرنا ضروری ہے۔

سائنس پڑھاتے ہوئے خالق کا شعور،

تاریخ پڑھاتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی سنتیں،

سماجیات میں اخلاقی اصول،

اور فلسفے میں وحی کی رہنمائی—

یہ سب علم کو اندھا ہونے سے بچاتے ہیں۔

اسلامی تاریخ میں یہی ماڈل کامیاب رہا۔ بغداد، قرطبہ اور قاہرہ کے تعلیمی مراکز میں علم اور ایمان ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ ایک ہی دریا کی دو لہریں تھے۔

تیسرا فیصلہ کن عنصر استاد ہے۔ استاد اگر خود علم کو محض کیریئر ٹول سمجھتا ہو تو وہ طالب علم میں بھی یہی ذہن منتقل کرے گا۔ مگر اگر استاد علم کو امانت، خدمت اور ذمہ داری سمجھتا ہو تو وہ ایک نسل کو بدل سکتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''عالم کی عابد پر اس طرح فضیلت ہے جس طرح میری فضیلت تمہارے ادنیٰ آدمی پر ہے۔'' (مشکوۃ حدیث:213)

یہ حدیث استاد کے مقام کو واضح کرتی ہے—وہ محض لیکچر دینے والا نہیں بلکہ خیر کا معلم ہے۔

طالب علم کی سطح پر سب سے اہم اصلاح یہ ہے کہ اسے یہ سکھایا جائے کہ سوال کرنا ایمان کے خلاف نہیں، مگر جواب کا معیار ضروری ہے۔ سوال اگر وحی، عقل اور علم کے متوازن دائرے میں کیا جائے تو وہ ایمان کو کمزور نہیں بلکہ مضبوط کرتا ہے۔

قرآنِ مجید خود غور و فکر کی دعوت دیتا ہے:

﴿أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾، ﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ﴾

یہ آیات واضح کرتی ہیں کہ اسلام اندھی تقلید نہیں بلکہ باشعور ایمان چاہتا ہے۔

تعلیمی اداروں میں ایک اور عملی اصلاح یہ ہے کہ دین کو ذاتی کونے میں بند نہ کیا جائے۔ نماز کے لیے جگہ، حلال و حرام کا احترام، اخلاقی اقدار کی قدر، اور دینی شناخت پر شرمندگی نہ ہو — یہ سب ماحول طالب علم کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ دین علم کا دشمن نہیں بلکہ اس کی روح ہے۔

نبی کریم ﷺ نے مسجد کو عبادت گاہ کے ساتھ ساتھ تعلیمی مرکز بھی بنایا — یہ امت کے لیے ماڈل ہے کہ تعلیم اور عبادت الگ الگ نہیں۔

مجموعی خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں دین سے دوری کا ایک بڑا، گہرا اور دیرپا سبب تعلیمی نظام کی فکری ساخت ہے، جو علم کو ایمان سے، اور کامیابی کو اخلاق سے الگ کر دیتی ہے۔ مگر یہ صورتِ حال نا قابلِ اصلاح نہیں۔

اگر والدین مقصد بدلیں،

اساتذہ کردار نبھائیں،

نصاب سمت درست کرے،

اور طالب علم سچ کی تلاش میں دیانت دار رہے —

تو تعلیم دوبارہ ہدایت بن سکتی ہے، طاقت نہیں۔

قرآنِ مجید کا وعدہ ہے:

اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم انہیں اپنی راہیں ضرور دکھادیں گے۔ (سورۃ العنکبوت: آیت 69)

جو سچ کی تلاش میں کوشش کرے، اللہ اس کے لیے راستے کھول دیتا ہے۔

باب 12

میڈیا، ثقافتی یلغار اور دین سے دوری کے اجتماعی اسباب

(میڈیا کی طاقت، ثقافت کی تشکیل، اور اقدار کی خاموش تبدیلی)

تاریخ میں کبھی بھی کسی قوم کے عقائد، اقدار اور طرزِ زندگی کو اتنی تیزی اور خاموشی سے نہیں بدلا گیا جتنا آج میڈیا کے ذریعے بدلا جا رہا ہے۔ ماضی میں یہ کام تلوار، استعمار یا قانون سے لیا جاتا تھا، مگر آج یہ کام اسکرین، تفریح اور بیانیے (Narrative) کے ذریعے ہو رہا ہے — اور لوگ اسے تبدیلی نہیں بلکہ "ترقی" سمجھ رہے ہیں۔

میڈیا محض خبر دینے کا ذریعہ نہیں رہا، بلکہ یہ اب سوچ بنانے والا، رجحان متعین کرنے والا، اقدار گھڑنے والا، اور زندگی کا مطلب سکھانے والا سب سے طاقتور ادارہ بن چکا ہے۔

قرآنِ مجید نے اگرچہ لفظ "میڈیا" استعمال نہیں کیا، مگر اس کے اثرات کو اصولی انداز میں بہت پہلے بیان کر دیا تھا:

شیطان نے ان کے اعمال بد ان کی نگاہوں میں آراستہ کر دیئے، وہ شیطان آج بھی ان کا رفیق بنا ہوا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (سورۃ النحل: آیت 63)

یعنی ان کے اعمال انہیں خوبصورت بنا کر دکھائے گئے — یہی میڈیا کا بنیادی کام ہے:

برائی کو نارمل، گناہ کو خوبصورت، اور دین کو غیر ضروری بنا دینا۔

میڈیا کی سب سے بڑی طاقت یہ ہے کہ وہ سوچ بدلنے سے پہلے ذوق بدلتا ہے۔ جب ذوق بدل جاتا ہے تو انسان خود ہی اقدار بدلنے لگتا ہے۔ فلمیں، ڈرامے،

اشتہارات، سوشل میڈیا انفلوئنسرز — سب مل کر ایک ایسا کلچر تخلیق کرتے ہیں جس میں حیا پر طنز، سنجیدگی پر مذاق، دین داری پر قدامت، اور خواہش پر فخر کیا جاتا ہے۔

یہ سب کچھ کسی زبردستی کے بغیر ہوتا ہے — بس بار بار دکھا کر، دہرا کر، اور **''نارمل''** بنا کر۔

قرآنِ مجید میں اسی نفسیاتی حربے کو یوں بیان کیا گیا ہے:

اور یقیناً میں انھیں ضرور گمراہ کروں گا اور یقیناً میں انھیں ضرور آرزوئیں دلاؤں گا (سورۃ النساء: آیت 119)

میڈیا امیدوں، خوابوں اور خواہشوں کا سب سے بڑا بیوپاری ہے۔

ثقافتی یلغار (Cultural Invasion) ہمیشہ اس وقت کامیاب ہوتی ہے جب مقامی تہذیب اعتماد کھو بیٹھے۔ جب مسلمان اپنی اقدار پر فخر کے بجائے شرمندگی محسوس کرنے لگیں، تو بیرونی ثقافت خود بخود غالب آ جاتی ہے۔

آج کے میڈیا میں مسلمان کردار اکثر یا تو انتہا پسند، یا دقیانوسی، یا پسماندہ دکھائے جاتے ہیں — جبکہ دین سے دور کردار کامیاب، خوشحال اور آزاد نظر آتے ہیں۔ یہ بیانیہ (Narrative) نوجوان کے ذہن میں یہ بات بٹھا دیتا ہے کہ

''اگر آگے بڑھنا ہے تو دین سے پیچھے ہٹنا ہوگا۔''

قرآن مجید میں ہے:

ان کی تو چاہت ہے کہ جس طرح کے کافر وہ ہیں تو بھی ان کی طرح کفر کرنے لگو اور پھر سب یکساں ہو جاؤ (سورۃ النساء: آیت 89)

یعنی وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان جیسے ہو جاؤ — یہ خواہش آج میڈیا کے ذریعے پوری کی جا رہی ہے۔

میڈیا کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ وہ دین سے دوری کو اخلاقی انحراف کے بجائے ذاتی انتخاب بنا کر پیش کرتا ہے۔

نماز نہ پڑھنا choice —

حجاب نہ کرنا choice —

حرام کو حلال سمجھنا choice —

یوں حق و باطل کی سرحد مٹنے لگتی ہے، اور دین ایک رائے بن کر رہ جاتا ہے، ہدایت نہیں۔

قرآنِ مجید نے اس فکری انتشار کو یوں بیان کیا:

پھر حق کے بعد اور کیا رہ گیا بجز گمراہی کے، پھر کہاں پھرے جاتے ہو؟۔ (سورۃ یونس: آیت 32)

حق کے بعد اگر سب کچھ برابر ہو جائے تو وہی گمراہی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں دین سے دوری کا ایک بہت بڑا اجتماعی سبب میڈیا کی فکری اور ثقافتی بالادستی ہے۔ یہ بالادستی زبردستی نہیں بلکہ کشش کے ذریعے ہے؛ مخالفت نہیں بلکہ تفریح کے ذریعے ہے؛ اور دلیل نہیں بلکہ تاثر (Impression) کے ذریعے ہے۔

یہ باب ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دے گا کہ دین کیسے غیر متعلق بنایا جاتا ہے، حیا کیسے

قدامت بنائی جاتی ہے، اور ایمان کیسے ذاتی کمزوری کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

(تفریحی صنعت، فلم وڈرامہ، سوشل میڈیا اور اخلاقی ودینی زوال)

تفریح انسانی ضرورت ہے — اسلام اس حقیقت سے انکار نہیں کرتا۔ مگر سوال یہ نہیں کہ تفریح ہونی چاہیے یا نہیں، بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ تفریح کس چیز کو معمول بنا رہی ہے اور کس سوچ کو دلوں میں بٹھا رہی ہے۔

جدید تفریحی صنعت (Entertainment Industry) کا بنیادی مقصد اصلاح نہیں بلکہ توجہ، منافع اور اثر ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ انسانی جذبات، خواہشات اور کمزوریوں کو ہدف بناتی ہے — اور یہی وہ مقام ہے جہاں دین، حیا اور اخلاق سب سے پہلے قربان ہوتے ہیں۔

قرآنِ مجید میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

اور لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو غافل کرنے والی بات خریدتا ہے، تاکہ جانے بغیر اللہ کے راستے سے گمراہ کرے اور اسے مذاق بنائے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ (سورۃ لقمان: آیت 6)

یعنی ایسی باتیں خریدی جاتی ہیں جو اللہ کے راستے سے غافل کر دیں — یہ آیت محض آواز یا موسیقی تک محدود نہیں بلکہ ہر وہ تفریح جو انسان کو مقصدِ حیات سے ہٹا دے، اس میں شامل ہے۔

فلم اور ڈرامہ جدید دور کے سب سے طاقتور اخلاقی معلم بن چکے ہیں۔ یہ ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ کیا درست ہے، بلکہ یہ دکھاتے ہیں کہ اکثر لوگ کیا کر رہے ہیں — اور انسان فطری طور پر اسی کو درست سمجھنے لگتا ہے جو عام نظر آئے۔

فلموں اور ڈراموں میں:

- حرام تعلقات کو محبت کا نام دیا جاتا ہے
- بے پردگی کو خوداعتمادی کہا جاتا ہے
- دھوکے کو ذہانت
- بغاوت کو آزادی
- اور دینی کردار کو کمزور یا مزاحیہ

یوں نیکی غیر دلکش اور گناہ دلکش بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں یوں بیان کیا:

یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اور جن کے کانوں پر اور جن کی آنکھوں پر اللہ نے مہر لگادی ہے اور یہی لوگ غافل ہیں۔ (سورۃ النحل: آیت 108)

یعنی ان کے برے اعمال انہیں خوبصورت دکھائے گئے۔

اس مسلسل نمائش (Exposure) کا سب سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ حیا ٹوٹنے لگتی ہے۔ جو چیز کل شرمناک تھی، آج قابلِ قبول بن جاتی ہے، اور جو آج قابلِ قبول ہے، کل فخر بن جاتی ہے۔ یہی وہ تدریجی زوال ہے جسے لوگ محسوس نہیں کرتے، مگر اس کے نتائج پوری نسل بھگتتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب شرم ہی نہ رہی تو پھر جو جی چاہے وہ کرے۔'' (صحیح البخاری حدیث: 6120)

یعنی حیا انسان کو گناہوں سے روکنے والی بہت بڑی دیوار ہے، جب حیا ختم ہو

جائے تو گناہ روکنے والی آخری دیوار بھی گر جاتی ہے۔

سوشل میڈیا نے اس عمل کو کئی گنا تیز کر دیا ہے۔ اب نوجوان صرف دیکھتے نہیں، بلکہ پسند کرتے ہیں، شیئر کرتے ہیں، تبصرہ کرتے ہیں، اور خود کو اسی کلچر کے مطابق پیش کرتے ہیں۔

یہاں اصل کامیابی فالوورز، لائکس اور ویوز بن چکی ہے—اور ان کے حصول کے لیے اکثر دین، حیا اور سچائی قربان کر دی جاتی ہے۔

قرآنِ مجید نے اس نفسیاتی غلامی کو یوں بیان کیا ہے:

اور اس شخص کا کہنا مت مان جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے چلا اور اس کا کام ہمیشہ حد سے بڑھا ہوا ہے۔ (سورۃ الکہف: آیت 28)

یعنی ایسے لوگوں کے پیچھے نہ چلو جن کے دل اللہ کے ذکر سے غافل ہو چکے ہوں۔

تفریحی مواد کا ایک اور بڑا نقصان یہ ہے کہ وہ زندگی کے مقصد کو بدل دیتا ہے۔ نوجوان یہ سیکھتا ہے کہ خوشی کا مطلب

زیادہ آزادی، زیادہ تعلقات، زیادہ اظہار، اور زیادہ لطف ہے—نہ کہ اللہ کی رضا، ذمہ داری یا آخرت کی کامیابی۔

قرآنِ مجید نے اس محدود تصورِ زندگی کو یوں رد کیا ہے:

اور دنیا کی زندگی بجز دھوکے کے سامان کے اور کچھ بھی تو نہیں۔ (سورۃ الحدید: آیت 20)

دنیا اگر مقصد بن جائے تو وہ کھیل اور تماشہ بن جاتی ہے۔

اس قسط کا ایک نہایت اہم پہلو یہ ہے کہ میڈیا دین سے دوری کو اجتماعی رجحان بنا دیتا ہے۔ جب ہر طرف ایک ہی طرزِ زندگی دکھائی دے، تو نوجوان کو یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ

''سب یہی کر رہے ہیں''

اور جو سب کرتے ہیں، وہ غلط نہیں ہو سکتا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں فرد کا ضمیر اجتماعی شور میں دب جاتا ہے۔

قرآنِ مجید اس ذہنی فریب کو یوں بیان کرتا ہے:

اور اگر تو ان لوگوں میں سے اکثر کا کہنا مانے جو زمین میں ہیں تو وہ تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے (سورۃ الأنعام: آیت 116)

اکثریت ہمیشہ حق پر نہیں ہوتی — یہ اصول آج سب سے زیادہ فراموش کیا جا رہا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تفریحی صنعت، فلم، ڈرامہ اور سوشل میڈیا نے مسلمانوں میں دین سے دوری کو نظری نہیں بلکہ جذباتی، وقتی نہیں بلکہ معمول، اور فردی نہیں بلکہ اجتماعی بنا دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دین سے دوری آج بغاوت نہیں بلکہ طرزِ زندگی محسوس ہوتی ہے۔

(اقدار کی نئی تعریف، آزادی وحیا کا بحران، اور نوجوان نسل کی نفسیاتی و دینی کشمکش)

ہر تہذیب کی پہچان اس کے ہتھیار، عمارتیں یا ٹیکنالوجی نہیں ہوتیں، بلکہ اقدار

(Values) ہوتی ہیں۔ جب اقدار بدل دی جائیں تو قوم خود بخود بدل جاتی ہے—اور جدید میڈیا یہی کام سب سے مؤثر طریقے سے انجام دے رہا ہے۔

آج میڈیا نے اچھائی اور برائی کی تعریف کو اس طرح بدل دیا ہے کہ جو چیز کبھی اخلاقی کمزوری سمجھی جاتی تھی، وہ اب خود اعتمادی کہلاتی ہے، جو چیز کبھی حیا تھی، وہ اب پسماندگی کہلاتی ہے، اور جو چیز کبھی گناہ تھی، وہ اب **''ذاتی آزادی''** بن چکی ہے۔

یہ تبدیلی کسی فلسفیانہ بحث کے ذریعے نہیں بلکہ تصویروں، کہانیوں اور کرداروں کے ذریعے کی گئی ہے—اور یہی اس کی سب سے خطرناک شکل ہے۔

قرآنِ مجید نے اسی عمل کو یوں بیان کیا:

اس کی جگہوں سے پھیر دیتے ہیں اور کہتے ہیں سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا (ہم نے سنا اور نہیں مانا) اور اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ (سن اس حال میں کہ تجھے نہ سنایا جائے) اور رَاعِنَا (ہماری رعایت کر) (یہ الفاظ) اپنی زبانوں کو پیچ دیتے ہوئے اور دین میں طعن کرتے ہوئے (سورۃ النساء: آیت 46)

یعنی باتوں کو ان کی اصل جگہ سے ہٹا دینا— آج یہ تحریف لفظوں کی نہیں بلکہ مفاہیم کی ہو رہی ہے۔ اس وقت بھی یہودی زبان کے ہیر پھیر سے دھوکہ دینے کی کوشش کرتے تھے اور آج ۹۰ فیصد میڈیا پر کنٹرول کر کے اپنا شیطانی بیانیہ بنا کر اسی کوشش میں ہیں۔

آزادی (Freedom) جدید میڈیا کا سب سے طاقتور نعرہ ہے۔ مگر یہ آزادی ذمہ داری کے بغیر، حدود کے بغیر، اور جواب دہی کے بغیر پیش کی جاتی ہے۔

نوجوان کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ وہ ہر روایت توڑ دے، ہر حد پار کر جائے، اور ہر

خواہش کو حق سمجھے — اور یہی اصل کامیابی ہے۔

قرآنِ مجید اس آزادی کے فریب کو یوں بے نقاب کرتا ہے:

اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو ورنہ وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی (سورۃ ص: آیت 26)

خواہش کی پیروی آزادی نہیں بلکہ گمراہی ہے — مگر میڈیا اسے آزادی کے نام پر بیچتا ہے۔

اس نام نہاد آزادی کا سب سے پہلا شکار حیا بنتی ہے۔ حیا جو اسلام میں ایمان کا حصہ ہے، میڈیا کے بیانیے میں یا تو کمزوری، یا جبر، یا دقیانوسیت کہلا رہی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ایمان کی ستر سے زیادہ شاخیں ہیں اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔'' (صحیح مسلم حدیث: 152)

جب حیا ختم ہوتی ہے تو ایمان کا ایک حصہ خاموشی سے ختم ہو جاتا ہے — اور انسان کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

نوجوان نسل اس وقت ایک شدید شناختی بحران (Identity Crisis) کا شکار ہے۔ ایک طرف اس کا دین اسے حیا، ذمہ داری، حدود اور مقصد سکھاتا ہے؛ دوسری طرف میڈیا اسے آزادی، لطف، خودنمائی اور خواہش کی دعوت دیتا ہے۔

یہ دو متضاد پیغامات نوجوان کے اندر ایک مسلسل کشمکش پیدا کرتے ہیں:

کیا میں مذہبی بنوں تو پیچھے رہ جاؤں گا؟

کیا میں جدید بنوں تو دین کھو دوں گا؟

کیا دونوں ایک ساتھ ممکن ہیں؟

جب اس کشمکش کا جواب درست دینی رہنمائی سے نہ ملے تو نوجوان اکثر دین کو قربان کر دیتا ہے—اس لیے نہیں کہ وہ دین سے نفرت کرتا ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ تنہا ہو جاتا ہے۔

قرآنِ مجید نے اس اندرونی ٹوٹ پھوٹ کو یوں بیان کیا:

اور جو شخص رحمٰن کی یاد سے غفلت کرے ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں وہی اس کا ساتھی رہتا ہے۔ (سورۃ الزخرف: آیت 36)

جب انسان اللہ کے ذکر سے منہ موڑ لیتا ہے تو ایک فکری شیطان اس کا ساتھی بن جاتا ہے— آج یہ کردار میڈیا ادا کر رہا ہے۔

میڈیا نوجوان کو یہ بھی سکھاتا ہے کہ قبولیت (Acceptance) سب سے بڑی ضرورت ہے۔ پسند کیا جانا، فالو کیا جانا، تعریف پانا—یہ سب جدید شناخت کے پیمانے بن چکے ہیں۔ اس قبولیت کی دوڑ میں نوجوان اکثر اپنی اقدار، اپنی حدود، اور اپنی دینی شناخت قربان کر دیتا ہے۔

قرآنِ مجید نے اس نفسیاتی غلامی کو یوں بیان کیا:

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے شریک اوروں کو ٹھہرا کر ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں، جیسی محبت اللہ سے ہونی چاہیئے (سورۃ البقرہ: آیت 165)

جب انسان اللہ کے بجائے لوگوں کی پسند کو معیار بنا لے تو وہی اس کا معبود بن جاتی ہے۔

ایک نہایت اہم پہلو یہ ہے کہ میڈیا دین سے دوری کو داخلی مسئلہ بنا دیتا ہے۔

نوجوان کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ

''مسئلہ دین میں ہے''

''میں کمزور ہوں''

''میں اس معیار پر پورا نہیں اتر سکتا''

حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ مسئلہ دین میں نہیں بلکہ غلط معیار میں ہوتا ہے۔

قرآنِ مجید نے اسی خود الزام دہی کو یوں رد کیا:

تم نہ سستی کرو اور غمگین ہو، تم ہی غالب رہو گے، اگر تم ایماندار ہو۔ (سورۃ آل عمران: آیت 139)

ایمان کمزوری نہیں، بلکہ اصل بلندی ہے — بس یہ حقیقت دکھائی نہیں جاتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ میڈیا نے مسلمانوں میں دین سے دوری کو اقدار کی نئی تعریف کے ذریعے، آزادی اور حیا کے بگاڑ کے ذریعے، اور شناختی بحران پیدا کر کے گہرا اور مستقل بنا دیا ہے۔ نوجوان دین سے انکار نہیں کرتا، بلکہ کنفیوز ہو جاتا ہے — اور کنفیوز انسان سب سے آسان شکار ہوتا ہے۔

(میڈیا میں دین کی منفی تصویر، مسلمان کردار، دہشت گردی کا بیانیہ اور احساسِ کمتری)

ہر طاقتور تہذیب اپنے بیانیے (Narrative) کے ذریعے دنیا کو دیکھنے کا زاویہ دیتی ہے۔ آج عالمی میڈیا نے دنیا کو ایک خاص زاویے سے دیکھنا سکھایا ہے — اور اس زاویے میں اسلام مسئلہ اور مسلمان خطرہ بن کر پیش کیا جاتا ہے۔

یہ تاثر کسی ایک فلم، خبر یا پروگرام سے نہیں بنتا بلکہ مسلسل، مربوط اور منظّم انداز میں

تشکیل دیا جاتا ہے۔

جدید میڈیا میں مسلمان کردار اکثر تین شکلوں میں دکھایا جاتا ہے:

1. شدت پسند

2. جاہل یا دقیانوسی

3. یا ایسا شخص جو دین چھوڑ کر ''مہذب'' ہو گیا ہو

ان تینوں صورتوں میں پیغام ایک ہی ہوتا ہے:

دین کے ساتھ کامیابی ممکن نہیں۔

یہی وہ بیانیہ ہے جو آہستہ آہستہ مسلمان نوجوان کے ذہن میں بیٹھ جاتا ہے چاہے وہ اس سے شعوری طور پر اتفاق نہ بھی کرے۔

قرآنِ مجید نے اس ذہنی یلغار کو یوں واضح کیا:

ان کی تو چاہت ہے کہ جس طرح کے کافر وہ ہیں تو بھی ان کی طرح کفر کرنے لگو اور پھر سب یکساں ہو جاؤ (سورۃ النساء: آیت 89)

یعنی وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان جیسے ہو جاؤ— آج یہ خواہش میڈیا کے ذریعے پوری کی جا رہی ہے۔

نائن الیون کے بعد ''**دہشت گردی**'' کو اسلام کے ساتھ اس طرح جوڑ دیا گیا کہ اب خبر نہیں بلکہ فرض سمجھ لیا گیا کہ

داڑھی = شدت

اسلامی شعائر = خطرہ

اور شریعت = جبر

یہ عمومی تاثر اتنا گہرا ہو چکا ہے کہ مسلمان خود بھی اپنی شناخت چھپانے لگے ہیں — نام بدلنا، علامات کم کرنا، اور دین کو **"پرسنل"** کہہ کر الگ رکھنا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں دین سے دوری خوف کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

قرآنِ مجید اس نفسیاتی شکست کو یوں بیان کرتا ہے:

وہ لوگ کہ جب ان سے لوگوں نے کہا کہ کافروں نے تمہارے مقابلے پر لشکر جمع کر لئے ہیں، تم ان سے خوف کھاؤ تو اس بات نے انہیں ایمان میں اور بڑھا دیا اور کہنے لگے ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔ (سورۃ آل عمران: آیت 173)

ایمان خوف سے نہیں گھٹتا، مگر جب ایمان کمزور ہو تو خوف غالب آ جاتا ہے۔

میڈیا کی مسلسل منفی تصویر کشی کا سب سے خطرناک نتیجہ احساسِ کمتری (Inferiority Complex) ہے۔

جب ایک نوجوان بار بار دیکھتا ہے کہ اس کی تہذیب پسماندہ ہے، اس کا دین مسئلہ ہے، اور اس کی تاریخ تشدد سے بھری ہے — تو وہ لاشعوری طور پر خود کو بھی کمتر سمجھنے لگتا ہے۔

یہی احساس اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی تاریخ پر شرمندہ ہو، اپنی اقدار پر معذرت خواہ ہو، اور اپنے دین پر خاموش رہے۔

حالانکہ قرآنِ مجید اعلان کرتا ہے:

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے (سورۃ آل عمران: آیت 110)

یہ برتری نسل کی نہیں بلکہ کردار اور پیغام کی ہے— مگر میڈیا نے اس اعتماد کو توڑ دیا ہے۔

ایک اور خطرناک پہلو یہ ہے کہ میڈیا نے مسلمانوں کو ہمیشہ دفاعی پوزیشن میں لا کھڑا کیا ہے۔ ہر واقعے پر وضاحت، ہر الزام پر معذرت، اور ہر جرم پر اجتماعی صفائی— یہ سب اس بات کی علامت ہے کہ بیانیہ ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔

اسلام دفاعی نہیں بلکہ اصلاحی دین ہے۔ نبی کریم ﷺ نے دنیا کو جواب دینے کے بجائے دنیا کو بدل کر دکھایا— یہی اصل طاقت تھی۔

قرآنِ مجید فرماتا ہے:

پس تم بودے بن کر صلح کی درخواست پر نہ اتر آؤ جبکہ تم ہی بلند و غالب رہو گے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے، ناممکن ہے کہ وہ تمہارے اعمال ضائع کر دے۔ (سورۃ محمد: آیت 35)

کمزور نہ پڑو— اصل برتری ایمان کے ساتھ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ میڈیا نے مسلمانوں میں دین سے دوری کو منفی تصویر کشی، دہشت گردی کے بیانیے، اور احساسِ کمتری کے ذریعے گہرا کر دیا ہے۔

جب قوم خود کو کمتر سمجھنے لگے تو وہ اپنی اقدار، اپنے دین اور اپنی شناخت سے آہستہ آہستہ دور ہو جاتی ہے— اور یہی اس باب کا سب سے اہم نکتہ ہے۔

(میڈیا کے فتنوں کا مقابلہ، متبادل اسلامی بیانیہ، اور فکری و عملی واپسی کا راستہ)

اسلام فتنوں سے بھاگنے کا نہیں بلکہ فتنوں کو پہچان کر ان کا مقابلہ کرنے کا دین ہے۔ تاریخِ اسلام اس بات کی گواہ ہے کہ جب بھی باطل نے طاقت، ثقافت یا پروپیگنڈے کے ذریعے حملہ کیا، اسلام نے خاموشی نہیں، مرعوبیت نہیں، بلکہ شعور، حکمت اور کردار کے ساتھ جواب دیا۔

آج میڈیا کا فتنہ بھی اسی نوعیت کا ہے—فرق صرف یہ ہے کہ یہ فتنہ تلوار نہیں بلکہ تصویر، آواز اور بیانیے کے ذریعے حملہ آور ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں پہلا اصول یہ دیتا ہے کہ فتنہ سمجھے بغیر ختم نہیں ہوتا:

اور اسی طرح ہم آیات کو کھول کر بیان کرتے ہیں اور تاکہ مجرموں کا راستہ خوب واضح ہو جائے۔ (سورۃ الأنعام: آیت 55)

یعنی آیات اس لیے واضح کی جاتی ہیں تاکہ باطل کا راستہ کھل کر سامنے آ جائے۔

میڈیا کے فتنوں کا مقابلہ کرنے کا پہلا مرحلہ فکری بیداری ہے۔ جب تک مسلمان یہ نہ سمجھے کہ ہر دکھائی جانے والی چیز سچ نہیں، ہر مقبول چیز درست نہیں، اور ہر آزادی فائدہ مند نہیں—تب تک وہ میڈیا کے ہاتھوں استعمال ہوتا رہے گا۔

قرآنِ مجید نے اس اندھی پیروی سے خبردار کیا ہے:

اور اس چیز کا پیچھا نہ کر جس کا تجھے کوئی علم نہیں۔ (سورۃ الإسراء: آیت 36)

یہ اصول آج اسکرین کے سامنے سب سے زیادہ ضروری ہے۔

دوسرا اور نہایت اہم مرحلہ متبادل اسلامی بیانیہ (Counter Narrative)

کی تشکیل ہے۔صرف یہ کہنا کہ **"یہ غلط ہے"** کافی نہیں — جب تک ہم یہ نہ دکھائیں کہ

"درست کیا ہے"

"خوبصورت کیا ہے"

اور "انسانی فطرت کے قریب کیا ہے"

اسلام کا بیانیہ خوف، جبر یا تنگی کا نہیں بلکہ عدل، حیا، توازن، اور مقصد کا بیانیہ ہے۔

قرآنِ مجید اسلام کو یوں متعارف کراتا ہے:

جس کے ساتھ اللہ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے پیچھے چلیں، سلامتی کے راستوں کی ہدایت دیتا ہے اور انھیں اپنے حکم سے اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے اور انھیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ (سورۃ المائدہ: آیت 16)

اسلام انسان کو سلامتی کے راستے دکھاتا ہے — نہ کہ ذہنی انتشار۔

نبی کریم ﷺ کی سیرت اس متبادل بیانیے کی سب سے خوبصورت مثال ہے۔ مکہ میں آپ ﷺ کو انتہا پسند کہا گیا، خاندان توڑنے والا کہا گیا، اور معاشرے کے لیے خطرہ قرار دیا گیا — مگر آپ ﷺ نے وضاحتوں سے نہیں، معذرتوں سے نہیں، بلکہ کردار، صبر اور عدل سے یہ بیانیہ توڑ دیا۔

یہی سبق آج کے مسلمان کے لیے ہے۔

عملی سطح پر تیسرا اہم دائرہ خاندان ہے۔ اگر گھر میں میڈیا بے لگام ہو، اسکرین بے نگرانی ہو، اور گفتگو نہ ہو — تو پھر دین سے دوری تعلیمی ادارے یا معاشرے سے پہلے گھر

سے شروع ہوتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''آگاہ ہو جاؤ تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ پس امام (امیر المؤمنین) لوگوں پر نگہبان ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہوگا۔ مرد اپنے گھر والوں کا نگہبان ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہوگا اور عورت اپنے شوہر کے گھر والوں اور اس کے بچوں کی نگہبان ہے اور اس سے ان کے بارے میں سوال ہوگا اور کسی شخص کا غلام اپنے سردار کے مال کا نگہبان ہے اور اس سے اس کے بارے میں سوال ہو گا۔ آگاہ ہو جاؤ کہ تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے بارے میں پرسش ہوگی۔'' (صحیح البخاری حدیث: 7138)

والدین صرف روٹی اور تعلیم کے ذمہ دار نہیں بلکہ فکری حفاظت کے بھی ذمہ دار ہیں۔ گھر میں سوال کرنے کی اجازت، دین پر گفتگو کا ماحول، اور میڈیا پر تنقیدی نظر یہ سب نوجوان کو شدت یا بغاوت سے نہیں بلکہ شعور سے جوڑتے ہیں۔

چوتھا اہم دائرہ فرد کی سطح ہے۔ ہر مسلمان کو یہ سیکھنا ہوگا کہ کیا دیکھنا ہے، کتنا دیکھنا ہے، اور کس نیت سے دیکھنا ہے۔

اسلام ترکِ دنیا نہیں بلکہ تزکیہ نفس سکھاتا ہے۔

قرآنِ مجید فرماتا ہے:

کہ جس نے (اپنے) نفس (یعنی روح) کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا۔ (سورۃ الشّمس: آیت 9)

اصل کامیابی نفس کی تربیت میں ہے — نہ کہ خواہشات کی تسکین میں۔

امت کی سطح پر سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ مسلمان صرف صارف (Consumer) نہ بنیں بلکہ خالق (Creator) بنیں۔ اپنا میڈیا، اپنی کہانیاں، اپنے رول ماڈلز، اور اپنی زبان میں بیانیہ — یہ سب امت کی فکری خودمختاری کے لیے ناگزیر ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں امید دلاتا ہے:

اللہ اپنے ارادے پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ بے علم ہوتے ہیں۔ (سورۃ یوسف: آیت 21)

باطل جتنا بھی منظّم ہو، حق اگر بیدار ہو جائے تو غالب آتا ہے۔

اس باب کا مجموعی خلاصہ یہ ہے کہ میڈیا اور ثقافتی یلغار نے مسلمانوں میں دین سے دوری کو خاموش، دلکش، اور اجتماعی بنا دیا ہے — مگر یہ دوری حتمی نہیں۔ جب شعور بیدار ہو، اعتماد واپس آئے، اور دین کو دفاع کے بجائے رہنمائی کے مقام پر رکھا جائے — تو میڈیا کا فتنہ کمزور پڑ جاتا ہے۔

قرآنِ مجید کا وعدہ ہے:

بے شک اللہ ان لوگوں کی طرف سے دفاع کرتا ہے جو ایمان لائے (سورۃ الحج: آیت 38)

اللہ ایمان والوں کی خود حفاظت کرتا ہے — بشرطیکہ وہ خود اپنے ایمان کے ساتھ کھڑے ہوں۔

باب 13

خاندانی نظام کی کمزوری، رشتوں کا بکھراؤ اور دین سے دوری

(خاندان کی دینی حیثیت، اس کا زوال اور ایمان پر اس کے گہرے اثرات)

اسلام میں خاندان محض افراد کا مجموعہ نہیں بلکہ دین کی پہلی درسگاہ، اخلاق کی پہلی تجربہ گاہ، اور ایمان کی پہلی پناہ گاہ ہے۔ انسان سب سے پہلے جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے، جہاں اس کی زبان بنتی ہے، اس کا مزاج تشکیل پاتا ہے اور اس کے دل میں اچھائی یا برائی کے ابتدائی نقوش ثبت ہوتے ہیں—وہ خاندان ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے فرد کی اصلاح سے پہلے خاندان کی اصلاح کو بنیادی اہمیت دی، کیونکہ جب خاندان بگڑ جائے تو فرد کا سنبھلنا مشکل اور معاشرے کا درست ہونا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔

قرآنِ مجید انسان کی تخلیق اور سماجی زندگی کا آغاز ہی خاندان سے کرتا ہے:

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیوی کو پیدا کر کے ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں، اس اللہ سے ڈرو جس کے نام پر ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور رشتے ناطے توڑنے سے بھی بچو بے شک اللہ تعالیٰ تم پر نگہبان ہے۔ (سورۃ النساء: آیت 1)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ انسانی معاشرہ کسی نظریے، ریاست یا معاہدے سے نہیں بلکہ خاندانی رشتے سے شروع ہوتا ہے۔ جب اس بنیاد میں دراڑ پڑتی ہے تو اوپر کھڑی پوری عمارت متزلزل ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں میں دین سے دوری کے اسباب میں خاندانی نظام کی کمزوری ایک ایسا عنصر ہے جو بظاہر خاموش، مگر اثر کے اعتبار سے نہایت گہرا اور دیرپا ہے۔ بہت سے لوگ یہ

سمجھتے ہیں کہ دین سے دوری کا تعلق صرف تعلیمی اداروں، میڈیا یا بیرونی اثرات سے ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر گھر کے اندر ایمان زندہ، مربوط اور قابلِ عمل ہو تو بیرونی فتنوں کا اثر محدود ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس، جب گھر کے اندر ہی دین رسمی، کمزور یا متنازع ہو جائے تو باہر کی ہر آواز دل میں گھر کر لیتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے خاندان کی اس مرکزی حیثیت کو یوں بیان فرمایا: ''آگاہ ہو جاؤ تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ پس امام (امیر المؤمنین) لوگوں پر نگہبان ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہوگا۔ مرد اپنے گھر والوں کا نگہبان ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہوگا اور عورت اپنے شوہر کے گھر والوں اور اس کے بچوں کی نگہبان ہے اور اس سے ان کے بارے میں سوال ہوگا اور کسی شخص کا غلام اپنے سردار کے مال کا نگہبان ہے اور اس سے اس کے بارے میں سوال ہوگا۔ آگاہ ہو جاؤ کہ تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے بارے میں پرسش ہوگی۔'' (صحیح البخاری حدیث: 7138)

یہ حدیث صرف انتظامی ذمہ داری نہیں بلکہ ایمانی جواب دہی کا اعلان ہے۔ باپ، ماں، شوہر، بیوی—سب اپنے اپنے دائرے میں دین کے محافظ ہیں۔ جب یہ محافظ خود غافل ہو جائیں تو نئی نسل کو دین سے جوڑنے والا کوئی نہیں رہتا۔

خاندانی نظام کے کمزور ہونے کا سب سے پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ دین عملی زندگی سے نکل کر رسمی گفتگو تک محدود ہو جاتا ہے۔ گھر میں نماز کا ذکر تو ہوتا ہے مگر ماحول نہیں، قرآن الماری میں ہوتا ہے مگر گفتگو میں نہیں، حلال و حرام کی بات تو کی جاتی ہے مگر طرزِ زندگی اس کی نفی کر رہا ہوتا ہے۔ بچہ جب یہ تضاد دیکھتا ہے تو وہ دین سے انکار نہیں کرتا، بلکہ اسے غیر سنجیدہ سمجھنے لگتا ہے—اور یہی غیر سنجیدگی آگے چل کر لاتعلقی میں بدل جاتی ہے۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس دوہرے معیار کو سختی سے رد کیا ہے:

کیا لوگوں کو بھلائیوں کا حکم کرتے ہو؟ اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو (سورۃ البقرہ: آیت 44)

جب والدین خود وہ دین نہیں جیتے جس کی تلقین کرتے ہیں تو اولاد کے دل میں دین کی وقعت ختم ہو جاتی ہے، اور وہ اسے محض ایک سماجی روایت سمجھنے لگتی ہے۔

جدید دور میں خاندانی نظام پر سب سے کاری ضرب مصروفیت، مادہ پرستی اور انفرادیت نے لگائی ہے۔ والدین کے پاس اولاد کے لیے وقت نہیں، میاں بیوی کے درمیان مکالمہ نہیں، اور گھر میں سکون کے بجائے اسکرین کی آوازیں ہیں۔ ایسے ماحول میں دین کو سیکھنے، سمجھنے اور جذب کرنے کے لیے نہ فضا ہوتی ہے نہ فرصت۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بچے دین کو گھر سے نہیں بلکہ یا تو انٹرنیٹ سے سیکھتے ہیں یا بالکل نہیں سیکھتے۔

اسلام نے گھر کو سکون کی جگہ قرار دیا:

اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے تمہارے گھروں میں سکونت کی جگہ بنا دی ہے (سورۃ النحل: آیت 80)

جب گھر سکون کے بجائے ذہنی دباؤ، تلخی اور لاتعلقی کا مرکز بن جائے تو وہاں ایمان پنپ نہیں سکتا۔

خاندانی نظام کی کمزوری کا ایک اور خطرناک نتیجہ یہ ہے کہ دین فرد اور خاندان کے درمیان مشترک قدر نہیں رہتا۔ ہر شخص اپنا الگ مذہبی ورژن بنا لیتا ہے — کوئی سختی کا، کوئی نرمی کا، کوئی بالکل لاتعلقی کا۔ اس انتشار میں دین وحدت کے بجائے اختلاف کا ذریعہ بن جاتا ہے، اور نئی نسل دین کو مسئلہ سمجھنے لگتی ہے، حل نہیں۔

قرآنِ مجید ہمیں خاندان کی اس اجتماعی ذمہ داری کی یاد دہانی کراتا ہے:

اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان ہیں اور پتھر (سورۃ التحریم: آیت 6)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ ایمان صرف ذاتی نجات کا منصوبہ نہیں بلکہ نسلوں کی امانت ہے۔

بنیادی نکتہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں دین سے دوری کا آغاز اکثر گھر کے اندر سے ہوتا ہے—نہ کہ بغاوت سے بلکہ غفلت سے، نہ نفرت سے بلکہ خاموشی سے۔ جب گھر دین کا سہارا بننے کے بجائے غیر جانبدار ہو جائے تو نئی نسل خود کو دنیا کے شور میں اکیلا پاتی ہے۔

(والدین کا کردار، تربیت کی کمزوری، اور اولاد میں دین سے جذباتی و عملی فاصلے)

اگر خاندان دین کی پہلی درسگاہ ہے تو والدین اس درسگاہ کے پہلے معلم ہیں۔ بچہ الفاظ سے پہلے رویّے سیکھتا ہے، نصیحت سے پہلے ماحول کو جذب کرتا ہے، اور احکامات سے پہلے طرزِ زندگی کو اپنا معیار بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے والدین کی ذمہ داری کو صرف پرورش تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے ایمان کی منتقلی سے جوڑ دیا ہے۔ جب یہ منتقلی کمزور پڑتی ہے تو دین نئی نسل کے لیے بوجھ، رسم یا غیر متعلق چیز بننے لگتا ہے۔

قرآنِ مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر آتا ہے تو ان کی دعا صرف ذاتی نجات تک محدود نہیں رہتی بلکہ نسلوں تک پھیل جاتی ہے:

اے میرے رب! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی، اے ہمارے رب! اور میری دعا قبول کر۔ (سورۃ ابراہیم: آیت 40)

یہ دعا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ والدین کا اصل کمال صرف خود نیک ہونا

نہیں بلکہ اولاد کو نیکی کے قابل بنانا ہے۔

مسلمانوں میں دین سے دوری کا ایک نہایت تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ بہت سے گھروں میں والدین دین کو تو درست سمجھتے ہیں، مگر اسے زندہ حقیقت کے طور پر نہیں جیتے۔ نماز کا تذکرہ موجود ہوتا ہے مگر اس کی ترجیح نہیں، حلال و حرام کی بات ہوتی ہے مگر کاروبار اور روزمرہ معاملات میں اس کی پاسداری کمزور ہوتی ہے، اور اخلاقیات کی تلقین کی جاتی ہے مگر غصہ، جھوٹ اور ناانصافی معمول بن چکے ہوتے ہیں۔ بچہ جب یہ تضاد روزانہ دیکھتا ہے تو اس کے ذہن میں دین کا تصور ٹوٹنے لگتا ہے—وہ دین کو سچ تو مانتا ہے، مگر قابلِ عمل نہیں سمجھتا۔

قرآنِ مجید نے اس عملی تضاد کو سختی سے بے نقاب کیا ہے:

اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ (سورۃ الصّف: آیت 2)

یہ سوال صرف زبان کا نہیں بلکہ کردار کا ہے، اور یہی کردار اولاد کے ایمان کی سمت متعین کرتا ہے۔

جدید دور میں والدین کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ تربیت کو تعلیم سمجھ بیٹھے ہیں۔ اچھا اسکول، اچھی ڈگری اور محفوظ مستقبل—یہ سب ضروری ہیں، مگر یہ دین کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔ جب والدین اپنی تمام توانائی تعلیمی کامیابی پر لگا دیں اور دینی تربیت کو یا تو مدرسے پر چھوڑ دیں یا وقت آنے پر سوچنے کی بات قرار دے دیں، تو اولاد کے دل میں دین زندگی کے مرکز کے بجائے ایک اضافی مضمون بن جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”حسن ادب سے بہتر کسی باپ نے اپنے بیٹے کو تحفہ نہیں دیا“۔ (سنن ترمذی حدیث: 1952)

یعنی والدین کی سب سے قیمتی میراث اچھا ادب اور کردار ہے—نہ کہ صرف مالی یا تعلیمی کامیابی۔

والدین اور اولاد کے درمیان دین کے حوالے سے بڑھتا ہوا فاصلہ اکثر مکالمے کی کمی سے پیدا ہوتا ہے۔ بہت سے گھروں میں بچوں کے سوالات کو یا تو بغاوت سمجھا جاتا ہے یا بے ادبی۔ نتیجتاً بچہ سوال گھر میں نہیں پوچھتا بلکہ باہر تلاش کرتا ہے—اور وہاں اکثر اسے یا تو گمراہ کن جوابات ملتے ہیں یا دین سے بیزاری۔

قرآنِ مجید نے حضرت لقمان کی نصیحتوں کو مکالمے کی صورت میں بیان کیا ہے، حکم کی صورت میں نہیں:

اور جب لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا، جب کہ وہ اسے نصیحت کر رہا تھا اے میرے چھوٹے بیٹے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا، بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔ (سورۃ لقمان: آیت 13)

یہ انداز ہمیں سکھاتا ہے کہ ایمان ڈانٹ سے نہیں، ربط سے منتقل ہوتا ہے۔

ایک اور افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ بہت سے والدین دین کو خوف کی زبان میں پیش کرتے ہیں—اللہ کو سزا دینے والا، دین کو پابندی، اور مذہبی زندگی کو خوشی کے خاتمے کے طور پر۔ اس کے نتیجے میں بچہ دین سے نہیں بلکہ دین کے تصور سے خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ وہ بڑا ہو کر یا تو دین سے بھاگتا ہے یا اسے صرف مجبوری میں نبھاتا ہے۔

حالانکہ قرآنِ مجید اللہ تعالیٰ کا تعارف یوں کراتا ہے:

(اے پیغمبر) میرے بندوں کو بتا دو کہ میں بڑا بخشنے والا (اور) مہربان ہوں۔ (سورۃ الحجر: آیت 49)

دین کا اصل پیغام خوف نہیں بلکہ رحمت، توازن اور امید ہے۔

والدین کی باہمی کشیدگی، طلاق، یا مستقل جھگڑا بھی اولاد کو دین سے دور کرنے کا ایک بڑا سبب بنتا ہے۔ جب بچہ دیکھتا ہے کہ دین کے دعوے دار گھر میں سکون پیدا نہیں کر سکے تو وہ لاشعوری طور پر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ شاید دین عملی زندگی کے قابل نہیں۔ یہ تاثر اگرچہ غلط ہوتا ہے، مگر اس کی جڑیں بچپن میں بہت گہری ہوتی ہیں۔

قرآنِ مجید ازدواجی رشتے کو سکون کی بنیاد قرار دیتا ہے:

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے آرام پاؤ اس نے تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی قائم کردی، یقیناً غور و فکر کرنے والوں کے لئے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ (سورۃ الروم: آیت 21)

جب یہ مودّت اور رحمت گھر سے غائب ہو جائے تو ایمان کا چراغ بھی مدھم پڑنے لگتا ہے۔

مرکزی نکتہ یہ ہے کہ والدین چاہے جتنے مخلص ہوں، اگر ان کا دین گفتگو میں ہو مگر کردار میں نہ ہو، احکام میں ہو مگر محبت میں نہ ہو، اور رسم میں ہو مگر ربط میں نہ ہو—تو اولاد دین سے جذباتی اور عملی طور پر دور ہوتی چلی جاتی ہے۔

یہ دوری بغاوت کی صورت میں نہیں بلکہ خاموش لاتعلقی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، جو زیادہ خطرناک ہے کیونکہ اس کا احساس بہت دیر سے ہوتا ہے۔

(ازدواجی تعلقات کی کمزوری، گھریلو تنازعات، اور بچوں کی دینی و نفسیاتی تشکیل پر ان کے اثرات)

خاندان کی عمارت اگر کسی ایک ستون پر کھڑی ہے تو وہ میاں بیوی کا رشتہ ہے۔

یہی رشتہ گھر کے ماحول کو یا تو سکون، اعتماد اور تحفظ دیتا ہے، یا بے چینی، خوف اور عدمِ استحکام میں بدل دیتا ہے۔ اسلام نے اس رشتے کو محض سماجی معاہدہ نہیں بلکہ اللہ کی نشانی قرار دیا ہے، کیونکہ اسی کے ذریعے انسان جذباتی، اخلاقی اور روحانی توازن حاصل کرتا ہے۔

قرآنِ مجید ازدواجی رشتے کا تعارف یوں کراتا ہے:

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے آرام پاؤ اس نے تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی قائم کر دی، یقیناً غور و فکر کرنے والوں کے لئے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ (سورۃ الروم: آیت 21)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ نکاح کا بنیادی مقصد سکون ہے—اور جب یہ سکون ختم ہو جائے تو اس کے اثرات صرف میاں بیوی تک محدود نہیں رہتے بلکہ پوری نسل پر مرتب ہوتے ہیں۔

مسلمانوں میں دین سے دوری کے اسباب میں ازدواجی کشیدگی ایک ایسا عنصر ہے جس پر کم بات کی جاتی ہے، مگر اس کے نتائج نہایت گہرے ہوتے ہیں۔ جب گھر میں مستقل جھگڑا، طعن و تشنیع، بے اعتمادی یا خاموش سرد مہری ہو تو بچے کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ محبت، احترام اور دین کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ دین کی باتیں تو کی جا رہی ہیں، مگر دین وہ سکون پیدا نہیں کر سکا جس کا دعویٰ کیا جاتا ہے—اور یہی تضاد اس کے دل میں دین کے بارے میں شکوک پیدا کرتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے ازدواجی حسنِ سلوک کو ایمان سے جوڑا: ''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل کے لیے بہترین ہے اور میں اپنے اہل کے حق میں سب سے بہتر ہوں۔'' (سلسلہ احادیث صحیحہ حدیث: 1507)

یعنی تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہلِ خانہ کے لیے بہتر ہو۔ جب گھر کے اندر خیر باقی نہ رہے تو دین محض الفاظ میں قید ہو جاتا ہے۔

گھریلو تنازعات کا ایک سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ بچے ان جھگڑوں کو اپنی ذات سے جوڑ لیتے ہیں۔ وہ خود کو غیر محفوظ، ناپسندیدہ یا بوجھ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس عدمِ تحفظ میں بچہ یا تو حد سے زیادہ خاموش ہو جاتا ہے یا باغی — اور دونوں صورتوں میں اس کا اللہ پر اعتماد اور دین سے جذباتی رشتہ کمزور پڑ جاتا ہے۔

قرآنِ مجید نے گھر کو سکون کی جگہ قرار دیا تھا، مگر جب وہ خوف اور اضطراب کا مرکز بن جائے تو ایمان کے لیے وہ فضا باقی نہیں رہتی جس میں یقین پنپتا ہے:

میاں بیوی کے تعلق میں سب سے زیادہ نقصان دہ چیز احترام کا خاتمہ ہے۔ جب ایک دوسرے کی تضحیک، بے قدری اور تحقیر معمول بن جائے تو بچے لاشعوری طور پر یہ سیکھتے ہیں کہ طاقت حق ہے، آواز دلیل ہے، اور محبت کمزوری ہے۔

ایسے ماحول میں پلا بچہ بعد میں یا تو دین کی نرمی کو کمزوری سمجھتا ہے یا خود سخت اور بے لچک ہو جاتا ہے — اور دونوں صورتوں میں دین کی اصل روح اس سے اوجھل رہتی ہے۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کو ایک دوسرے کے لیے لباس قرار دیتا ہے:

وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کے لباس ہو (سورۃ البقرہ: آیت 187)

لباس تحفظ، پردہ اور زینت ہوتا ہے — جب یہ تصور ختم ہو جائے تو رشتہ محض ذمہ داری بن کر رہ جاتا ہے، عبادت نہیں۔

طلاق یا مستقل علیحدگی بچوں کے لیے ایک شدید نفسیاتی زلزلہ ہوتی ہے، خاص طور پر اس وقت جب یہ عمل تلخی، الزام تراشی اور دین کے نام پر ہو۔ اگر بچہ یہ دیکھے کہ قرآن اور حدیث کے حوالے دے کر ایک دوسرے کو اذیت دی جا رہی ہے، تو اس کے دل میں دین کے لیے احترام کے بجائے بدگمانی پیدا ہوتی ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ شاید دین مسائل حل نہیں کرتا بلکہ بڑھاتا ہے — حالانکہ اصل خرابی دین کے استعمال میں ہوتی ہے، دین میں نہیں۔

قرآنِ مجید نے اختلاف کی صورت میں بھی عدل، احسان اور تقویٰ کی تلقین کی ہے:

طلاق (صرف) دو بار ہے (یعنی جب دو دفعہ طلاق دے دی جائے تو) پھر (عورتوں کو) یا تو بطریق شائستہ (نکاح میں) رہنے دینا یا بھلائی کے ساتھ چھوڑ دینا۔ (سورۃ البقرہ: آیت 229)

یہ آیت بتاتی ہے کہ حتیٰ کہ علیحدگی بھی اخلاق اور ایمان کے دائرے میں ہونی چاہیے۔

ازدواجی رشتے کی کمزوری کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ والدین اپنی جذباتی ناکامی کا بوجھ اولاد پر منتقل کر دیتے ہیں — کبھی لاشعوری طور پر، کبھی دانستہ۔ بچہ اس کشمکش میں پلتا ہے تو اس کے لیے دین راحت کے بجائے مزید دباؤ کی علامت بن جاتا ہے، کیونکہ دین کا نام اکثر تناؤ کے لمحوں میں لیا جاتا ہے، سکون کے لمحوں میں نہیں۔

نبی کریم ﷺ کی گھریلو زندگی اس کے برعکس نمونہ ہے۔ آپ ﷺ گھر میں نرمی، مسکراہٹ، خدمت اور برداشت کا پیکر تھے — یہی وہ ماحول تھا جس میں ایمان خوشی کے ساتھ جیا جاتا تھا، نہ کہ خوف کے ساتھ۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب ازدواجی رشتہ کمزور، متنازع یا بے روح ہو جائے تو اس کا سب سے گہرا نقصان بچوں کے دینی اعتماد کو پہنچتا ہے۔ وہ دین سے لڑتا نہیں، مگر اسے زندگی کے مسائل کا حل ماننا چھوڑ دیتا ہے—اور یہی دین سے دوری کی سب سے خاموش اور خطرناک شکل ہے۔

(جدید طرزِ زندگی، مصروفیت، اور خاندانی روابط کے ٹوٹنے کے دینی اثرات)

ہر دور کی اپنی آزمائش ہوتی ہے۔ ماضی میں خاندان بیرونی خطرات، غربت یا جاہلیت کے دباؤ سے ٹوٹتا تھا، مگر آج خاندان جس چیز سے سب سے زیادہ متاثر ہو رہا ہے وہ طرزِ زندگی ہے—ایک ایسا طرزِ زندگی جو بظاہر سہولت، ترقی اور آزادی کا نام ہے، مگر حقیقت میں وقت، توجہ اور تعلقات کو نگل جاتا ہے۔ یہ وہ خاموش تبدیلی ہے جس نے گھر کو چھت تو دیا، مگر روح چھین لی۔

اسلام نے انسانی زندگی کو توازن پر قائم کیا تھا۔ کام عبادت تھا، عبادت زندگی کا حصہ تھی، اور خاندان ان دونوں کا مرکز۔ مگر جدید طرزِ زندگی نے اس توازن کو بگاڑ دیا۔ آج والدین صبح سے شام تک مصروف ہیں، بچے اپنی اسکرینوں میں گم ہیں، اور گھر محض ایک جگہ بن کر رہ گیا ہے—رشتہ نہیں۔ ایسے ماحول میں دین، جو توجہ، تسلسل اور تعلق مانگتا ہے، خود بخود کمزور پڑ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں ارشاد فرمایا:

اور جو کچھ اللہ تعالی نے تجھے دے رکھا ہے اس میں سے آخرت کے گھر کی تلاش بھی رکھ اور اپنے دنیوی حصے کو بھی نہ بھول (سورۃ القصص: آیت 77)

یہ آیت توازن سکھاتی ہے، مگر جدید طرزِ زندگی دنیا کو سب کچھ اور آخرت کو موخر کر

دیتا ہے—اور یہی الٹ پھیر خاندانی زوال کی جڑ ہے۔

مصروفیت بذاتِ خود برائی نہیں، مگر جب مصروفیت ترجیح بن جائے تو رشتے بوجھ محسوس ہونے لگتے ہیں۔ ماں باپ بچوں کے ساتھ وقت گزارنے کے بجائے انہیں سہولتیں دے کر مطمئن ہو جاتے ہیں، اور بچے والدین کی قربت کے بجائے ڈیجیٹل دنیا میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ اس فاصلے میں نہ صرف جذباتی تعلق ٹوٹتا ہے بلکہ دین کی منتقلی کا قدرتی عمل بھی رک جاتا ہے، کیونکہ دین وقت مانگتا ہے، گفتگو مانگتا ہے، اور ساتھ چلنے کا تقاضا کرتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی زندگی اس کے برعکس تھی۔ آپ ﷺ مصروف ترین انسان ہونے کے باوجود گھر والوں کے لیے وقت نکالتے، بچوں کے ساتھ کھیلتے، اور اہلِ خانہ کے جذبات کا خیال رکھتے تھے۔ یہی وہ عملی نمونہ تھا جس میں دین زندگی سے الگ نہیں بلکہ زندگی کے اندر تھا۔

جدید طرزِ زندگی نے خاندان کے اندر مشترکہ لمحات چھین لیے ہیں۔ وہ لمحات جن میں اکٹھا کھانا کھایا جاتا تھا، ایک دوسرے کی بات سنی جاتی تھی، اور روزمرہ زندگی کے ذریعے اقدار منتقل ہوتی تھیں۔ جب یہ لمحات ختم ہو جائیں تو دین کتابوں اور خطبوں تک محدود ہو جاتا ہے، دلوں تک نہیں پہنچ پاتا۔

قرآنِ مجید نے اہلِ ایمان کو یوں نصیحت کی ہے:

اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دے اور اس پر خوب پابند رہ (سورۃ طٰہٰ: آیت 132)

یہ حکم صرف نماز کی تلقین نہیں بلکہ گھریلو ماحول کی تشکیل کا تقاضا ہے—اور یہ ماحول وقت اور توجہ کے بغیر ممکن نہیں۔

جدید زندگی کا ایک اور نقصان یہ ہے کہ اس نے خاندان کو افراد کے مجموعے میں بدل دیا ہے۔ ہر شخص اپنی دنیا میں مصروف ہے، اپنے شیڈول، اپنی اسکرین اور اپنی ترجیحات کے ساتھ۔ اس انفرادیت میں دین مشترک قدر نہیں رہتا بلکہ ہر فرد کا ذاتی معاملہ بن جاتا ہے—اور جب دین مشترک نہ رہے تو خاندان کی شناخت بھی بکھر جاتی ہے۔

اسلام اس انفرادیت کے مقابلے میں اجتماعیت سکھاتا ہے۔ نماز جماعت سے لے کر روزہ و عید تک، دین انسان کو تنہا نہیں بلکہ ساتھ جینے کی تربیت دیتا ہے۔ مگر جب گھر ہی اجتماعیت سے خالی ہو جائے تو دین کی یہ اجتماعی روح نئی نسل کے لیے اجنبی بن جاتی ہے۔

سہولتوں کی فراوانی نے قربانی کی قدر بھی کم کر دی ہے۔ جب ہر چیز آسانی سے مل جائے تو صبر، برداشت اور شکر جیسے اوصاف کمزور پڑ جاتے ہیں—حالانکہ یہی اوصاف ایمان کی بنیاد ہیں۔ جدید طرزِ زندگی میں پرورش پانے والا بچہ دین کی حدود کو اکثر رکاوٹ سمجھتا ہے، کیونکہ اسے ضبط، انتظار اور قناعت کی تربیت ہی نہیں ملی ہوتی۔

قرآنِ مجید نفس کی اس بے لگامی کو یوں بیان کرتا ہے:

مگر انسان سرکش ہو جاتا ہے۔ جب کہ اپنے تئیں غنی دیکھتا ہے۔ (سورۃ العلق: آیات 6-7)

جب انسان خود کو بے نیاز سمجھنے لگے تو سرکشی پیدا ہوتی ہے—اور یہی کیفیت آج کے خاندانی ماحول میں نظر آتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جدید طرزِ زندگی نے خاندان کو ٹکراؤ سے نہیں بلکہ غفلت سے کمزور کیا ہے۔ نہ کوئی اعلانِ بغاوت ہے، نہ دین دشمنی—بس وقت نہیں، توجہ نہیں، اور ساتھ بیٹھنے کی عادت نہیں۔ اسی خاموشی میں دین نئی نسل کے لیے غیر مرکزی بنتا چلا جاتا

ہے۔

یہی وہ نکتہ ہے جہاں ہمیں رک کر سوچنا ہوگا کہ اگر گھر ہی دین کے لیے جگہ نہ بنے تو مسجد، مدرسہ یا معاشرہ اس خلا کو مکمل طور پر پُر نہیں کرسکتا۔

(طلاق، سنگل پیرنٹنگ، اور ٹوٹے ہوئے خاندانوں میں دین کی منتقلی کے مسائل)

اسلام حقیقت پسند دین ہے۔ وہ انسانی کمزوریوں سے انکار نہیں کرتا، اسی لیے طلاق کو حرام نہیں قرار دیا — مگر اسے ناپسندیدہ حل کہا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اسلام فرد کے دکھ سے زیادہ نسل کے مستقبل کو دیکھتا ہے۔ جب ایک خاندان ٹوٹتا ہے تو صرف میاں بیوی الگ نہیں ہوتے، بلکہ ایک ایسا ماحول بکھر جاتا ہے جس میں ایمان، اعتماد اور تعلق پنپتا تھا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے''۔ (سنن ابی داود حدیث: 2178)

یہ حدیث اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ طلاق وقتی حل ہوسکتی ہے، مگر اس کے اثرات طویل اور گہرے ہوتے ہیں — خاص طور پر بچوں کے لیے۔

طلاق یا مستقل علیحدگی کے بعد بچہ سب سے پہلے جس چیز سے محروم ہوتا ہے وہ تحفظ (Security) ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کی دنیا کے دو سب سے مضبوط ستون ایک دوسرے سے جدا ہوگئے ہیں، تو اس کے دل میں ایک مستقل سوال جنم لیتا ہے:

''کیا کوئی رشتہ واقعی قائم رہ سکتا ہے؟''

یہ سوال صرف انسانوں تک محدود نہیں رہتا، بلکہ آہستہ آہستہ اللہ کے ساتھ تعلق پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ وہ لاشعوری طور پر ہر مستقل تعلق پر شک کرنے لگتا ہے۔

قرآنِ مجید اللہ تعالیٰ کو یوں متعارف کراتا ہے:

اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لائے، وہ انھیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے (سورۃ البقرہ: آیت 257)

مگر جس بچے نے انسانی سرپرستی کو ٹوٹتے دیکھا ہو، اس کے لیے اس ولایت کا تصور سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے — یہاں دین کو نئی حساسیت کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، جو اکثر نظرانداز ہو جاتی ہے۔

سنگل پیرنٹنگ بذاتِ خود گناہ یا ناکامی نہیں، مگر یہ ایک غیر معمولی ذمہ داری ہے۔ ایک والد یا ایک ماں جب دونوں کردار نبھانے کی کوشش کرتے ہیں تو اکثر جسمانی اور ذہنی تھکن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس تھکن میں سب سے پہلے جو چیز متاثر ہوتی ہے وہ دینی تربیت ہے، کیونکہ دین وقت، توجہ اور جذباتی موجودگی مانگتا ہے — جو سنگل پیرنٹنگ میں سب سے مشکل ہو جاتا ہے۔

ایسے گھروں میں دین اکثر یا تو خاموش ہو جاتا ہے، یا سختی میں بدل جاتا ہے — اور دونوں صورتیں بچے کو دین سے جوڑنے کے بجائے دور کر دیتی ہیں۔

طلاق کے بعد والدین کا ایک عام مگر خطرناک رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بچے کو اپنے دکھ کا شریک بنا لیتے ہیں۔ کبھی باپ کے خلاف، کبھی ماں کے خلاف باتیں — اور اکثر دین کے حوالوں کے ساتھ۔ بچہ اس کشمکش میں سچ اور جھوٹ کے بجائے محبت اور بقا کا انتخاب کرتا ہے، اور اکثر وہ دین سے اس لیے دور ہوتا ہے کہ دین اس کے لیے تنازع کی زبان بن چکا ہوتا ہے، سکون کی نہیں۔

ٹوٹے ہوئے خاندانوں میں پلنے والے بچوں کے لیے دین سے تعلق کا ایک اور مسئلہ مثالی نمونے (Role Model) کی کمی ہے۔ جب وہ ماں اور باپ کو ایک دوسرے کے ساتھ عدل، صبر اور رحمت میں جیتا ہوا نہیں دیکھ پاتے تو دین کی تعلیمات انہیں نظری

محسوس ہوتی ہیں، عملی نہیں۔ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ دین کتاب میں اچھا ہے، مگر زندگی میں قابلِ عمل نہیں — اور یہی خیال دین سے خاموش لاتعلقی کی بنیاد بنتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی زندگی ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ رشتے ٹوٹیں تو بھی اخلاق نہیں ٹوٹنے چاہئیں۔ آپ ﷺ نے اختلاف، جدائی اور دکھ کے لمحات میں بھی عدل، وقار اور رحمت کو نہیں چھوڑا — یہی وہ پیغام ہے جو ٹوٹے ہوئے خاندانوں میں سب سے زیادہ درکار ہوتا ہے۔

ایک نہایت اہم پہلو یہ ہے کہ اسلام ٹوٹے ہوئے خاندانوں کو مسترد نہیں کرتا بلکہ ان کے لیے اضافی رحمت، حکمت اور سہارا فراہم کرتا ہے۔ مسجد، خاندانِ بزرگ، اور کمیونٹی — یہ سب اس خلا کو پُر کرنے کے لیے ہیں جو ٹوٹے ہوئے گھر چھوڑ جاتے ہیں۔ مگر جب معاشرہ خود ان گھروں کو مشکوک یا کمتر سمجھنے لگے تو بچہ دین کو سہارا نہیں بلکہ مزید تنہائی کی علامت سمجھنے لگتا ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں یاد دلاتا ہے:

بیشک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ (سورۃ الم نشرح: آیت 6)

یہ آیت خاص طور پر ان دلوں کے لیے ہے جو ٹوٹے ہوئے رشتوں کے بوجھ تلے دبے ہوں۔

اس باب کا مجموعی خلاصہ یہ ہے کہ خاندانی نظام کی کمزوری — چاہے وہ والدین کی غفلت ہو، ازدواجی تنازع ہو، جدید طرزِ زندگی ہو یا طلاق — دین سے دوری کی سب سے خاموش مگر سب سے گہری وجہ ہے۔ یہاں دین کے خلاف بغاوت نہیں ہوتی، بلکہ دین کے لیے جگہ ختم ہو جاتی ہے۔

جب گھر ایمان کا پہلا سہارا بننے کے بجائے زخم بن جائے، تو نئی نسل دین سے لڑتی نہیں — بس اس سے فاصلے پر چلی جاتی ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں امید دلاتا ہے:

اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ (سورۃ البقرہ: آیت 213)

ہدایت ہمیشہ ممکن ہے — بشرطیکہ ہم اس کے راستے میں حائل خاموش رکاوٹوں کو پہچان لیں۔

باب 14

دوستی، سماجی حلقے اور Peer Pressure کے ذریعے دین سے دوری

(انسان کی سماجی فطرت، دوستی کی طاقت، اور ایمان پر اس کے ابتدائی اثرات)

انسان فطرتاً تنہا نہیں جیتا۔ وہ سیکھتا بھی معاشرے میں ہے، بگڑتا بھی معاشرے میں ہے، اور سنبھلتا بھی معاشرے کے ذریعے ہے۔ اسی لیے اسلام نے انسان کو فرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ سماجی مخلوق کی حیثیت سے مخاطب کیا ہے۔ انسان جن لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے، جن کے سامنے ہنستا بولتا ہے، اور جن کی رائے کو اہمیت دیتا ہے — وہی لوگ آہستہ آہستہ اس کے ایمان، اخلاق اور ترجیحات کا حصہ بن جاتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے انسان کی اسی سماجی فطرت کو نہایت جامع الفاظ میں بیان فرمایا: ''آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، لہٰذا تم میں سے ہر شخص کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے''۔ (سنن ابی داود حدیث: 4833)

یعنی انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، اس لیے ہر شخص کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے۔ یہ حدیث محض اخلاقی نصیحت نہیں بلکہ نفسیاتی اور سماجی حقیقت کا بیان ہے۔

مسلمانوں میں دین سے دوری کے اسباب میں دوستوں اور سماجی حلقوں کا کردار اس لیے زیادہ خطرناک ہے کہ یہاں دین سے دوری اکثر دلچسپ، نارمل اور قابلِ قبول شکل میں سامنے آتی ہے۔ کوئی نوجوان دین سے اس لیے دور نہیں ہوتا کہ وہ اللہ یا رسول ﷺ کا انکار کرنا چاہتا ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ اپنے دوستوں سے الگ نظر نہیں آنا چاہتا، تنہا نہیں ہونا

چاہتا، اور ''پیچھے رہ جانے'' کا طعنہ برداشت نہیں کر پاتا۔ دنیا میں اپنے دوستوں کے طعنوں سے بچنے کے لیے وہ اپنی آخرت کو تباہ کر لیتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اور جس دن ظالم اپنے دونوں ہاتھ دانتوں سے کاٹے گا، کہے گا اے کاش! میں رسول کے ساتھ کچھ راستہ اختیار کرتا۔ ہائے میری بربادی! کاش کہ میں فلاں کو دلی دوست نہ بناتا۔(سورۃ الفرقان: آیات 28–27)

یہ آیات بتاتی ہیں کہ قیامت کے دن انسان سب سے زیادہ پچھتاتا ہے تو غلط دوستوں کے انتخاب پر۔

دوستی کا اثر اس لیے گہرا ہوتا ہے کہ یہ تعلق اختیار (Choice) کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ خاندان ہمیں مل جاتا ہے، مگر دوست ہم خود چنتے ہیں۔ اسی انتخاب میں انسان اپنی کمزوریاں، خواہشات اور خوف بھی شامل کر لیتا ہے۔ جب دوستی کا معیار اخلاق اور ایمان کے بجائے مزاج، مفاد یا لطف بن جائے تو دین آہستہ آہستہ غیر ضروری لگنے لگتا ہے۔

نوجوانی کا دور خاص طور پر اس حوالے سے نہایت حساس ہوتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں انسان اپنی شناخت بنا رہا ہوتا ہے—وہ جاننا چاہتا ہے کہ

میں کون ہوں؟

مجھے کیسا بننا ہے؟

اور مجھے کس گروہ سے تعلق رکھنا ہے؟

اگر اس مرحلے پر دوستوں کا حلقہ دین سے غافل، مذاق اڑانے والا یا عملی طور پر

لاتعلق ہو تو نوجوان کے لیے دین پر قائم رہنا غیر معمولی جدوجہد بن جاتا ہے۔

قرآنِ مجید نے اس اجتماعی اثر کو یوں بیان کیا ہے:

اور اپنے آپ کو انہیں کے ساتھ رکھا کر جو اپنے پروردگار کو صبح شام پکارتے ہیں (سورۃ الکہف: آیت 28)

یعنی اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ باندھے رکھو جو اللہ کو یاد کرتے ہیں — یہ اس بات کا اعلان ہے کہ ایمان تنہائی میں نہیں بلکہ صحبت میں محفوظ رہتا ہے۔

Peer Pressure ہمیشہ برا نہیں ہوتا، مگر جب اس کا معیار اکثریت، مقبولیت اور لطف بن جائے تو یہ ایمان کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔ نوجوان کو یہ محسوس کرایا جاتا ہے کہ نماز ذاتی معاملہ ہے، دین نجی پسند ہے، اور مذہبی سنجیدگی ''Over'' ہے۔

یہ سب باتیں بظاہر نرم، مہذب اور غیر جارحانہ لگتی ہیں، مگر حقیقت میں یہ دین کو مرکز سے ہٹا کر کنارے لگا دیتی ہیں۔

قرآنِ مجید ہمیں خبردار کرتا ہے:

اور دنیا میں زیادہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کا کہنا ماننے لگیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بے راہ کر دیں (سورۃ الأنعام: آیت 116)

اکثریت کی پیروی ہمیشہ ہدایت نہیں دیتی — خاص طور پر جب اکثریت خود مقصد سے غافل ہو۔

سماجی حلقوں کا ایک اور خطرناک اثر یہ ہے کہ وہ گناہ کو اجتماعی تجربہ بنا دیتے ہیں۔ جو کام اکیلے میں ضمیر ملامت کرتا تھا، دوستوں کے درمیان ہنسی مذاق بن جاتا ہے۔ اسی عمل میں حرام حلال کی سرحد دھندلا جاتی ہے، اور دین اخلاقی معیار کے بجائے ذاتی ذوق بن کر

رہ جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اس کیفیت کو نہایت بلیغ مثال سے سمجھایا: ''نیک اور برے دوست کی مثال مشک ساتھ رکھنے والے اور بھٹی دھونکنے والے کی سی ہے (جس کے پاس مشک ہے اور تم اس کی محبت میں ہو) وہ اس میں سے یا تمہیں کچھ تحفہ کے طور پر دے گا یا تم اس سے خرید سکو گے یا (کم از کم) تم اس کی عمدہ خوشبو سے تو محظوظ ہو ہی سکو گے اور بھٹی دھونکنے والا یا تمہارے کپڑے (بھٹی کی آگ سے) جلا دے گا یا تمہیں اس کے پاس سے ایک ناگوار بدبودار دھواں پہنچے گا۔'' (صحیح البخاری حدیث: 5534)

اچھی صحبت خوشبو کی مانند ہے اور بری صحبت آگ کی بھٹی کی طرح—انسان چاہے یا نہ چاہے، اثر ضرور لیتا ہے۔

بنیادی نکتہ یہ ہے کہ دین سے دوری اکثر نظری اختلاف سے شروع نہیں ہوتی بلکہ صحبت کے انتخاب سے شروع ہوتی ہے۔ انسان دین کو رد نہیں کرتا، بس اس کے لیے جگہ کم کرتا چلا جاتا ہے—اور یہ جگہ سب سے پہلے دوستوں کے حلقے میں کم ہوتی ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں رک کر یہ سوال پوچھنا ہوتا ہے کہ

ہم کس کے ساتھ ہنس رہے ہیں؟

کس کے ساتھ وقت گزار رہے ہیں؟

اور کس کے ساتھ اپنی شناخت بنا رہے ہیں؟

(نوجوانی، قبولیت کی خواہش، گروہی دباؤ اور دین سے عملی سمجھوتے)

نوجوانی زندگی کا وہ مرحلہ ہے جہاں انسان سب سے زیادہ لوگوں کی نظر میں جینا سیکھتا ہے۔ اسے یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ لوگ کیا سوچیں گے، میں کیسا نظر آؤں گا، اور میں

کس گروہ میں شمار ہوں گا۔ یہی وہ عمر ہے جہاں قبولیت کی خواہش، تعریف کی طلب، اور تنہائی کا خوف انسان کے فیصلوں پر خاموشی سے حاوی ہو جاتا ہے۔ اسلام اس فطری کمزوری سے انکار نہیں کرتا، مگر اس کے نتائج سے خبردار ضرور کرتا ہے۔

قرآنِ مجید انسان کی اسی نفسیاتی کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے:

بلکہ انسان خود اپنے اوپر آپ حجت ہے۔ اگر چہ کتنے ہی بہانے پیش کرے۔ (سورۃ القیامہ: آیات 15–14)

انسان جانتا ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے، مگر اکثر اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لیے جواز تلاش کر لیتا ہے—اور نوجوانی میں یہ جواز اکثر دوستوں کی رضا بن جاتی ہے۔

گروہی دباؤ شاذ و نادر ہی زبردستی کی صورت میں آتا ہے۔ یہ نہ تو حکم دیتا ہے، نہ دھمکاتا ہے، بلکہ طنز، مذاق، خاموشی اور نظر اندازی کے ذریعے کام کرتا ہے۔ نماز پڑھنے پر ہنسی، حلال و حرام کی پابندی پر تعجب، اور دینی سنجیدگی پر ''Overthinking'' کا لیبل—یہ سب وہ نرم ہتھیار ہیں جو نوجوان کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ اگر قبول ہونا ہے تو دین کو پسِ پشت ڈالنا ہوگا۔

قرآنِ مجید نے اسی رویّے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

پس تو ان جھٹلانے والوں کا کہنا مت مان۔ (سورۃ القلم: آیت 8)

یہ اطاعت صرف زبان سے نہیں ہوتی بلکہ طرزِ زندگی میں سمجھوتے کے ذریعے بھی ہوتی ہے۔

اس مرحلے پر نوجوان دین کو رد نہیں کرتا بلکہ اسے موخر کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ نماز غلط ہے، بلکہ کہتا ہے **''ابھی وقت نہیں''**؛ وہ یہ نہیں کہتا کہ حرام درست ہے، بلکہ کہتا ہے

''سب یہی کرتے ہیں''۔ یہی وقتی سمجھوتے جب بار بار ہوں تو وہ عادت بن جاتے ہیں، اور عادت آخر کار شناخت میں بدل جاتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اس چیز کو چھوڑ دو جو تمہیں شک میں ڈالے اور اسے اختیار کرو جو تمہیں شک میں نہ ڈالے، سچائی دل کو مطمئن کرتی ہے، اور جھوٹ دل کو بے قرار کرتا اور شک میں مبتلا کرتا ہے۔'' (سنن ترمذی حدیث: 2518)

یعنی شک والی چیز چھوڑ دو — مگر نوجوانی میں شک والی چیز چھوڑنا اس لیے مشکل ہوتا ہے کہ وہ چیز اکثر دوستوں کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔

قبولیت کی خواہش کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ انسان آہستہ آہستہ اپنے ضمیر کی آواز دبانا سیکھ لیتا ہے۔ جو دل پہلے ملامت کرتا تھا، اب خاموش ہو جاتا ہے۔ جو عمل پہلے اضطراب دیتا تھا، اب نارمل لگنے لگتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں دین سے دوری کسی نظری فیصلے کے بغیر، محض سماجی مطابقت (Social Adjustment) کے نتیجے میں پیدا ہو جاتی ہے۔

قرآنِ مجید اس کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے:

یوں نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کی اعمال کی وجہ سے زنگ (چڑھ گیا) ہے۔ (سورۃ المطففین: آیت 14)

یعنی اعمال دل پر پردہ ڈال دیتے ہیں — اور یہ پردہ اکثر بار بار کیے گئے چھوٹے سمجھوتوں سے بنتا ہے۔

نوجوانی میں ایک اور شدید خوف اکیلے رہ جانے کا خوف ہوتا ہے۔ انسان یہ برداشت کر لیتا ہے کہ وہ غلط کرے، مگر یہ برداشت نہیں کر پاتا کہ وہ تنہا ہو جائے۔ یہی خوف

اسے دین کے معاملے میں بھی خاموش کر دیتا ہے۔ وہ اپنے ایمان کو دل میں رکھ لیتا ہے مگر زبان اور عمل میں اس کا اظہار کم کر دیتا ہے — اور یہی خاموشی آہستہ آہستہ کمزوری میں بدل جاتی ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں یاد دلاتا ہے:

یہ تو شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، تو تم ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو، اگر تم مومن ہو۔ (سورۃ آل عمران: آیت 175)

یہ خوف حقیقی نہیں ہوتا، مگر اس کا اثر بہت حقیقی ہوتا ہے — خاص طور پر اس دل پر جو قبولیت کا بھوکا ہو۔

گروہی دباؤ کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ وہ اقدار کو مذاق میں بدل دیتا ہے۔ جس چیز پر کبھی سنجیدگی سے عمل کیا جاتا تھا، اب اس پر لطیفہ بنایا جاتا ہے۔ دین کے شعائر، اہلِ دین کے انداز، اور عبادت کی سنجیدگی — سب کچھ ہنسی میں اڑا دیا جاتا ہے۔ نوجوان اس مذاق میں شریک ہو کر وقتی راحت محسوس کرتا ہے، مگر اندر سے اس کا دین کے ساتھ احترام کا رشتہ کمزور پڑنے لگتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اسے چاہیئے کہ اچھی بات زبان سے نکالے ورنہ چپ رہے۔“ (صحیح البخاری حدیث: 6138)

یہ حدیث ہمیں سکھاتی ہے کہ خاموشی بھی کبھی کبھی ایمان کی حفاظت ہوتی ہے — مگر نوجوانی میں خاموشی اکثر بزدلی میں بدل جاتی ہے، اور یہی بزدلی دین سے عملی فاصلہ پیدا کرتی ہے۔

مرکزی نکتہ یہ ہے کہ دین سے دوری ہمیشہ بغاوت سے نہیں آتی، بلکہ اکثر قبولیت کی قیمت کے طور پر آتی ہے۔ نوجوان یہ قربانی شعوری طور پر نہیں دیتا، بلکہ قدم بہ قدم، موقع بہ موقع، اور دوستوں کے ساتھ چلتے ہوئے دے دیتا ہے— حتیٰ کہ ایک دن اسے خود احساس ہوتا ہے کہ وہ دین سے کافی دور آ چکا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں سمجھنا ہوگا کہ دین کو چھوڑنا ہمیشہ ایک فیصلہ نہیں ہوتا، اکثر یہ ایک سمجھوتہ ہوتا ہے—اور سمجھوتے سب سے پہلے دوستوں کے دائرے میں کیے جاتے ہیں۔

(غلط صحبت، اجتماعی گناہ، اور ضمیر کی بتدریج موت)

انسان کا ضمیر فطری طور پر زندہ، حساس اور سچ کی طرف مائل ہوتا ہے۔ جب انسان پہلی مرتبہ کسی غلط عمل کے قریب جاتا ہے تو دل میں بے چینی، خوف اور جھجک پیدا ہوتی ہے۔ یہی کیفیت اللہ کی طرف سے عطا کردہ وہ داخلی نظامِ تنبیہ ہے جو انسان کو گناہ سے روکتا ہے۔ مگر جب یہی گناہ اکیلے کے بجائے اجتماعی صورت اختیار کر لے، تو ضمیر کی یہ آواز آہستہ آہستہ دبنے لگتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اسی حقیقت کو نہایت واضح انداز میں بیان فرمایا: ’’بلا شبہ حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان شبہات ہیں لوگوں کی بڑی تعداد ان کو نہیں جانتی، جو شبہات سے بچا اس نے اپنے دین اور عزت کو بچا لیا اور جو شبہات میں پڑ گیا وہ حرام میں پڑ گیا‘‘ (صحیح مسلم حدیث: 4094)

مگر عملی زندگی میں یہ ’’**واضح**‘‘ ہونا اسی وقت دھندلا جاتا ہے جب حرام کو دوستی، تفریح اور گروہی معمول بنا دیا جائے۔

اجتماعی گناہ کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ وہ گناہ کو اخلاقی مسئلہ نہیں رہنے دیتا بلکہ سماجی سرگرمی بنا دیتا ہے۔ جو کام تنہائی میں ضمیر کو جھنجھوڑتا تھا، وہ دوستوں کے درمیان ہنسی، تصویروں اور یادوں کا حصہ بن جاتا ہے۔ انسان دل میں یہ جواز پیدا کر لیتا ہے کہ

"اگر یہ غلط ہوتا تو سب کیوں کرتے؟"

قرآنِ مجید اس نفسیاتی مغالطے کو یوں بیان کرتا ہے:

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جو (کتاب) اللہ نے نازل فرمائی ہے اُس کی پیروی کرو۔ تو کہتے ہیں کہ ہم تو اسی کی پیروی کریں گے جس پر اپنے باپ دادا کو پایا۔ بھلا اگرچہ شیطان ان کو دوزخ کے عذاب کی طرف بلاتا ہو (تب بھی؟)۔ (سورۃ لقمان: آیت 21)

یعنی ہم وہی کرتے ہیں جو ہم نے دوسروں کو کرتے دیکھا— یہ منطق صرف باپ دادا تک محدود نہیں، بلکہ دوستوں اور سماجی حلقوں پر بھی لاگو ہوتی ہے۔

غلط صحبت انسان کو صرف گناہ پر آمادہ نہیں کرتی، بلکہ گناہ کے احساس سے آزاد کر دیتی ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں دین سے دوری کسی بغاوت یا اعلان کے بغیر مکمل ہو جاتی ہے۔ انسان نماز نہ پڑھنے پر شرمندہ نہیں ہوتا، حرام پر دل نہیں دھڑکتا، اور حدودِ الٰہی اس کے لیے نظری گفتگو بن جاتی ہیں۔

قرآنِ مجید نے اس کیفیت کو یوں بیان کیا ہے:

پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔ گویا وہ پتھر ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت۔ (سورۃ البقرہ: آیت 74)

دل کا سخت ہونا صرف ظلم یا کفر سے نہیں ہوتا، بلکہ مسلسل ضمیر کو نظر انداز کرنے

سے بھی ہوتا ہے۔

غلط صحبت کا ایک اور گہرا اثر یہ ہے کہ وہ دینی اقدار کا مذاق اڑانے کو معمول بنا دیتی ہے۔ جب کسی مجلس میں دین سنجیدگی کے بجائے لطیفے، طنز یا پرانی سوچ کے طور پر پیش ہو، تو نوجوان کے دل میں دین کے لیے احترام کم ہونے لگتا ہے—اور احترام کے بغیر ایمان محض معلومات بن کر رہ جاتا ہے۔

قرآنِ مجید اس رویّے کے بارے میں سخت تنبیہ کرتا ہے:

بہانے مت بناؤ تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو چکے ہو۔ (سورۃ التوبہ: آیت 66)

یہ آیت اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ دین کا مذاق ایمان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے، چاہے زبان پر انکار نہ بھی ہو۔

اجتماعی گناہ کا سب سے المناک انجام یہ ہے کہ انسان توبہ کی ضرورت محسوس کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ میں صحیح ہوں، بلکہ یہ کہتا ہے **"سب ایسے ہی ہیں"**۔ یہی سوچ توبہ اور اصلاح کے دروازے بند کر دیتی ہے، کیونکہ توبہ کا پہلا قدم احساسِ خطا ہے—اور اجتماعی ماحول یہی احساس ختم کر دیتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "سارے انسان خطا کار ہیں اور خطا کاروں میں سب سے بہتر وہ ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں"۔ (سنن ترمذی حدیث: 2499)

مگر جب خطا اجتماعی بن جائے تو انسان خود کو **"خطا کار"** سمجھنے کے بجائے **"نارمل"** سمجھنے لگتا ہے۔

غلط صحبت صرف انسان کے اعمال نہیں بدلتی بلکہ اس کے معیارِ خیر و شر کو بھی بدل

دیتی ہے۔ جو چیز کبھی غلط تھی، اب ذاتی آزادی کہلاتی ہے؛ جو کبھی ناپسندیدہ تھی، اب ترقی سمجھی جاتی ہے؛ اور جو کبھی گناہ تھی، اب تجربہ بن جاتی ہے۔ یہی وہ فکری تبدیلی ہے جو دین کو زندگی کے مرکز سے نکال کر حاشیے پر لے جاتی ہے۔

قرآنِ مجید نے اسی الٹ پھیر کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

بھلا جس شخص کو اس کے اعمال بد آراستہ کر کے دکھائے جائیں اور وہ ان کو عمدہ سمجھنے لگے تو (کیا وہ نیکوکار آدمی جیسا ہو سکتا ہے)۔ (سورۃ فاطر: آیت 8)

جب برے عمل کو اچھا دکھایا جائے تو سب سے پہلے ضمیر مرتا ہے۔

مرکزی نکتہ یہ ہے کہ دین سے دوری اکثر ایک دن میں نہیں ہوتی۔ یہ ایک تدریجی عمل ہے—غلط صحبت، اجتماعی گناہ، اور مسلسل سمجھوتے مل کر انسان کے اندر سے احساسِ جواب دہی کو ختم کر دیتے ہیں۔ انسان اللہ سے دشمنی نہیں کرتا، بس اسے یاد رکھنا چھوڑ دیتا ہے—اور یہی بھول سب سے بڑا نقصان ہے۔

اگر ایمان کو بچانا ہے تو صرف علم کافی نہیں، صحبت کی اصلاح بھی ضروری ہے۔ کیونکہ جہاں صحبت گمراہ ہو، وہاں بہترین نیت بھی دیرپا نہیں رہتی۔

(سوشل میڈیا، ڈیجیٹل دوستیاں، اور ایمان پر غیر محسوس حملے)

انسان کی سماجی فطرت ہمیشہ جسمانی موجودگی کی محتاج نہیں رہی۔ ہر دور میں انسان نے اپنے جیسے لوگوں کے ساتھ جڑنے کے نئے طریقے تلاش کیے ہیں۔ مگر موجودہ دور میں سوشل میڈیا نے اس فطرت کو ایک ایسی شکل دے دی ہے جہاں دوستی، قبولیت، اور شناخت اسکرین کے ذریعے تشکیل پاتی ہے۔ یہاں انسان جسمانی طور پر تنہا ہو سکتا ہے، مگر ذہنی اور فکری طور پر ایک ہجوم کے درمیان زندہ رہتا ہے—اور یہی ہجوم ایمان پر سب سے

خاموش دباؤ ڈالتا ہے۔

قرآنِ مجید انسان کے اسی رجحان کی طرف اشارہ کرتا ہے:

انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ (سورۃ النساء: آیت 28)

انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے—اور ڈیجیٹل دنیا نے اس کمزوری کو ایک عالمی نمائش میں بدل دیا ہے، جہاں ہر شخص خود کو دوسروں کے سامنے بہتر ثابت کرنے کی دوڑ میں شامل ہے۔

سوشل میڈیا کا سب سے خطرناک پہلو یہ نہیں کہ وہاں گناہ موجود ہیں، بلکہ یہ ہے کہ وہاں گناہ معمول بن جاتا ہے۔ وہ اعمال جو کبھی نجی اور محدود تھے، اب عوامی، قابلِ داد اور قابلِ تقلید بن چکے ہیں۔ نوجوان جب بار بار ایک ہی رویّے، ایک ہی طرزِ زندگی، اور ایک ہی سوچ کو اسکرین پر دیکھتا ہے تو اس کے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ

"اگر سب یہی دکھا رہے ہیں تو شاید یہی درست ہے۔"

قرآنِ مجید اس کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے:

بلکہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک رستے پر پایا ہے اور ہم انہی کے قدم بقدم چل رہے ہیں۔ (سورۃ الزخرف: آیت 22)

یہ آیت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ تقلید صرف خاندان سے نہیں، بلکہ نظر آنے والی اکثریت سے بھی ہوتی ہے—اور آج یہ اکثریت اسکرین پر نظر آتی ہے۔

ڈیجیٹل دوستیاں اکثر غیر محسوس مگر گہرا اثر رکھتی ہیں۔ یہاں کوئی شخص براہِ راست دین کا انکار نہیں کرتا، بلکہ دین کو **"ذاتی معاملہ"**، **"پرائیویٹ چیز"** یا **"بعد میں دیکھیں گے"** کے خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یہی سوچ آہستہ آہستہ دین کو زندگی کے مرکز سے ہٹا

کر سائیڈ لائن کر دیتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ایمان کی ستر سے زیادہ شاخیں ہیں اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔'' (صحیح مسلم حدیث: 152)

مگر سوشل میڈیا کی دنیا میں حیا کو کمزوری، دقیانوسیت یا غیر ضروری بوجھ سمجھا جانے لگا ہے — اور جب حیا کمزور ہوتی ہے تو ایمان بھی خاموشی سے کمزور ہونے لگتا ہے۔

آن لائن دنیا میں Peer Pressure کی ایک نئی شکل پیدا ہو چکی ہے: Likes، Shares اور Approval۔ یہاں قبولیت الفاظ سے نہیں، نمبروں سے ظاہر ہوتی ہے۔ نوجوان لاشعوری طور پر یہ سیکھ لیتا ہے کہ کون سا عمل داد پاتا ہے اور کون سا نظر انداز ہو جاتا ہے۔ اس انتخاب میں اکثر دین خاموش ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ فوری داد یا مقبولیت فراہم نہیں کرتا۔

قرآنِ مجید ہمیں خبردار کرتا ہے:

اپنی آنکھیں اس چیز کی طرف ہرگز نہ اٹھا جس کے ساتھ ہم نے ان کے مختلف قسم کے لوگوں کو فائدہ دیا ہے (سورۃ الحجر: آیت 88)

یعنی جو کچھ دوسروں کو دیا گیا ہے اس کی طرف نگاہیں نہ پھیلاؤ — یہ حکم آج ڈیجیٹل اسکرین کے سامنے پہلے سے کہیں زیادہ معنی خیز ہو جاتا ہے۔

سوشل میڈیا پر دین سے دوری کا ایک اور پہلو موازنہ (Comparison) ہے۔ نوجوان خود کو دوسروں کی ظاہری کامیابی، آزادی اور خوشی سے تولنے لگتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ دین پابندی ہے، جبکہ دین سے دور لوگ زیادہ آزاد، مطمئن اور کامیاب نظر آتے ہیں۔ حالانکہ یہ تصویر اکثر فلٹر شدہ، منتخب اور ادھوری ہوتی ہے۔

قرآنِ مجید اس دھوکے کی حقیقت یوں بیان کرتا ہے:

تجھے کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا فریب میں نہ ڈال دے۔ (سورۃ آل عمران: آیت 196)

یعنی اہلِ دنیا کی چمک دمک تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے — یہ محض عارضی منظر ہے۔

ڈیجیٹل ماحول میں دین پر حملہ اکثر براہِ راست نہیں ہوتا۔ نہ کوئی کہتا ہے کہ نماز چھوڑ دو، نہ کوئی کہتا ہے کہ ایمان غلط ہے۔ بلکہ کہا جاتا ہے:

"Balance" رکھو

"Extremist" مت بنو

"Life enjoy" کرو

یہ سب جملے بظاہر معقول لگتے ہیں، مگر ان کا عملی نتیجہ دین کو غیر ضروری حد تک محدود کر دینا ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کی جنت ہے۔" (صحیح مسلم حدیث: 7417)

یہ حدیث دنیا سے نفرت نہیں سکھاتی، بلکہ یہ یاد دلاتی ہے کہ اصل آزادی اللہ کی اطاعت میں ہے — مگر سوشل میڈیا اس تصور کو الٹ کر پیش کرتا ہے۔

مرکزی پیغام یہ ہے کہ سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل دوستیاں بذاتِ خود برائی نہیں، مگر جب ان کا استعمال بے لگام، بے مقصد اور بے نگرانی ہو جائے تو یہ ایمان کو اندر سے کمزور کر

دیتی ہیں۔ یہاں دین سے دوری شور کے ساتھ نہیں آتی، بلکہ اسکرول کرتے ہوئے، دیکھتے ہوئے، اور عادی بنتے ہوئے آتی ہے۔

انسان ایک دن جاگ کر یہ نہیں کہتا کہ میں دین چھوڑ رہا ہوں— بلکہ ایک دن یہ محسوس کرتا ہے کہ دین اب اس کی ترجیحات میں شامل ہی نہیں رہا۔

(صحبت کی اصلاح، متبادل سماجی حلقے، اور دین سے دوبارہ جڑنے کے عملی راستے)

اسلام انسان کو یہ تعلیم نہیں دیتا کہ وہ معاشرے سے کٹ جائے، بلکہ یہ سکھاتا ہے کہ وہ صحیح معاشرہ تلاش کرے یا خود تشکیل دے۔ دین کا مسئلہ یہ نہیں کہ انسان دوست رکھتا ہے، مسئلہ یہ ہے کہ انسان کن لوگوں کو اپنی زندگی کے مرکز میں جگہ دیتا ہے۔ صحبت انسان کی روحانی غذا ہے— اگر غذا زہریلی ہو تو جسم نہیں، روح بیمار ہوتی ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں ایک واضح اصول دیتا ہے:

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔ (سورۃ التوبہ: آیت 119)

یہ آیت صرف سچ بولنے کا حکم نہیں، بلکہ سچوں کے ساتھ رہنے کا حکم ہے— کیونکہ انسان جیسا ماحول پاتا ہے، ویسا ہی بن جاتا ہے۔

دین سے دوبارہ جڑنے کا پہلا قدم یہ نہیں کہ انسان سب دوست بدل دے، بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنی قربت کے دائرے کو شعوری طور پر محدود کرے۔ ہر جاننے والا دوست نہیں ہوتا، اور ہر دوست رہنمائی کے قابل نہیں ہوتا۔ ایمان اس وقت مضبوط ہوتا ہے جب انسان کے اردگرد کم از کم کچھ لوگ ایسے ہوں جن کے سامنے اسے دین پر قائم رہنے میں شرمندگی محسوس نہ ہو۔

یعنی انسان اپنے بھائی کے ساتھ مضبوط ہوتا ہے — یہ قوت جسمانی نہیں بلکہ اخلاقی اور ایمانی ہوتی ہے۔

متبادل سماجی حلقے بنانا آج کے دور کی ایک شدید ضرورت ہے۔ اگر نوجوان کو مسجد میں صرف نصیحت ملے، مگر دوستی نہ ملے؛ اگر دینی ماحول میں علم تو ہو، مگر اپنائیت نہ ہو — تو وہ دیرپا نہیں رہتا۔ اسلام نے مسجد کو صرف عبادت گاہ نہیں بلکہ سماجی مرکز بنایا تھا، جہاں سیکھنا، جڑنا اور سنبھلنا — سب کچھ ہوتا تھا۔

قرآنِ مجید میں مسجد کے بارے میں فرمایا گیا:

اللہ کی مسجدیں تو وہی آباد کرتا ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا (سورۃ التوبہ: آیت 18)

مسجد کو آباد کرنا صرف تعمیر نہیں، بلکہ لوگوں کو جوڑنا بھی ہے۔

درست صحبت کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کو اکیلا نہیں پڑنے دیتی۔ ایمان کمزور ہو تو نصیحت کام نہیں آتی، مگر ایک صالح دوست کی خاموش موجودگی انسان کو سنبھال لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اجتماعی عبادات — جماعت، جمعہ، حج — کو اتنی اہمیت دی، تاکہ ایمان فرد کا بوجھ نہ بنے بلکہ اجتماعی طاقت بن جائے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''میں تمہیں اپنے صحابہ کی پیروی کی وصیت کرتا ہوں، پھر ان کے بعد آنے والوں (یعنی تابعین) کی پھر ان کے بعد آنے والوں (یعنی تبع تابعین) کی، پھر جھوٹ عام ہو جائے گا، یہاں تک کہ قسم کھلائے بغیر آدمی قسم کھائے گا اور گواہ گواہی طلب کیے جانے سے پہلے ہی گواہی دے گا، خبردار! جب بھی کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ خلوت میں ہوتا ہے تو ان کے ساتھ تیسرا شیطان ہوتا ہے، تم لوگ جماعت کو لازم پکڑو اور پارٹی بندی سے بچو، کیونکہ شیطان اکیلے آدمی کے ساتھ رہتا ہے، دو کے ساتھ اس کا

رہنا نسبتاً زیادہ دور کی بات ہے، جو شخص جنت کے درمیانی حصہ میں جانا چاہتا ہو وہ جماعت سے لازمی طور پر جڑا رہے اور جسے اپنی نیکی سے خوشی ملے اور گناہ سے غم لاحق ہو حقیقت میں وہی مومن ہے‘‘۔(سنن ترمذی حدیث:2165)

جماعت کو پکڑنے کی تاکید اس لیے کی گئی ہے کہ تنہا انسان جلد ٹوٹ جاتا ہے، مگر جماعت انسان کو سہارا دیتی ہے۔

دین سے دوبارہ جڑنے کا ایک اور عملی راستہ یہ ہے کہ انسان اپنی ڈیجیٹل صحبت کی بھی اصلاح کرے۔ کن لوگوں کو فالو کیا جا رہا ہے؟ کن خیالات کو بار بار دیکھا جا رہا ہے؟ اور کن آوازوں کو دل میں جگہ دی جا رہی ہے؟ یہ سب محض اسکرین کی باتیں نہیں، بلکہ دل کے دروازے ہیں — اور ہر دروازے پر پہرا ضروری ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں بصارت کے بارے میں متنبہ کرتا ہے:

کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک سے پوچھ گچھ کی جانے والی ہے۔ (سورۃ الإسراء: آیت 36)

یعنی جو کچھ ہم دیکھتے، سنتے اور دل میں اتارتے ہیں — سب کا حساب ہے۔

سب سے اہم پیغام یہ ہے کہ دین سے دوری کوئی حتمی انجام نہیں۔ انسان غلط صحبت میں بھی جا سکتا ہے، مگر صحیح صحبت کے ذریعے واپس بھی آ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے رجوع کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھا ہے — بشرطیکہ انسان خود کو اکیلا نہ سمجھے۔

قرآنِ مجید ہمیں امید دلاتا ہے:

کہہ دے اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ (سورۃ الزمر: آیت 53)

یہ آیت صرف گناہ گاروں کے لیے نہیں، بلکہ ان سب کے لیے ہے جو غلط ماحول میں کھو گئے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دوستی اور سماجی حلقے انسان کو یا تو دین سے دور لے جاتے ہیں، یا دین کے قریب۔ مسئلہ دوست رکھنے کا نہیں، مسئلہ دوست بننے اور بنانے کے معیار کا ہے۔ جب ایمان اس معیار میں شامل ہو جائے تو زندگی کا رخ بدلنے لگتا ہے۔

دین تنہائی میں نہیں پنپتا، یہ صحبت میں جیتا ہے، اور صحیح صحبت میں محفوظ رہتا ہے۔

باب 15

تعلیم، نصاب اور جدید تعلیمی نظام کے ذریعے دین سے دوری

(علم کا تصور، تعلیم کی سمت، اور دین و دنیا کی مصنوعی تقسیم)

اسلام کی تاریخ کا آغاز ہی علم سے ہوتا ہے۔ پہلی وحی کا پہلا لفظ "اقرأ" اس بات کا اعلان تھا کہ یہ دین جہالت نہیں بلکہ شعور، فہم اور سیکھنے کا دین ہے۔ مگر تاریخ کے ایک طویل اور پیچیدہ سفر کے بعد آج مسلمان ایک ایسے تعلیمی نظام کا حصہ بن چکے ہیں جہاں علم تو موجود ہے، مگر اس کے ساتھ ہدایت کا رشتہ کمزور پڑ چکا ہے۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اور جب کہا جائے کہ اُٹھ کھڑے ہو تو اُٹھ کھڑے ہوا کرو۔ جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ہیں اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے خدا ان کے درجے بلند کرے گا۔ (سورۃ المجادلہ: آیت 11)

یہ آیت علم کو ایمان کے ساتھ جوڑتی ہے — مگر جدید تعلیمی نظام میں یہ رشتہ اکثر ٹوٹ چکا ہے۔

مسئلہ تعلیم کا نہیں بلکہ تعلیم کی سمت کا ہے۔ جدید نصاب انسان کو معلومات تو دیتا ہے، مگر مقصد نہیں؛ مہارت دیتا ہے، مگر اخلاق نہیں؛ اور کیریئر سکھاتا ہے، مگر جوابدہی کا احساس نہیں دیتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طالبِ علم ذہین تو بن جاتا ہے، مگر معنی کی تلاش میں بھٹکنے لگتا ہے۔

اسلام میں علم کا مقصد صرف دنیاوی کامیابی نہیں بلکہ اللہ کی پہچان ہے۔

قرآنِ مجید میں فرمایا گیا:

اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں (سورۃ فاطر: آیت 28)

یعنی حقیقی علم وہ ہے جو خشیت پیدا کرے— مگر جب علم خشیت کے بغیر دیا جائے تو وہ تکبر، خودکفالت اور بے نیازی میں بدل جاتا ہے۔

جدید تعلیمی نظام کی ایک بنیادی خامی یہ ہے کہ اس نے دین اور دنیا کو دو الگ خانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک طرف **"مذہبی علم"** ہے جو مسجد یا مدرسے تک محدود کر دیا گیا، اور دوسری طرف **"اصل علم"** ہے جو اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس تقسیم نے طالبِ علم کے ذہن میں یہ تاثر پیدا کر دیا کہ دین اضافی چیز ہے، لازمی نہیں۔

قرآنِ مجید اس دوئی (Dualism) کو رد کرتا ہے:

کہہ دے بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے، جو جہانوں کا رب ہے۔ (سورۃ الأنعام: آیت 162)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ دین سے باہر نہیں— مگر نصاب نے زندگی کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے۔

اسکول اور یونیورسٹی کا ماحول طالبِ علم کی سوچ پر نصاب سے بھی زیادہ اثر ڈالتا ہے۔ جب استاد دین کو ذاتی معاملہ کہہ کر الگ رکھ دے، جب اخلاقیات کو "**سبجیکٹو**" قرار دے دیا جائے، اور جب کامیابی کا معیار صرف گریڈ، ڈگری اور تنخواہ بن جائے— تو طالبِ علم لاشعوری طور پر یہ سیکھ لیتا ہے کہ دین زندگی کی مرکزی قدر نہیں۔

نبی کریم ﷺ نے علم کے بارے میں فرمایا: "جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرے اسے دین کی سمجھ عنایت فرما دیتا ہے۔" (صحیح البخاری حدیث: 71)

یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ دین کی سمجھ اللہ کی خاص نعمت ہے — مگر تعلیمی نظام اس نعمت کو غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کرتا ہے۔

جدید تعلیم کا ایک اور اثر یہ ہے کہ وہ طالبِ علم میں سوال کرنے کی عادت تو پیدا کرتی ہے، مگر سچ تک پہنچنے کا اخلاق نہیں سکھاتی۔ سوال جب رہنمائی کے بغیر ہوں تو وہ شک میں بدل جاتے ہیں، اور شک جب جواب دہی کے بغیر ہوں تو ایمان کو کمزور کر دیتے ہیں۔

قرآنِ مجید ہمیں متوازن سوال کا طریقہ سکھاتا ہے:

پس اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے دریافت کرلو۔ (سورۃ النحل: آیت 43)

یعنی سوال کرو — مگر اہلِ علم سے، رہنمائی کے ساتھ۔

مرکزی نکتہ یہ ہے کہ تعلیم جب اللہ سے کٹ جائے تو وہ انسان کو بلند کرنے کے بجائے خالی کر دیتی ہے۔ مسلمان نوجوان دین سے اس لیے دور نہیں ہوتا کہ وہ علم حاصل کر رہا ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ ایسا علم حاصل کر رہا ہے جو اسے یہ نہیں بتاتا کہ

میں کون ہوں؟

میں کیوں ہوں؟

اور مجھے جواب کس کو دینا ہے؟

(سیکولر نصاب، نظریاتی غیر جانبداری کا دعویٰ، اور ایمان کی غیر محسوس نفی)

جدید تعلیمی نظام خود کو عموماً **"غیر جانبدار"** (Neutral) قرار دیتا ہے۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ نصاب کسی مذہب، نظریے یا عقیدے کی نمائندگی نہیں کرتا، بلکہ محض **"حقائق"** اور **"علم"** پیش کرتا ہے۔ بظاہر یہ بات معقول لگتی ہے، مگر گہرائی میں جا کر دیکھا

جائے تو یہ غیر جانبداری دراصل ایک مخصوص نظریے کی نمائندگی ہوتی ہے—ایسا نظریہ جو زندگی، انسان اور کائنات کو اللہ کے ذکر کے بغیر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

قرآنِ مجید اس طرزِ فکر کی جڑ کو یوں واضح کرتا ہے:

یہ تو دنیا کی ظاہری زندگی کو جانتے ہیں۔ اور آخرت (کی طرف) سے غافل ہیں۔ (سورۃ الروم: آیت 7)

یعنی وہ دنیا کے ظاہر کو جانتے ہیں، مگر آخرت سے غافل ہیں—یہی جدید سیکولر علم کی بنیادی کمزوری ہے۔

سیکولر نصاب کا سب سے بڑا مسئلہ یہ نہیں کہ وہ دین کے خلاف بات کرتا ہے، بلکہ یہ ہے کہ وہ دین کے بغیر بات کرتا ہے۔ اللہ، وحی، آخرت، جواب دہی—یہ سب یا تو مکمل طور پر غائب ہوتے ہیں، یا محض تاریخی و ثقافتی تناظر میں پیش کیے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طالبِ علم کے ذہن میں دین مرکزی حقیقت کے بجائے ایک اضافی موضوع بن جاتا ہے۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

کیا اللہ کے بارے میں کوئی شک ہے، جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے؟ (سورۃ ابراہیم: آیت 10)

مگر جدید نصاب میں سوال یہ نہیں اٹھایا جاتا کہ اللہ ہے یا نہیں، بلکہ یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ اللہ تعلیمی گفتگو کا موضوع ہی نہیں۔

نظریاتی غیر جانبداری کا یہ دعویٰ دراصل طالبِ علم کو یہ پیغام دیتا ہے کہ دین نجی معاملہ ہے، علم اجتماعی معاملہ ہے، اور دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔

یہی تقسیم آہستہ آہستہ طالبِ علم کے ذہن میں یہ سوچ بٹھا دیتی ہے کہ دین زندگی کے بڑے فیصلوں — معیشت، سیاست، سائنس، اخلاق — سے غیر متعلق ہے۔ یہ سوچ دین سے براہِ راست دشمنی نہیں، بلکہ عملی لاتعلقی پیدا کرتی ہے۔

قرآنِ مجید اس رویّے کو یوں بیان کرتا ہے:

وہ اللہ کو بھول گئے تو اس نے انھیں بھلا دیا۔ (سورۃ التوبہ: آیت 67)

انہوں نے اللہ کو بھلا دیا، تو اللہ نے بھی انہیں (ان کے حال پر) چھوڑ دیا — یہ بھول اکثر تعلیمی ماحول میں جنم لیتی ہے۔

جدید نصاب میں **"تنقیدی سوچ"** (Critical Thinking) کو بڑی قدر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، مگر اکثر یہ تنقید وحی سے آزاد ہوتی ہے۔ طالبِ علم کو ہر چیز پر سوال کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے، مگر یہ نہیں سکھایا جاتا کہ کچھ سچ ایسے بھی ہوتے ہیں جو سوال سے بالاتر نہیں، بلکہ سوال کی بنیاد ہوتے ہیں۔

اسلام سوال سے نہیں ڈرتا، مگر سوال کو اخلاق، ادب اور رہنمائی کے ساتھ جوڑتا ہے۔

قرآنِ مجید میں فرمایا گیا:

اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے دریافت کرلو۔ (سورۃ النحل: آیت 43)

یعنی سوال کرو — مگر اہلِ علم سے، رہنمائی کے ساتھ۔

سیکولر نصاب کا ایک اور خاموش اثر یہ ہے کہ وہ اخلاق کو نسبتی (Relative) بنا دیتا ہے۔ اچھا اور برا مطلق اقدار نہیں رہتے، بلکہ حالات، معاشرے اور ذاتی پسند پر منحصر ہو جاتے ہیں۔ اس فکری فضا میں حلال و حرام، حق و باطل — سب ذاتی رائے بن جاتے ہیں،

اور دین اپنی اخلاقی اتھارٹی کھو دیتا ہے۔

قرآنِ مجید اس اخلاقی انتشار سے خبردار کرتا ہے:

کیا یہ زمانہ جاہلیت کے حکم کے خواہش مند ہیں؟(سورۃ المائدہ: آیت 50)

یعنی کیا وہ جاہلیت کے فیصلے چاہتے ہیں؟

جب وحی کو فیصلے سے نکال دیا جائے تو یہی جاہلیت جدید شکل میں لوٹ آتی ہے۔

طالبِ علم جب برسوں ایسے نصاب میں تعلیم پاتا ہے جہاں اللہ کا ذکر غیر متعلق ہو، تو وہ دین سے دشمن نہیں بنتا— وہ بس دین کو غیر ضروری سمجھنے لگتا ہے۔ وہ نماز کو ذاتی تسلی سمجھتا ہے، قرآن کو روحانی کتاب، اور شریعت کو قدیم ضابطہ— مگر زندگی کے اصل نظام کہیں اور سے لیتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''چھوڑے جاتا ہوں میں تم میں دو چیزوں کو، نہیں گمراہ ہو گے جب تک پکڑے رہو گے ان کو، کتاب اللہ اور اس کے رسول کی سنت۔'' (موطا امام مالک حدیث:1620)

یعنی قرآن اور سنت ہدایت کا مکمل نظام ہیں، جزوی نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ سیکولر نصاب ایمان کو مٹاتا نہیں، بلکہ غیر مرکزی بنا دیتا ہے۔ اور ایمان جب مرکز سے ہٹ جائے تو وہ زندگی کی رہنمائی نہیں کر پاتا۔ یہی وہ خاموش عمل ہے جس کے ذریعے تعلیم، شعوری طور پر نہیں بلکہ تدریجاً، مسلمانوں کو دین سے دور کر دیتی ہے۔

یہ دوری شور سے نہیں آتی، نہ نعروں سے، بلکہ کلاس روم کی خاموش فضا میں، جہاں اللہ کا ذکر ''**غیر متعلق**'' سمجھا جاتا ہے۔

(اساتذہ کا کردار، تعلیمی ماحول، اور دین کے بارے میں لاشعوری پیغامات)

تعلیم صرف کتابوں سے نہیں ملتی، بلکہ شخصیتوں سے منتقل ہوتی ہے۔ استاد جو کچھ پڑھاتا ہے، اس سے زیادہ اثر وہ طرزِ فکر ڈالتا ہے جو وہ جیتا ہے۔ طالبِ علم استاد کو صرف معلومات کا ذریعہ نہیں سمجھتا، بلکہ اسے ایک مثالی نمونہ (Role Model) کے طور پر دیکھتا ہے— چاہے استاد خود اس کا ادراک رکھتا ہو یا نہیں۔

اسلام نے استاد کے مقام کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اور میں تو صرف معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں''۔ (سنن ابن ماجہ حدیث: 229)

یہ اعلان اس بات کی دلیل ہے کہ تعلیم محض علم نہیں، بلکہ تربیت کا نام ہے۔

جدید تعلیمی اداروں میں اکثر اساتذہ شعوری طور پر دین دشمن نہیں ہوتے، مگر ان کے طرزِ گفتگو، ترجیحات اور ردِ عمل سے ایسے پیغامات منتقل ہوتے ہیں جو دین کو غیر متعلق یا ثانوی بنا دیتے ہیں۔ جب استاد مذہبی سوال کو نظر انداز کر دے، یا دین کا ذکر **''یہاں مناسب نہیں''** کہہ کر روک دے، تو طالبِ علم یہ سیکھ لیتا ہے کہ دین سنجیدہ علمی گفتگو کا حصہ نہیں۔

قرآنِ مجید ہمیں یاد دلاتا ہے:

اور لوگوں سے اچھی بات کہو (سورۃ البقرہ: آیت 83)

لفظ صرف معنی نہیں رکھتے، بلکہ سمت بھی دیتے ہیں— اور استاد کے الفاظ طالبِ علم کی فکری سمت متعین کرتے ہیں۔

تعلیمی ماحول میں دین سے دوری اکثر خاموش اشاروں کے ذریعے ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر:

دینی لباس پر طنزیہ مسکراہٹ،

نماز کے لیے وقت مانگنے پر غیر ضروری سختی،

یا دینی اقدار کو **"ذاتی پسند"** کہہ کر غیر اہم بنا دینا۔

یہ سب عمل کسی نصاب کا حصہ نہیں ہوتے، مگر طالبِ علم کے ذہن میں یہ پیغام واضح کر دیتے ہیں کہ کامیاب، مہذب اور **"Modern"** بننے کے لیے دین کو نمایاں رکھنا ضروری نہیں۔

قرآنِ مجید میں فرمایا گیا:

اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو (سورۃ البقرہ: آیت 42)

لیکن جب تعلیمی ماحول دین کو جدیدیت کے مقابل رکھ دے تو حق دھندلا جاتا ہے۔

استاد کا ایک جملہ — بغیر نیت کے — کبھی کبھی طالبِ علم کے ایمان پر گہرا اثر ڈال دیتا ہے۔ جب کہا جائے:

"یہ سب نظریاتی باتیں ہیں"

"Practical life" میں یہ نہیں چلتا

"Education اور Religion" الگ چیزیں ہیں

تو طالبِ علم کے ذہن میں ایک لکیر کھنچ جاتی ہے جس کے ایک طرف ایمان ہوتا ہے، اور دوسری طرف زندگی — اور یہی لکیر بعد میں دین سے عملی لاتعلقی میں بدل جاتی

ہے۔

استاد بھی راعی ہے — اور اس کی رعیت میں طالبِ علم کا دل اور فکر دونوں شامل ہیں۔

تعلیمی اداروں کا مجموعی ماحول بھی اتنا ہی اثر رکھتا ہے جتنا نصاب یا استاد۔ جب کامیابی کا معیار صرف مقابلہ، نمبرز اور کیریئر ہو؛ جب اخلاق کو غیر نصابی سرگرمی سمجھا جائے؛ اور جب روحانی تربیت کے لیے کوئی جگہ نہ ہو — تو طالبِ علم لاشعوری طور پر یہ سیکھتا ہے کہ دین اضافی بوجھ ہے، بنیادی ضرورت نہیں۔

قرآنِ مجید ہمیں توازن کا درس دیتا ہے:

اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تجھے دے رکھا ہے اس میں سے آخرت کے گھر کی تلاش بھی رکھ اور اپنے دنیوی حصے کو بھی نہ بھول (سورۃ القصص: آیت 77)

یہ آیت دنیا اور آخرت میں توازن سکھاتی ہے، نہ کہ تقسیم — مگر تعلیمی ماحول اس توازن کو بگاڑ دیتا ہے۔

ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ جب استاد خود دین کو صرف ثقافتی یا تاریخی تناظر میں پیش کرتا ہے، تو طالبِ علم کے لیے دین زندہ حقیقت نہیں رہتا۔ وہ اسے ماضی کا موضوع، امتحان کا سوال، یا ذاتی عقیدہ سمجھنے لگتا ہے — زندگی کی رہنمائی نہیں۔

قرآنِ مجید نے اہلِ علم کے بارے میں فرمایا:

وہ لوگ جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں (سورۃ الأحزاب: آیت 39)

یعنی اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچانا اور اللہ سے ڈرتے رہنا — یہی علم کی

اصل روح ہے۔

مرکزی نکتہ یہ ہے کہ دین سے دوری اکثر کلاس روم میں بولی نہیں جاتی، محسوس کی جاتی ہے۔استاد، ماحول اور تعلیمی ترجیحات مل کر طالبِ علم کو یہ سکھا دیتی ہیں کہ

دین اچھا ہے— مگر ضروری نہیں،

محترم ہے— مگر فیصلہ کن نہیں،

اور قابلِ قبول ہے— مگر رہنما نہیں۔

یہی لاشعوری پیغام ایمان کو کمزور کر دیتا ہے—**بغیر کسی کھلے انکار کے۔**

(طلبہ کی نفسیات، تعلیمی دباؤ، کامیابی کا تصور، اور دین سے داخلی کشمکش)

جدید تعلیمی نظام کا سب سے گہرا اثر نصاب یا اساتذہ سے زیادہ طالبِ علم کی نفسیات پر پڑتا ہے۔آج کا طالبِ علم ایک ایسے دباؤ میں جیتا ہے جہاں کامیابی کو نمبر، گریڈ، ڈگری اور نوکری سے ناپا جاتا ہے۔اس مسلسل مقابلے میں اس کے دل میں ایک خوف جنم لیتا ہے:

''اگر میں پیچھے رہ گیا تو کیا ہوگا؟''

یہ خوف آہستہ آہستہ اس کی ترجیحات بدل دیتا ہے—اور سب سے پہلے جس چیز کو وہ **''وقت کی کمی''** کے نام پر پیچھے چھوڑتا ہے، وہ دین ہوتا ہے۔

قرآنِ مجید انسان کی اسی کیفیت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

تمھیں ایک دوسرے سے زیادہ حاصل کرنے کی حرص نے غافل کر دیا۔
(سورۃ التکاثر: آیت 1)

یہ غفلت آج صرف مال کی نہیں، بلکہ نمبرز، رینکنگ اور کیریئر کی بھی ہے۔

طالبِ علم کے ذہن میں کامیابی کا جو تصور بٹھایا جاتا ہے، وہ اکثر آخرت سے کٹا ہوا ہوتا ہے۔ اسے سکھایا جاتا ہے کہ کامیاب وہ ہے جو آگے نکل جائے، زیادہ کما لے، اور دوسروں سے بہتر ثابت ہو جائے۔ اس تصور میں اخلاق، تقویٰ اور خدمت جیسے اوصاف غیر محسوس طور پر ثانوی بن جاتے ہیں۔ دین یہاں رکاوٹ نہیں تو کم از کم غیر ضروری تاخیر سمجھا جانے لگتا ہے۔

قرآنِ مجید کامیابی کا ایک بالکل مختلف معیار پیش کرتا ہے:

جس نے (اپنے) نفس (یعنی روح) کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا۔ (سورۃ الشّمس: آیت 9)

مگر کامیابی کا یہ معیار جدید تعلیمی فضا میں شاذ ہی زیرِ بحث آتا ہے۔

تعلیمی دباؤ کا ایک اور نتیجہ یہ ہے کہ طالبِ علم کے اندر ہمہ وقت اضطراب رہتا ہے۔ امتحان، اسائنمنٹ، مقابلہ، اور مستقبل کی بے یقینی — یہ سب مل کر اس کے ذہن کو مسلسل تھکا دیتے ہیں۔ ایسے میں دین، جو سکون اور اطمینان کا ذریعہ ہونا چاہیے تھا، ایک اضافی ذمہ داری محسوس ہونے لگتا ہے، کیونکہ اسے اس طرح پیش ہی نہیں کیا جاتا کہ وہ سہارا بن سکے۔

قرآنِ مجید ہمیں یاد دلاتا ہے:

سن لو! اللہ کی یاد ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں۔ (سورۃ الرعد: آیت 28)

مگر طالبِ علم کو یہ سکھایا ہی نہیں جاتا کہ ذکر دباؤ کم کرتا ہے، نہ کہ وقت ضائع۔

اس نفسیاتی دباؤ میں طالبِ علم کے دل میں ایک داخلی کشمکش جنم لیتی ہے۔ ایک

طرف وہ جانتا ہے کہ دین حق ہے، ضروری ہے، اور روح کی غذا ہے؛ دوسری طرف اسے محسوس ہوتا ہے کہ اگر اس نے دین کو سنجیدگی سے لیا تو شاید وہ اس دوڑ میں پیچھے رہ جائے گا۔ یہ کشمکش اکثر کسی بغاوت میں نہیں بدلتی، بلکہ خاموش سمجھوتے میں ڈھل جاتی ہے۔

قرآنِ مجید اس دوغلے پن کی طرف اشارہ کرتا ہے:

اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو اللہ کی عبادت ایک کنارے پر کرتا ہے (سورة الحج: آیت 11)

یعنی کچھ لوگ کنارے پر کھڑے ہو کر عبادت کرتے ہیں— نفع ہوا تو ٹھیک، آزمائش آئی تو پیچھے ہٹ گئے۔

یہ کیفیت آج کے طالبِ علم میں نئی صورت اختیار کر چکی ہے۔

تعلیمی اداروں میں "**Time Management**" تو سکھایا جاتا ہے، مگر "**Life Priorities**" نہیں سکھائی جاتیں۔ طالبِ علم کو بتایا جاتا ہے کہ وقت کیسے بچانا ہے، مگر یہ نہیں بتایا جاتا کہ کس چیز کے لیے وقت بچانا ہے؟ چنانچہ وہ وقت تو منظّم کر لیتا ہے، مگر مقصد کھو دیتا ہے—اور دین اس گمشدہ مقصد کا سب سے بڑا شکار بنتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "دو نعمتیں ایسی ہیں کہ اکثر لوگ ان کی قدر نہیں کرتے، صحت اور فراغت۔" (صحیح بخاری حدیث: 6412)

صحت اور فراغت—یہ دونوں نعمتیں طالبِ علم کے پاس ہوتی ہیں، مگر دباؤ کے احساس نے اسے یقین دلا دیا ہوتا ہے کہ اس کے پاس کچھ بھی اضافی نہیں۔

ایک نہایت اہم پہلو یہ ہے کہ تعلیمی نظام طالبِ علم کو کامیاب تو بنانا چاہتا ہے، مگر مطمئن انسان نہیں بناتا۔ جب دل مطمئن نہ ہو تو وہ یا تو دین سے دور ہو جاتا ہے، یا دین کو

محض جذباتی سہارا بنالیتا ہے—نظامِ زندگی نہیں۔

قرآنِ مجید نے ایسے انجام سے خبردار کیا ہے:

اور جو میری نصیحت سے منہ پھیرے گا اس کی زندگی تنگ ہو جائے گی اور قیامت کو ہم اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے۔ (سورۃ طٰہٰ: آیت 124)

یہ تنگی آج کے طالبِ علم کے اضطراب میں صاف نظر آتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جدید تعلیمی دباؤ، کامیابی کے محدود تصور، اور مستقبل کے خوف نے طالبِ علم کو اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں وہ دین کو دل سے مانتا تو ہے، مگر زندگی کے مرکز میں رکھنے سے گھبراتا ہے۔ یہ گھبراہٹ نظری نہیں، نفسیاتی ہے—اور اسی لیے سب سے زیادہ خطرناک ہے۔

(تعلیم کی اصلاح، دینی و دنیاوی علم کا امتزاج، اور دین کی طرف واپسی کے عملی راستے)

اسلام کبھی بھی علم اور دین کو ایک دوسرے کے مقابل نہیں رکھتا۔ تاریخِ اسلام اس بات کی گواہ ہے کہ جب بھی علم اور ایمان ساتھ چلے، تو تہذیب نے جنم لیا؛ اور جب علم ایمان سے کٹ گیا، تو وہ طاقت تو بن گیا مگر ہدایت سے خالی ہو گیا۔ آج مسلمانوں کا اصل مسئلہ تعلیم حاصل کرنا نہیں، بلکہ ایسی تعلیم حاصل کرنا ہے جو انہیں انسان بھی بنائے، بندہ بھی۔

قرآنِ مجید ہمیں علم کے مقصد کی یاددہانی کراتا ہے:

میں نے جنات اور انسانوں کو محض اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری عبادت

کریں۔ (سورۃ الذاریات: آیت 56)

یہ عبادت صرف نماز تک محدود نہیں، بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں اللہ کی اطاعت کا نام ہے — اور تعلیم بھی اسی زندگی کا حصہ ہے، اس سے باہر نہیں۔

تعلیم کی اصلاح کا پہلا قدم یہ سمجھنا ہے کہ دینی اور دنیاوی علم کی تقسیم فطری نہیں، تاریخی ہے۔ ابتدائی اسلامی دور میں فقہ، طب، ریاضی، فلکیات اور فلسفہ — سب ایک ہی فکری کُل کا حصہ تھے، کیونکہ ان سب کا مقصد اللہ کی نشانیوں کو سمجھنا تھا۔

قرآنِ مجید بار بار کائنات پر غور کی دعوت دیتا ہے:

آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے ہیر پھیر میں یقیناً عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ (سورۃ آل عمران: آیت 190)

یہ آیت اس بات کا اعلان ہے کہ سائنسی غور و فکر بھی ایمان کا دروازہ بن سکتا ہے — بشرطیکہ نیت درست ہو۔

واپسی کا دوسرا اہم راستہ تعلیمی ماحول کی اخلاقی تشکیل ہے۔ اگر نصاب میں فوری تبدیلی ممکن نہ بھی ہو، تو کم از کم یہ ممکن ہے کہ کلاس روم میں اخلاق، جواب دہی اور مقصدِ حیات پر بات کی جائے۔ طالبِ علم کو یہ احساس دلایا جائے کہ وہ صرف مستقبل کا ملازم نہیں، بلکہ موجودہ وقت کا امانت دار انسان ہے۔

طالبِ علم کی سطح پر واپسی کا ایک نہایت عملی راستہ یہ ہے کہ وہ دین کو بوجھ کے بجائے سہارا سمجھے۔ جب نماز کو وقت کا دشمن نہیں بلکہ ذہنی سکون کا ذریعہ سمجھا جائے؛ جب قرآن کو امتحان کے مقابل نہیں بلکہ زندگی کی رہنمائی سمجھا جائے — تو دین خود بخود زندگی کے مرکز میں واپس آنے لگتا ہے۔

قرآنِ مجید اس سکون کی ضمانت دیتا ہے:

جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت، لیکن باایمان ہو تو ہم اسے یقیناً نہایت بہتر زندگی عطا فرمائیں گے۔ (سورۃ النحل: آیت 97)

پاکیزہ زندگی صرف معاشی کامیابی سے نہیں، بلکہ ایمان کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔

اساتذہ اور والدین کے لیے بھی یہاں ایک واضح پیغام ہے۔ اگر وہ خود تعلیم اور دین کے درمیان توازن قائم نہ کریں گے تو طالبِ علم کبھی یہ توازن سیکھ نہیں پائے گا۔ بچے وہی سیکھتے ہیں جو وہ دیکھتے ہیں۔ اگر علم اللہ کے بغیر حاصل کیا جائے، تو نئی نسل بھی یہی کرے گی — اور اگر علم کو اللہ کی نشانی سمجھا جائے، تو نئی نسل میں ایمان خود بخود شامل ہو جائے گا۔

قرآنِ مجید میں دعا سکھائی گئی ہے:

میرے پروردگار مجھے اور زیادہ علم دے۔ (سورۃ طٰہٰ: آیت 114)

یہ دعا علم مانگنے کی ہے — مگر ایسے علم کی جو اللہ کے قریب لے جائے، دور نہیں۔

مجموعی خلاصہ یہ ہے کہ جدید تعلیمی نظام مسلمانوں کو دین سے دور اس لیے نہیں کر رہا کہ وہ تعلیم یافتہ ہو رہے ہیں، بلکہ اس لیے کہ وہ ایسی تعلیم پا رہے ہیں جس میں ہدایت شامل نہیں۔ جب علم کا مقصد بدل جائے تو انسان خود کو بھی بھول جاتا ہے۔

دین اور تعلیم کا تعلق ختم نہیں ہوا، بس نظر سے اوجھل ہو گیا ہے — اور جو چیز اوجھل ہو، اسے دوبارہ مرکز میں لایا جا سکتا ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں امید دلاتا ہے:

کسی قوم کی حالت اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اسے نہ بدلیں جوان کے دلوں میں ہے۔ (سورۃ الرعد: آیت 11)

تبدیلی ممکن ہے — مگر شعور، نیت اور سمت کے ساتھ۔

باب 16

میڈیا، تفریحی صنعت، اور شعوری و لاشعوری طور پر دین سے دوری

(میڈیا کی طاقت، ذوق کی تشکیل، اور ایمان پر غیر محسوس اثرات)

تاریخِ انسانی میں شاید کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں انسان کے خیالات، جذبات اور ترجیحات پر میڈیا جیسی ہمہ گیر اور مسلسل گرفت رہی ہو۔ ماضی میں علم استاد سے، اقدار خاندان سے، اور اخلاق معاشرے سے منتقل ہوتے تھے— مگر آج یہ سب کام بڑی حد تک اسکرین نے سنبھال لیا ہے۔ ٹی وی، فلم، ڈرامہ، اشتہارات، سوشل پلیٹ فارمز— یہ سب مل کر انسان کے ذہن میں ایک ایسی دنیا بسا دیتے ہیں جسے وہ حقیقت سمجھنے لگتا ہے۔

قرآنِ مجید انسان کی اس کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے:

یہ تو دنیا کی ظاہری زندگی کو جانتے ہیں۔ اور آخرت (کی طرف) سے غافل ہیں۔ (سورۃ الروم: آیت 7)

یعنی وہ دنیا کے ظاہر کو جان لیتے ہیں— اور میڈیا اسی ظاہر کو اتنا دلکش بنا دیتا ہے کہ باطن نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

میڈیا کی سب سے بڑی طاقت یہ نہیں کہ وہ کیا دکھاتا ہے، بلکہ یہ ہے کہ وہ کس چیز کو معمول (Normal) بنا دیتا ہے۔ جب کوئی رویہ بار بار اسکرین پر دہرایا جائے، تو وہ آہستہ آہستہ قابلِ قبول بن جاتا ہے— چاہے وہ اخلاقی طور پر کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو۔ اس عمل میں دین سے دوری کسی اعلان یا انکار کے بغیر، محض ذوق کی تبدیلی کے ذریعے وقوع پذیر ہوتی ہے۔

قرآنِ مجید خبردار کرتا ہے:

شیطان نے ان کے اعمال بد ان کی نگاہوں میں آراستہ کر دیئے۔ (سورۃ النحل: آیت 63)

شیطان اعمال کو مزین کر دیتا ہے — اور آج یہ تزئین اکثر میڈیا کے ذریعے ہوتی ہے، جہاں گناہ کو آزادی، بے حیائی کو اظہار، اور بغاوت کو خودی کا نام دیا جاتا ہے۔

تفریحی صنعت انسان کو تھکا کر نہیں بلکہ محظوظ کر کے بدلتی ہے۔ نغمہ، کہانی، مزاح اور رومان — یہ سب جذبات کو چھو کر پیغام منتقل کرتے ہیں۔ انسان سوچتا ہے کہ وہ صرف دیکھ رہا ہے، مگر درحقیقت وہ سیکھ رہا ہوتا ہے:

زندگی کا مقصد کیا ہے؟

محبت کس کو کہتے ہیں؟

کامیابی کس شکل میں آتی ہے؟

اور ان سوالات کے جوابات اکثر ایسے ہوتے ہیں جن میں اللہ، آخرت اور جواب دہی کا ذکر تک نہیں ہوتا۔

قرآنِ مجید اس غفلت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں۔ (سورۃ الأعراف: آیت 179)

دل ہوتے ہیں، مگر سمجھ نہیں — کیونکہ دل مسلسل غلط سمت میں مصروف رکھے جائیں تو سمجھ ماند پڑ جاتی ہے۔

میڈیا دین پر حملہ شاذ ہی براہِ راست کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ نماز چھوڑ دو، بلکہ وہ یہ دکھاتا ہے کہ نماز کے بغیر بھی زندگی **''مکمل''** ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ حیا غلط ہے، بلکہ وہ بے حیائی کو کامیابی، مقبولیت اور خوشی کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔ یہی وہ خاموش منطق ہے جو ایمان کو غیر ضروری ثابت کرنے لگتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''روز قیامت ابن آدم کے پاؤں اس وقت تک اللہ تعالیٰ کے پاس سے نہیں کھسک سکیں گے، جب تک اس سے پانچ چیزوں کے بارے پوچھ گچھ نہ کر لی جائے گی، (۱) اس نے اپنی عمر کہاں فنا کی؟ (۲) اپنی نوجوانی کہاں کھپائی؟ (۳) مال کہاں سے اور کیسے کمایا؟ اور (۴) کہاں خرچ کیا؟ اور (۵) اس نے اپنے علم کے مطابق کتنا عمل کیا؟'' (سلسلہ احادیث صحیحہ حدیث: 3773)

انسان سے اس کی زندگی کے بارے میں سوال ہوگا— مگر میڈیا اس سوال کو اسکرین سے ہٹا دیتا ہے، تاکہ انسان سوچنے کا موقع ہی نہ پائے۔

میڈیا کے ذریعے دین سے دوری کا ایک اور پہلو وقت کی چوری ہے۔ گھنٹے، دن اور سال ایسے مواد میں صرف ہو جاتے ہیں جو نہ علم بڑھاتا ہے، نہ کردار، نہ اللہ سے تعلق۔ انسان تھکتا نہیں، کیونکہ وہ لطف میں ہوتا ہے— مگر اندر سے خالی ہوتا جاتا ہے۔

قرآنِ مجید وقت کی اس غفلت پر قسم کھا کر متنبہ کرتا ہے:

زمانے کی قسم! کہ بے شک ہر انسان یقیناً گھاٹے میں ہے۔ (سورۃ العصر: آیات 2–1)

یہ خسارہ شور سے نہیں آتا، بلکہ مسلسل مصروفیت سے آتا ہے—ایسی مصروفیت جو مقصد سے خالی ہو۔

میڈیا کا سب سے گہرا اثر یہ ہے کہ وہ دین کو غیر دلکش بنا دیتا ہے۔ عبادت سادہ، خاموش اور صبر مانگتی ہے — جبکہ میڈیا رنگ، آواز اور فوری تسکین دیتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کا ذوق بدل جاتا ہے، اور جب ذوق بدل جائے تو دین بوجھ لگنے لگتا ہے — حق ہونے کے باوجود۔

قرآنِ مجید ہمیں یاد دلاتا ہے:

اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے راستے تک پہنچا دیتا ہے۔ (سورۃ یونس: آیت 25)

اللہ سکون کی طرف بلاتا ہے، مگر میڈیا ہیجان کی طرف — اور انسان اکثر ہیجان کو زندگی سمجھ بیٹھتا ہے۔

مرکزی نکتہ یہ ہے کہ میڈیا دین سے دوری کا سبب اس لیے نہیں بنتا کہ وہ بدی دکھاتا ہے، بلکہ اس لیے بنتا ہے کہ وہ بدی کو خوبصورت اور نیکی کو غیر متعلق بنا دیتا ہے۔ یہاں ایمان کا انکار نہیں ہوتا، بس اس کی ضرورت ختم کر دی جاتی ہے۔

انسان دین چھوڑتا نہیں، بس اسکرین میں گم ہو جاتا ہے — اور جو اسکرین میں گم ہو جائے، وہ آسمان کی طرف دیکھنا بھول جاتا ہے۔

(ڈرامہ، فلم، موسیقی اور ثقافتی مواد کے ذریعے اقدار کی تبدیلی)

انسان صرف دلیل سے نہیں بدلتا، وہ کہانی سے بدلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈرامہ، فلم اور موسیقی انسانی تاریخ میں ہمیشہ طاقتور ذرائع رہے ہیں۔ یہ عقل سے زیادہ دل کو مخاطب کرتے ہیں، اور جب دل بدل جائے تو عقل خود اس کے لیے جواز ڈھونڈ لیتی ہے۔ جدید تفریحی صنعت اسی نفسیاتی حقیقت پر کھڑی ہے — اور اسی کے ذریعے اقدار کو نئے

سانچوں میں ڈھالا جاتا ہے۔

قرآنِ مجید اس فطری کمزوری کی طرف اشارہ کرتا ہے:

اور مال کو بہت ہی عزیز رکھتے ہو۔ (سورۃ الفجر: آیت 20)

انسان جس چیز سے محبت کرنے لگتا ہے، وہی اس کی ترجیح بن جاتی ہے—اور تفریحی مواد محبت، ہیرو اور آئیڈیل متعین کرتا ہے۔

ڈرامہ اور فلم کا سب سے گہرا اثر یہ نہیں کہ وہ کیا دکھاتے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ وہ کس کردار کو قابلِ تقلید بناتے ہیں۔ اکثر کہانیوں میں وہ شخص ہیرو ہوتا ہے جو روایات توڑتا ہے، حدود سے آزاد ہوتا ہے، اور خواہش کو اخلاق پر ترجیح دیتا ہے۔

اس کے برعکس حیا، وفاداری، صبر اور اطاعت جیسے اوصاف یا تو کمزور کرداروں سے منسوب ہوتے ہیں یا مذاق کا نشانہ بنتے ہیں۔ یہی کردار نگاری آہستہ آہستہ نوجوان کے ذہن میں یہ تصور بٹھا دیتی ہے کہ دین زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں۔

قرآنِ مجید ہمیں اس الٹ پھیر سے خبردار کرتا ہے:

بھلا جس شخص کو اس کے اعمال بد آراستہ کر کے دکھائے جائیں اور وہ ان کو عمدہ سمجھنے لگے تو (کیا وہ نیکوکار آدمی جیسا ہو سکتا ہے)۔ (سورۃ فاطر: آیت 8)

جب برے عمل کو اچھا دکھایا جائے تو یہی فکری انقلاب جنم لیتا ہے۔

موسیقی کا کردار اس سے بھی زیادہ گہرا ہے، کیونکہ یہ براہِ راست جذبات سے بات کرتی ہے۔ نغمہ دل میں اترتا ہے، یادداشت کا حصہ بنتا ہے، اور انسان کے تنہائی کے لمحات میں بھی اس کے ساتھ رہتا ہے۔ جب موسیقی کا موضوع مسلسل خواہش، آزادی، رومان اور نفس کی تسکین ہو، تو دل انہی چیزوں کا عادی ہو جاتا ہے—اور اللہ کی یاد غیر

دلچسپ لگنے لگتی ہے۔

قرآنِ مجید میں ایک گہری تنبیہ آتی ہے:

اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو لغو باتوں کو مول لیتے ہیں (سورۃ لقمان: آیت 6)

مفسرین کے مطابق "لہوالحدیث" میں وہ مشغولیات شامل ہیں جو انسان کو اللہ کی یاد سے غافل کر دیں — اور جدید موسیقی اسی زمرے میں آتی ہے جب وہ مسلسل دل کو دوسری سمت موڑ دے۔

تفریحی صنعت ایک مکمل ثقافتی بیانیہ تخلیق کرتی ہے۔ یہ بیانیہ بتاتا ہے کہ خوشی کس میں ہے، کامیابی کیا ہے، اور آزادی کس کو کہتے ہیں۔

اس بیانیے میں شادی ذمہ داری کے بجائے بوجھ، حیا کمزوری، اور دینی وابستگی "پرسنل چوائس" بن جاتی ہے۔ نوجوان جب بار بار یہی بیانیہ دیکھتا ہے تو اسے دین کا بیانیہ پرانا، سخت اور غیر عملی محسوس ہونے لگتا ہے — حالانکہ مسئلہ دین میں نہیں، بیانیے کی کشش میں ہوتا ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں یاد دلاتا ہے:

اللہ تعالیٰ نے بہترین کلام نازل فرمایا ہے (سورۃ الزمر: آیت 23)

اللہ نے سب سے بہترین کلام نازل کیا — مگر جب دل غیر بہترین آوازوں کا عادی ہو جائے تو بہترین کلام بھی اثر کھو دیتا ہے۔

ڈرامہ اور فلم میں گناہ کی سب سے خطرناک پیشکش یہ ہوتی ہے کہ اس کے نتائج دکھائے ہی نہیں جاتے۔ تعلقات بنتے ٹوٹتے رہتے ہیں، مگر جذباتی، روحانی اور اخلاقی

قیمت کہیں نظر نہیں آتی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نوجوان سمجھتا ہے کہ ہر عمل بے قیمت ہے—اور یہی تصورِ آخرت کے انکار کی سب سے نرم شکل ہے۔

قرآنِ مجید اس مغالطے کو رد کرتا ہے:

تو کیا تم نے گمان کر لیا کہ ہم نے تمھیں بے مقصد ہی پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے؟ (سورۃ المؤمنون: آیت 115)

کچھ بھی عبث نہیں— مگر تفریحی دنیا سب کچھ بے مقصد دکھاتی ہے۔

ثقافتی مواد کا ایک اور خطرناک اثر یہ ہے کہ وہ گناہ کو رومانوی بنا دیتا ہے۔ حرام تعلق، بغاوت، اور خواہش پرستی کو قربانی، سچائی اور بہادری کے نام دیے جاتے ہیں۔ اس رومانویت میں دین محض رکاوٹ نظر آتا ہے— رہنمائی نہیں۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''جنت ناپسندیدہ اور تکلیف دہ چیزوں سے گھری ہوئی ہے اور جہنم شہوتوں سے گھری ہوئی ہے'' (سنن ترمذی حدیث: 2559)

جنت مشکل راستوں سے گھری ہے— مگر تفریحی صنعت آسان راستوں کو ہی کامیابی بنا کر پیش کرتی ہے۔

مرکزی نکتہ یہ ہے کہ تفریحی مواد انسان سے دین چھینتا نہیں، بلکہ اس کے ذوق بدل دیتا ہے۔ اور جب ذوق بدل جائے تو انسان خود دین سے فاصلہ اختیار کر لیتا ہے— بغیر کسی زبردستی کے۔ دین کو رد نہیں کیا جاتا، بس اس کی کہانی کمزور کر دی جاتی ہے— اور طاقتور کہانی ہمیشہ کمزور سچ پر غالب آ جاتی ہے۔

(خبری میڈیا، بیانیہ سازی، اور دین کی منفی یا ثانوی تصویر)

اگر تفریحی میڈیا دل کو بدلتا ہے تو خبری میڈیا ذہن کو سمت دیتا ہے۔ انسان دنیا کو جیسا سمجھتا ہے، وہ زیادہ تر خبروں کے ذریعے ہی سمجھتا ہے۔ کیا اہم ہے؟ کیا خطرہ ہے؟ کیا قابلِ تعریف ہے؟ اور کیا قابلِ مذمت؟ — یہ سب سوالات خبروں کے انتخاب اور پیشکش سے طے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خبروں کا اصل اثر اطلاع دینا نہیں بلکہ بیانیہ تشکیل دینا ہوتا ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں خبر کے بارے میں نہایت بنیادی اصول دیتا ہے:

مومنو! اگر کوئی بدکردار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کرلیا کرو (سورۃ الحجرات: آیت 6)

یہ آیت صرف جھوٹی خبر سے نہیں، بلکہ غلط تناظر سے بھی خبردار کرتی ہے — مگر جدید میڈیا میں تناظر ہی سب سے زیادہ مسخ کیا جاتا ہے۔

خبروں میں دین عموماً تین صورتوں میں دکھائی دیتا ہے:

یا تو بطور مسئلہ،

یا بطور تنازع،

یا بطور رکاوٹ۔

امن، اخلاق، خدمتِ خلق، اور روحانی استحکام — یہ سب دینی پہلو شاذ ہی سرخی بنتے ہیں۔ اس کے برعکس، کسی فرد یا گروہ کی غلطی کو پورے دین سے جوڑ کر پیش کیا جاتا ہے، جس سے ناظر کے ذہن میں یہ تصور مضبوط ہوتا ہے کہ دین خود مسئلے کی جڑ ہے۔

قرآنِ مجید اس طرزِ فکر کو یوں بیان کرتا ہے:

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ ڈالو تو کہتے ہیں، ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ (سورۃ البقرہ: آیت 11)

یعنی فساد کو اصلاح کے نام پر بیچا جاتا ہے—اور یہی کام بیانیہ سازی میں ہوتا ہے۔

خبروں کا انتخاب خود ایک خاموش فیصلہ ہوتا ہے۔ کون سی خبر پہلے چلے گی؟ کس لفظ کے ساتھ؟ کس تصویر کے ساتھ؟ اور کس تبصرے کے ساتھ؟ یہ سب سوالات مل کر ناظر کے ذہن میں ایک خاص رخ بنا دیتے ہیں۔ جب دین سے جڑی خبریں مسلسل خوف، تشدد یا پسماندگی کے ساتھ جوڑی جائیں، تو لاشعوری طور پر دین ایک منفی شے بن جاتا ہے—چاہے خبر سچ ہی کیوں نہ ہو۔

قرآنِ مجید کہتا ہے:

اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔ (سورۃ المائدہ: آیت 8)

یعنی کسی سے دشمنی بھی تمہیں انصاف سے نہ ہٹائے— مگر میڈیا میں انصاف نہیں، اثر دیکھا جاتا ہے۔

ایک اور خطرناک پہلو یہ ہے کہ خبروں میں دین کو غیر ضروری بنا کر دکھایا جاتا ہے۔ سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل پر گھنٹوں گفتگو ہوتی ہے، مگر اخلاقی اور روحانی پہلو یا تو نظر انداز ہوتے ہیں یا مذاق بن جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ناظر کے ذہن میں دین ایک ذاتی شے بن جاتا ہے—اجتماعی زندگی سے غیر متعلق۔

قرآنِ مجید اس تقسیم کو رد کرتا ہے:

ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ (سورۃ البقرہ: آیت 208)

مگر میڈیا دین کو کمرے تک محدود کرنا چاہتا ہے، نظام تک نہیں۔

تجزیاتی پروگراموں میں اکثر ایسے ماہرین بلائے جاتے ہیں جو دین کو یا تو سطحی جانتے ہیں یا پہلے ہی اس سے بدظن ہوتے ہیں۔ ان کی گفتگو سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ دین جدید دنیا کے مسائل کا حل نہیں، بلکہ خود ایک پیچیدگی ہے۔ اس مسلسل تاثر کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نوجوان دین کو غیر سائنسی، غیر عملی یا غیر ضروری سمجھنے لگتا ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں خبردار کرتا ہے:

ان لوگوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں یہ اللہ کے پاس سے ہے، تاکہ اس کے ساتھ تھوڑی قیمت حاصل کریں، پس ان کے لیے بڑی ہلاکت اس کی وجہ سے ہے جو ان کے ہاتھوں نے لکھا اور ان کے لیے بڑی ہلاکت اس کی وجہ سے ہے جو وہ کماتے ہیں۔ (سورۃ البقرہ: آیت 79)

یعنی حق کو اپنے مفاد کے مطابق ڈھالنا — یہ تحریف صرف متن کی نہیں، معنی کی بھی ہوتی ہے، اور آج یہ کام بیانیہ سازی کے ذریعے ہو رہا ہے۔

خبروں کی رفتار بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ ہر لمحہ نئی خبر، نیا بحران، نیا خوف — اس مسلسل شور میں انسان کو سوچنے، پرکھنے اور دعا کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ دین سکون، توقف اور غور کا تقاضا کرتا ہے، مگر میڈیا کی دنیا مسلسل بے چینی پیدا کرتی ہے۔

قرآنِ مجید سکون کو ایمان کی علامت قرار دیتا ہے:

وہی ہے جس نے مسلمانوں کے دلوں میں سکون (اور اطمینان) ڈال دیا
(سورۃ الفتح: آیت 4)

مگر سکینت شور میں نہیں اترتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ خبری میڈیا دین پر براہِ راست حملہ کم، مگر اسے پس منظر میں دھکیلنے کا کام زیادہ کرتا ہے۔ جب دین کو مسئلہ، خوف یا ذاتی معاملہ بنا دیا جائے تو نئی نسل خود ہی اسے زندگی کے مرکز سے ہٹا دیتی ہے — بغیر کسی بغاوت کے۔

دین کو جھٹلایا نہیں جاتا، بس اس کی آواز کم کر دی جاتی ہے — اور شور میں دبنے والی آواز آخر کار خاموش ہو جاتی ہے۔

(سوشل میڈیا، الگورتھمز، اور دین سے دوری کا نیا ڈیجیٹل انداز)

اگر روایتی میڈیا انسان کو ایک سمت میں دھکیلتا تھا، تو سوشل میڈیا انسان کو اس کی اپنی خواہش کے پیچھے لگا دیتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں بیرونی دباؤ کی جگہ اندرونی رغبت لے لیتی ہے، اور یہی دین سے دوری کی سب سے خطرناک شکل ہے۔ یہاں کوئی زبردستی نہیں، کوئی حکم نہیں — بس وہی دکھایا جاتا ہے جو انسان دیکھنا چاہتا ہے، اور آہستہ آہستہ وہی انسان کی دنیا بن جاتا ہے۔

قرآنِ مجید نے انسانی نفس کی اس کمزوری کو صدیوں پہلے بیان کر دیا تھا:

کیا آپ نے اسے بھی دیکھا؟ جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے
(سورۃ الجاثیہ: آیت 23)

جب خواہش ہی معبود بن جائے تو رہنمائی الگورتھم کے ہاتھ آ جاتی ہے، اور انسان خود کو آزاد سمجھتے ہوئے دراصل قید ہو جاتا ہے۔

سوشل میڈیا کا سب سے طاقتور پہلو الگورتھم ہے—ایک ایسا نظام جو یہ طے کرتا ہے کہ آپ کیا دیکھیں گے، کس ترتیب سے دیکھیں گے، اور کتنی دیر دیکھیں گے۔ یہ نظام سچ، خیر یا ہدایت کی بنیاد پر نہیں چلتا، بلکہ توجہ (Attention) کی بنیاد پر چلتا ہے۔ جو چیز جتنی زیادہ توجہ کھینچتی ہے، وہ اتنی ہی زیادہ دکھائی جاتی ہے—چاہے وہ فحاشی ہو، اشتعال ہو، یا فکری سطحیت۔

قرآنِ مجید اس روش کو یوں بے نقاب کرتا ہے:

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں کے ساتھ بجھا دیں (سورۃ الصّف: آیت 8)

اللہ کے نور کو ایک دم سے نہیں بجھایا جاتا، بلکہ اس کے مقابل شور، رنگ اور ہجوم کھڑا کر دیا جاتا ہے۔

سوشل میڈیا پر دین کی موجودگی بھی اکثر مسخ شدہ شکل میں ہوتی ہے۔ مختصر کلپس، ادھوری آیات، سیاق و سباق سے کٹی ہوئی احادیث—یہ سب دین کو گہرائی کے بجائے سطحیت میں بدل دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دین ایک سنجیدہ فکری نظام کے بجائے جذباتی یا متنازع مواد بن جاتا ہے، جس پر لائک، شیئر اور کمنٹ تو ہوتے ہیں، مگر عمل نہیں۔

قرآنِ مجید میں آیا ہے:

اللہ کے نزدیک ناراض ہونے کے اعتبار سے بڑی بات ہے کہ تم وہ کہو جو تم نہیں کرتے۔ (سورۃ الصّف: آیت 3)

یعنی قول اور عمل کا فرق—اور سوشل میڈیا اس فرق کو معمول بنا دیتا ہے۔

سوشل میڈیا کی دنیا میں نمائش (Show) اصل قدر بن چکی ہے۔ عبادت ہو یا

خیرات، علم ہو یا رائے — سب کچھ پیش کرنے کے لیے ہے، بدلنے کے لیے نہیں۔ اس نمائش میں اخلاص سب سے پہلے متاثر ہوتا ہے، اور جب اخلاص کمزور ہو جائے تو دین کا اثر بھی کم ہو جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''تمام اعمال کا دارومدار نیت پر ہے'' (صحیح بخاری حدیث: 1)

مگر سوشل میڈیا نیت کو نظر انداز کر کے صرف عمل کی تصویر دکھاتا ہے۔

ایک اور نہایت گہرا مسئلہ موازنہ (Comparison) ہے۔ سوشل میڈیا پر انسان خود کو مسلسل دوسروں سے تولتا ہے:

کون زیادہ خوش ہے؟

کون زیادہ کامیاب ہے؟

کون زیادہ آزاد ہے؟

یہ موازنہ حسد، احساسِ کمتری اور بے چینی پیدا کرتا ہے — اور یہی وہ کیفیت ہے جس میں انسان شکر، قناعت اور توکل جیسے دینی اوصاف سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ نوجوان کے ذہن میں خوشی اور سکون کو ایک ہی کیفیت کے طور پر متعارف کروایا گیا ہے، جبکہ خوشی اور سکون ایک دوسرے سے بالکل مختلف جذبات ہیں۔ خوشی کسی چیز سے بھی حاصل ہو سکتی ہے، جیسے انسان کسی دوسرے انسان کو شکست دے کر بھی خوش ہوتا ہے۔ لیکن سکون ایک بالکل الگ کیفیت ہے جو کہ صرف کسی نیکی کے کام کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر آپ کو خطرہ ہو کہ ہارنے کے بعد آپ کے مخالف کو تکلیف ہو سکتی ہے اور آپ جان بوجھ کر اس سے ہار جاتے ہیں تو اس ہار میں جو سکون ہے وہ اصل جیت ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں خبردار کرتا ہے:

اور اپنی آنکھیں ان چیزوں کی طرف ہرگز نہ اٹھا جو ہم نے ان کے مختلف قسم کے لوگوں کو دنیا کی زندگی کی زینت کے طور پر برتنے کے لیے دی ہیں (سورۃ طٰہٰ: آیت 131)

دوسروں کی چمک دمک کو گھورنا دل کو کھوکھلا کر دیتا ہے—اور سوشل میڈیا اسی گھورنے کا مستقل انتظام ہے۔

سوشل میڈیا پر وقت کا زیاں محض مصروفیت نہیں، بلکہ زندگی کی ٹوٹ پھوٹ ہے۔ دن چھوٹے ہو جاتے ہیں، توجہ بکھر جاتی ہے، اور انسان گہرے غور، عبادت اور مطالعے سے محروم ہو جاتا ہے۔ دین گہرائی مانگتا ہے، اور سوشل میڈیا سطح پر رکھتا ہے—یہی اصل تصادم ہے۔

قرآنِ مجید وقت کی قسم کھا کر کہتا ہے:

زمانے کی قسم! کہ بے شک ہر انسان یقیناً گھاٹے میں ہے۔ (سورۃ العصر: آیات 1-2)

یہ خسارہ آج اسکرول میں چھپا ہوا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سوشل میڈیا دین سے دوری اس لیے پیدا نہیں کرتا کہ وہاں دین موجود نہیں، بلکہ اس لیے کہ وہاں دین ٹھہر نہیں پاتا۔ الگورتھم، رفتار، نمائش اور خواہش—یہ سب مل کر ایمان کو ایک گزرتا ہوا مواد بنا دیتے ہیں، مستقل حقیقت نہیں۔

انسان دین کو چھوڑتا نہیں، بس اسکرول کرتا رہتا ہے—اور جو مسلسل اسکرول کرے، وہ ٹھہر کر سجدہ کرنا بھول جاتا ہے۔

(میڈیا کے مقابلے میں دینی حکمتِ عملی، شعور کی بازیافت، اور عملی حل)

یہ ایک نا قابلِ تردید حقیقت ہے کہ میڈیا کو ختم نہیں کیا جا سکتا——اور اسلام کبھی حقیقت سے فرار کی تعلیم نہیں دیتا۔ مسئلہ میڈیا کا وجود نہیں، بلکہ اس کے سامنے بے شعوری سے ہتھیار ڈال دینا ہے۔ اسلام نے ہر دور میں طاقتور ذرائع کا سامنا حکمت، بصیرت اور توازن کے ساتھ کیا ہے، نہ کہ انکار یا جذباتی ردِعمل کے ساتھ۔ یہی اصول آج کے میڈیا کے لیے بھی ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں اعتدال کی بنیاد سکھاتا ہے:

اور اسی طرح ہم نے تمھیں سب سے بہتر امت بنایا (سورۃ البقرہ: آیت 143)

امتِ وسط——نہ اندھی تقلید، نہ اندھا انکار۔ یہی میڈیا کے مقابلے میں پہلا اصول ہے۔

شعور کی بازیافت کا آغاز یہ مان لینے سے ہوتا ہے کہ میڈیا ہمیں بدل رہا ہے۔ جب تک انسان یہ سمجھے کہ وہ محض دیکھ رہا ہے اور متاثر نہیں ہو رہا، وہ سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ ایمان کا پہلا درجہ یہی ہے کہ انسان اپنے نفس کی کمزوری کو پہچانے۔

قرآنِ مجید میں دعا ہے:

اے ہمارے رب! ہمیں ہدایت دینے کے بعد ہمارے دل ٹیڑھے نہ کر دے (سورۃ آلِ عمران: آیت 8)

ہدایت کے بعد دل کا ٹیڑھا ہونا——یہ خطرہ ہمیشہ رہتا ہے، خاص طور پر اس دور میں۔

عملی حکمتِ عملی کا پہلا قدم انتخاب (Choice) ہے۔ ہر وہ چیز جو دکھائی جا رہی ہے، دیکھنے کے لائق نہیں۔ دین ہم سے آنکھ، کان اور دل — تینوں کے بارے میں سوال کرے گا:

اور اس چیز کا پیچھا نہ کر جس کا تجھے کوئی علم نہیں۔ (سورۃ الإسراء: آیت 36)

یہ آیت میڈیا کے دور میں غیر معمولی معنویت رکھتی ہے۔

دوسری حکمتِ عملی حد بندی (Limits) ہے۔ اسلام ہر مباح چیز کو بھی حد میں رکھتا ہے۔ سوشل میڈیا، خبریں یا تفریح — اگر یہ عبادت، مطالعہ اور خاندان سے وقت چھین لیں تو یہ نعمت نہیں رہتیں۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "کسی شخص کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی اور فضول باتوں کو چھوڑ دے"۔ (سنن ترمذی حدیث: 2317)

جو چیز فائدہ نہ دے، اسے چھوڑ دینا بھی ایمان کی علامت ہے۔

تیسری حکمتِ عملی متبادل کی تخلیق ہے۔ اگر حلال اور با مقصد مواد دستیاب نہ ہو تو نوجوان خود بخود غیر معیاری مواد کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے جب بھی علم، ادب اور ثقافت میں اپنا بیانیہ پیش کیا، اس نے دنیا کو متاثر کیا۔ مسئلہ صلاحیت کا نہیں، نیت اور ترجیح کا ہے۔

قرآنِ مجید میں آیا ہے:

کہہ دیجئے کہ تم عمل کیے جاؤ تمہارے عمل اللہ خود دیکھ لے گا (سورۃ التوبہ: آیت 105)

یہ آیت دینی میڈیا، علمی مواد اور مثبت تخلیق — سب پر صادق آتی ہے۔

انفرادی سطح پر سب سے مؤثر حل دل کا اللہ سے جڑنا ہے۔ جب دل میں ذکر، دعا اور قرآن کی جگہ مضبوط ہو، تو اسکرین کی کشش خود بخود کم ہو جاتی ہے۔ دین کو میڈیا سے بچانے کا سب سے مضبوط طریقہ میڈیا سے لڑنا نہیں، بلکہ دل کو مضبوط بنانا ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں یقین دلاتا ہے:

جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار خدا ہے پھر وہ (اس پر) قائم رہے ان پر فرشتے اُتریں گے (اور کہیں گے) کہ نہ خوف کرو اور نہ غمناک ہو اور بہشت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا خوشی مناؤ۔ (سورۃ فصلت: آیت 30)

استقامت — یہی اصل قوت ہے۔

والدین، اساتذہ اور علما کے لیے بھی یہاں ایک واضح پیغام ہے:

اگر ہم نئی نسل کو صرف **"کیا نہ دیکھو"** سکھائیں گے اور **"کیوں نہ دیکھو"** نہیں سکھائیں گے، تو ہم ہار جائیں گے۔ اگر ہم دین کو صرف وعظ بنائیں گے، زندگی نہیں، تو اسکرین زندگی بن جائے گی۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "آگاہ ہو جاؤ تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔" (صحیح البخاری حدیث: 7138)

یہ ذمہ داری آج سب سے زیادہ ذہنی و فکری تربیت کی صورت اختیار کر چکی ہے۔

مجموعی خلاصہ یہ ہے کہ میڈیا دین سے دوری کا سبب اس لیے نہیں بنتا کہ وہ طاقتور ہے، بلکہ اس لیے بنتا ہے کہ ہم کمزور اور غیر منظّم ہیں۔ اگر شعور بیدار ہو، نیت درست ہو، اور حکمت عملی واضح ہو — تو یہی میڈیا دین کے پیغام کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔

میڈیا مسئلہ نہیں،

بے خبری مسئلہ ہے۔

اسکرین دشمن نہیں،

بے سمت دل دشمن ہے۔

اور قرآنِ مجید ہمیں ہمیشہ امید دلاتا ہے:

اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (سورۃ یوسف: آیت 21)

اللہ غالب ہے— ہر دور میں، ہر فتنہ میں۔

باب 17

خاندانی نظام کی کمزوری اور نسل در نسل دینی زوال

(خاندان بطور دینی تربیت کا پہلا ادارہ، اور اس کے کمزور ہونے کے نتائج)

اسلام میں خاندان محض افراد کا مجموعہ نہیں، بلکہ ہدایت کی پہلی درسگاہ ہے۔ انسان سب سے پہلے جو زبان سیکھتا ہے، جو رویہ اپناتا ہے، اور جس تصورِ زندگی کو سانسوں میں جذب کرتا ہے—وہ سب خاندان ہی میں تشکیل پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب خاندان مضبوط ہو تو معاشرہ خود بخود سنبھل جاتا ہے، اور جب خاندان کمزور ہو جائے تو بہترین تعلیمی نظام اور مضبوط قوانین بھی دینی زوال کو نہیں روک پاتے۔

قرآنِ مجید نے دین کی حفاظت کا آغاز ریاست یا مسجد سے نہیں، بلکہ گھر سے کیا:

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں، اس پر سخت دل، بہت مضبوط فرشتے مقرر ہیں، جو اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے جو وہ انھیں حکم دے اور وہ کرتے ہیں جو حکم دیے جاتے ہیں۔ (سورۃ التحریم: آیت 6)

یعنی پہلے خود کو، پھر اپنے اہل و عیال کو بچاؤ—یہ ترتیب بتاتی ہے کہ دینی تربیت کی اصل ذمہ داری کہاں سے شروع ہوتی ہے۔

آج مسلمانوں میں دین سے دوری کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ خاندان کا کردار فعال سے علامتی ہو گیا ہے۔ والدین اولاد کو پال تو رہے ہیں، مگر تربیت نہیں دے رہے۔ کھانا، لباس، تعلیم اور سہولت—سب فراہم ہو رہی ہیں، مگر دین، اخلاق اور مقصدِ حیات پر گفتگو یا تو نہ ہونے کے برابر ہے یا محض رسمی نصیحت تک محدود ہے۔

قرآنِ مجید اس خلا کو یوں بیان کرتا ہے:

پھر ان کے بعد ایسے نالائق جانشین ان کی جگہ آئے جنھوں نے نماز کو ضائع کر دیا (سورۃ مریم: آیت 59)

یہ آیت صرف نماز چھوڑنے کی نہیں، بلکہ نسلی غفلت کی تصویر ہے — جہاں اگلی نسل وہ نہیں سیکھ پاتی جو پچھلی نسل نے سکھانا چھوڑ دیا۔

خاندانی کمزوری کا سب سے پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ دین زندگی کا نظام نہیں رہتا، بلکہ ایک ذاتی عادت بن جاتا ہے۔ بچہ دیکھتا ہے کہ والدین نماز پڑھتے تو ہیں، مگر فیصلے دین کی بنیاد پر نہیں کرتے؛ قرآن موجود تو ہے، مگر رہنمائی کے لیے نہیں کھولا جاتا؛ حلال و حرام کا ذکر تو ہے، مگر ترجیح نہیں۔ یہی تضاد بچے کے ذہن میں دین کو غیر مرکزی بنا دیتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کوئی ولادت پانے والا نہیں مگر وہ فطرت ہی پر پیدا ہوا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی اور مشرک بنا دیتے ہیں۔'' (صحیح مسلم حدیث: 6758)

فطرت پاک ہوتی ہے، مگر اس کی سمت والدین طے کرتے ہیں — اور جب سمت واضح نہ ہو تو فطرت الجھ جاتی ہے۔

جدید دور میں خاندانی نظام کی کمزوری صرف مغربی اثرات کا نتیجہ نہیں، بلکہ ہماری اپنی ترجیحات کی تبدیلی کا بھی نتیجہ ہے۔ وقت کی کمی، معاشی دباؤ، اسکرین کی مصروفیت، اور جذباتی تھکن — یہ سب عوامل مل کر خاندان کے اندر گفتگو کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ جب بات چیت ختم ہو جائے تو تربیت بھی ختم ہو جاتی ہے، اور اس خلا کو میڈیا، دوست اور سوشل پلیٹ فارمز پُر کر دیتے ہیں۔

قرآنِ مجید میں اہلِ ایمان کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے:

اور وہ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہمیں ہماری بیویوں اور اولادوں سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا۔ (سورۃ الفرقان: آیت 74)

آنکھوں کی ٹھنڈک — یہ صرف کامیابی یا فرمانبرداری سے نہیں، بلکہ ہدایت پر چلنے سے حاصل ہوتی ہے۔

ایک اور نہایت اہم مسئلہ یہ ہے کہ آج والدین خود دینی اعتبار سے غیر مطمئن اور غیر واضح ہیں۔ وہ دین کو مانتے تو ہیں، مگر اس پر اعتماد کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ وہ اولاد کو یہ پیغام دیتے ہیں:

"بس اچھے انسان بنو"

مگر یہ نہیں بتاتے کہ اچھا انسان کس معیار سے بنتا ہے۔

دین یہاں ایک اضافی خوبی بن جاتا ہے، لازمی بنیاد نہیں۔

قرآنِ مجید نے اس ابہام کو رد کرتے ہوئے فرمایا:

یہ قرآن وہ رستہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھا ہے اور مومنوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں بشارت دیتا ہے کہ اُن کے لئے اجرِ عظیم ہے۔ (سورۃ الإسراء: آیت 9)

یعنی سیدھا راستہ موجود ہے — مگر جب اسے گھروں میں مرکزی حیثیت نہ دی جائے تو اگلی نسل سیدھا چلنا سیکھ ہی نہیں پاتی۔

خاندانی نظام کی کمزوری کا سب سے خطرناک نتیجہ نسل در نسل دینی زوال ہے۔ ایک نسل تھوڑا کمزور ہوتی ہے، اگلی اس سے بھی کم، اور تیسری نسل کے لیے دین ایک ثقافتی

شناخت تو رہ جاتا ہے، مگر عملی حقیقت نہیں۔ یہ زوال اچانک نہیں آتا، بلکہ خاموشی سے، محبت کے بغیر، اور منصوبہ بندی کے بغیر آتا ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے ذریعے ایک نمونہ دیتا ہے:

اور مجھے اور میرے بیٹوں کو بچا کہ ہم بتوں کی عبادت کریں۔ (سورۃ ابراہیم: آیت 35)

یہ دعا اس بات کا اعلان ہے کہ انبیاء بھی نسلوں کے بارے میں فکرمند تھے—اور ہم بے فکر ہو گئے ہیں۔

بنیادی پیغام یہ ہے کہ دین سے دوری کا سفر اکثر گھر کی دہلیز سے شروع ہوتا ہے۔ اگر گھر میں دین باتوں میں ہو مگر فیصلوں میں نہ ہو، اگر عبادت ہو مگر اخلاق نہ ہو، اگر تعلیم ہو مگر مقصد نہ ہو—تو اگلی نسل دین کو بوجھ یا رسم سمجھنے لگتی ہے۔

دین کہیں باہر نہیں جاتا، وہ گھر کے اندر ہی کمزور ہوتا ہے—اور جب بنیاد کمزور ہو جائے، تو عمارت خود گر جاتی ہے۔

(والدین کی ترجیحات، طرزِ زندگی، اور بچوں کی دینی شناخت پر اثرات)

بچے وہ نہیں بنتے جو والدین انہیں کہتے ہیں، بلکہ وہ وہی بنتے ہیں جو وہ اپنے والدین کو بنتے دیکھتے ہیں۔ گھر کا ماحول، والدین کی ترجیحات، گفتگو کا انداز، خوشی اور غصے کے مواقع—یہ سب بچے کے ذہن میں دین کی ایک عملی تصویر بناتے ہیں۔ یہی تصویر بعد میں اس کی دینی شناخت کی بنیاد بنتی ہے، خواہ وہ تصویر واضح ہو یا مبہم، مضبوط ہو یا کمزور۔

قرآنِ مجید نے والدین کی اس ذمہ داری کو نہایت واضح انداز میں بیان کیا ہے:

اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کرو اور اس پر قائم رہو۔ (سورۃ طٰہٰ: آیت 132)

یہ حکم صرف نماز پڑھانے کا نہیں، بلکہ ثابت قدمی کے ساتھ دینی ماحول قائم رکھنے کا ہے— کیونکہ دین مستقل مزاجی سے منتقل ہوتا ہے، وقتی نصیحت سے نہیں۔

آج بہت سے والدین کی ترجیح یہ بن چکی ہے کہ ان کے بچے **''کامیاب''** ہوں— مگر کامیابی کی تعریف دین سے الگ کر دی گئی ہے۔ اچھے نمبر، اچھی یونیورسٹی، اچھی نوکری— یہ سب اہداف تو واضح ہیں، مگر اچھا مسلمان بننا ایک ضمنی خواہش بن کر رہ گیا ہے۔ بچہ یہ پیغام بہت جلد سمجھ لیتا ہے کہ

دین اہم ہے، مگر سب سے اہم نہیں۔

قرآنِ مجید ہمیں خبردار کرتا ہے:

بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ حالانکہ آخرت کہیں بہتر اور زیادہ باقی رہنے والی ہے۔ (سورۃ الأعلیٰ: آیات 16–17)

جب دنیا کو ترجیح دی جائے تو آخرت نظریاتی سچ تو رہتی ہے، عملی مقصد نہیں۔

والدین کا طرزِ زندگی بچوں کے لیے سب سے مضبوط نصاب ہوتا ہے۔ اگر والدین زبان سے دین کی بات کریں مگر فیصلوں میں دین نظر نہ آئے، اگر وہ حلال وحرام کی بات کریں مگر سہولت کی خاطر سمجھوتے کریں، اگر وہ نماز کی تلقین کریں مگر خود وقت پر نماز کو ترجیح نہ دیں— تو بچے کے ذہن میں دین دوہرا معیار بن جاتا ہے۔

ایک اور نہایت اہم مسئلہ والدین کی مصروفیت ہے۔ معاشی دباؤ، سماجی دوڑ، اور اسکرین کی لت— ان سب نے والدین کو بچوں کے لیے وقت دینے سے محروم کر دیا ہے۔ جب والدین موجود نہ ہوں تو بچے رہنمائی کے لیے دوستوں، سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کی طرف رجوع کرتے ہیں— اور وہاں دین ترجیح نہیں ہوتا۔

والدین کا دین کے بارے میں غیر یقینی رویہ بھی بچوں کی دینی شناخت کو شدید متاثر کرتا ہے۔ جب والدین خود یہ واضح نہ کر پائیں کہ دین زندگی میں کہاں فِٹ ہوتا ہے، تو بچہ بھی دین کو یا تو رسم سمجھتا ہے یا ذاتی پسند۔ دین یہاں رہنمائی نہیں، بلکہ آپشن بن جاتا ہے—اور آپشن ہمیشہ دباؤ میں سب سے پہلے چھوڑا جاتا ہے۔

بچوں کی دینی شناخت پر والدین کے جذباتی رویے بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر دین صرف ڈانٹ، پابندی اور خوف کے ساتھ جڑا ہو، اور محبت، حکمت اور مکالمے کے ساتھ نہ ہو، تو بچہ دین سے نہیں بلکہ دین کے نام پر ہونے والے رویوں سے دور ہو جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کے بارے میں قرآن گواہی دیتا ہے:

اللہ تعالیٰ کی رحمت کے باعث آپ ان پر نرم دل ہیں (سورۃ آل عمران: آیت 159)

نرمی—یہی دین کی روح ہے، اور یہی تربیت کی بنیاد۔

والدین اکثر یہ سمجھتے ہیں کہ بچے بڑے ہو کر خود دین سمجھ لیں گے، مگر حقیقت یہ ہے کہ دین سکھایا جاتا ہے، خود بخود منتقل نہیں ہوتا۔ اگر بچپن میں دین جذبات، عقل اور عمل کے ساتھ نہ جڑے تو جوانی میں وہ نظری بحث تو بن سکتا ہے، زندگی کا محور نہیں۔

قرآنِ مجید میں حضرت لقمانؑ کی نصیحت اس کی بہترین مثال ہے:

اے میرے چھوٹے بیٹے! نماز قائم کر اور نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کر اور اس (مصیبت) پر صبر کر جو تجھے پہنچے، یقیناً یہ ہمت کے کاموں سے ہے۔ (سورۃ لقمان: آیت 17)

یہ نصیحت صرف حکم نہیں، مکالمہ ہے— باپ اور بیٹے کے درمیان دل سے دل کی بات۔

خلاصہ یہ ہے کہ دینی زوال کی منتقلی سب سے پہلے ترجیحات کی منتقلی سے ہوتی ہے۔ جب والدین دین کو ثانوی رکھیں گے، تو بچے اسے غیر ضروری سمجھیں گے۔ جب والدین دین کو زندگی کا مرکز بنائیں گے، تو بچے بھی اسے فخر سمجھیں گے— زبردستی نہیں، محبت سے۔

دین نصاب سے پہلےنیت میں آتا ہے، کتاب سے پہلےکردار میں آتا ہے، اور مسجد سے پہلےگھر میں آتا ہے۔

(گھر میں دینی مکالمے کی کمی، نسلوں کے درمیان فکری فاصلہ، اور اس کے نتائج)

دین صرف احکام کا نام نہیں، بلکہ فہم، گفتگو اور تعلق کا نام ہے۔ جب دین گھروں میں صرف ہدایات اور پابندیوں کی صورت میں موجود رہے، مگر سوال، مکالمہ اور وضاحت کی صورت میں موجود نہ ہو، تو نئی نسل کے دل میں دین کے لیے احترام تو رہتا ہے، مگر قربت پیدا نہیں ہوتی۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں دینی زوال خاموشی سے جنم لیتا ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں مکالمے کی اہمیت سکھاتا ہے، حتیٰ کہ انبیاء کے اسلوب میں بھی:

اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلا اور ان سے اس طریقے کے ساتھ بحث کر جو سب سے اچھا ہے۔ (سورۃ النحل: آیت 125)

یہ آیت بتاتی ہے کہ بات منوانا نہیں، سمجھانا اصل ہدف ہے— اور یہی اصول گھر کے اندر بھی لاگو ہوتا ہے۔

آج کے بہت سے گھروں میں دین پر بات چیت یا تو بالکل نہیں ہوتی، یا صرف

اس وقت ہوتی ہے جب کوئی غلطی ہو جائے۔ نماز یاد دلائی جاتی ہے، مگر نماز کیوں اہم ہے—اس پر گفتگو نہیں ہوتی۔ حلال و حرام کا حکم دیا جاتا ہے، مگر اس کی حکمت بیان نہیں کی جاتی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بچے کے ذہن میں دین جواب دینے والا نظام نہیں بنتا، بلکہ سوال روکنے والا نظام بن جاتا ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں سوال سے روکنے کے بجائے صحیح سوال سکھاتا ہے:

پس اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے دریافت کرلو۔ (سورۃ النحل: آیت 43)

یہ آیت اس بات کا اعلان ہے کہ سوال کمزوری نہیں، بلکہ سیکھنے کا دروازہ ہے۔

نسلوں کے درمیان فکری فاصلے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ والدین اور بچے ایک ہی زبان میں بات نہیں کرتے۔ والدین کی زبان نصیحت اور تجربے کی ہوتی ہے، جبکہ بچوں کی زبان سوال، منطق اور مثال کی۔ جب والدین بچوں کے سوالات کو بدتمیزی، بغاوت یا بے ادبی سمجھ کر رد کر دیتے ہیں، تو بچے سوال پوچھنا بند کر دیتے ہیں—اور جواب کہیں اور سے تلاش کرنے لگتے ہیں۔

ایک اور سنگین مسئلہ یہ ہے کہ بعض گھروں میں دین پر سوال کرنا ممنوع موضوع بن چکا ہے۔ عقیدہ، شریعت، جدید مسائل—ان سب پر گفتگو کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ نتیجتاً بچہ دین کو جامد، خوفناک یا غیر لچکدار سمجھنے لگتا ہے، حالانکہ اسلام خود عقل کو مخاطب کرتا ہے اور فکر کو دعوت دیتا ہے۔

قرآنِ مجید بار بار سوال اٹھاتا ہے:

﴿أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾، ﴿أَفَلَا يَتَفَكَّرُونَ﴾

یہ سوالات اس بات کا اعلان ہیں کہ ایمان سوچ کے ساتھ پروان چڑھتا ہے،

خاموشی کے ساتھ نہیں۔

دینی مکالمے کی کمی کا ایک اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دین روزمرہ زندگی سے کٹ جاتا ہے۔ بچے یہ نہیں سیکھ پاتے کہ دین دوستوں، انٹرنیٹ، تعلیم، جذبات اور فیصلوں میں کیسے رہنمائی دیتا ہے۔ جب دین زندگی کے حقیقی سوالات کا جواب نہ دے، تو وہ عبادت گاہ تک محدود ہو جاتا ہے—اور باقی زندگی کسی اور بیانیے کے حوالے ہو جاتی ہے۔

جب گھر میں مکالمہ ختم ہو جائے تو فکری خلا پیدا ہوتا ہے، اور یہ خلا کبھی خالی نہیں رہتا۔ اسے یا تو سوشل میڈیا پُر کرتا ہے، یا دوستوں کی رائے، یا ایسے بیانیے جو دین کو غیر متعلق یا مسئلہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس مرحلے پر والدین حیران ہوتے ہیں کہ **"ہم نے تو اسے سب کچھ سکھایا تھا"**— مگر درحقیقت انہوں نے سننا نہیں سکھایا تھا۔

نبی کریم ﷺ کا اسلوب ہمیں رہنمائی دیتا ہے:

آپ ﷺ سوال سننے سے نہیں گھبراتے تھے، بلکہ سوال کو تربیت کا ذریعہ بناتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ کا ایمان دلیل اور محبت—دونوں پر قائم تھا۔

مرکزی خلاصہ یہ ہے کہ دینی زوال کا ایک خاموش مگر گہرا سبب گھروں میں مکالمے کا خاتمہ ہے۔ جب دین بولتا نہیں، سنتا نہیں، اور سوالوں کا سامنا نہیں کرتا— تو اگلی نسل اسے زندگی کے بوجھ سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتی۔

دین حکم سے نہیں، گفتگو سے دل میں اترتا ہے۔ اور جہاں بات ختم ہو جائے، وہاں تعلق بھی ختم ہو جاتا ہے۔

(طلاق، خاندانی ٹوٹ پھوٹ، اور بچوں کی دینی و اخلاقی شخصیت پر اثرات)

اسلام میں خاندان محض سماجی معاہدہ نہیں، بلکہ روحانی امانت ہے۔ میاں بیوی کا

رشتہ صرف دو افراد کا نہیں، بلکہ آئندہ نسلوں کی فکری، اخلاقی اور دینی بنیادوں کا ضامن ہوتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے نکاح کو عبادت اور طلاق کو — حلال ہونے کے باوجود — سب سے ناپسندیدہ عمل قرار دیا۔ اس ناپسندیدگی کی وجہ جذبات نہیں، بلکہ نتائج کا ادراک ہے۔

جب خاندان ٹوٹتا ہے تو سب سے زیادہ نقصان بچوں کو ہوتا ہے — خاص طور پر ان کی داخلی دنیا کو۔ بچہ بظاہر خاموش رہتا ہے، مگر اس کے اندر سوال، خوف اور عدمِ تحفظ جنم لیتے ہیں:

"کس کی بات سچ ہے؟"

"غلط کون ہے؟"

"اگر میرے والدین ساتھ نہیں رہ سکے تو کیا دین واقعی زندگی کو جوڑتا ہے؟"

یہ سوالات اگر جواب نہ پائیں تو بچے کے دل میں دین پر اعتماد آہستہ آہستہ کمزور ہونے لگتا ہے۔

قرآنِ مجید خاندان کے استحکام کو رحمت قرار دیتا ہے:

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں تا کہ تم ان سے آرام پاؤ اس نے تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی قائم کر دی، یقیناً غور و فکر کرنے والوں کے لئے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ (سورۃ الروم: آیت 21)

جب سکون، مودّت اور رحمت ختم ہو جائیں تو گھر صرف چھت رہ جاتا ہے — پناہ نہیں۔

طلاق کے بعد اکثر بچے دو متضاد بیانیوں کے درمیان پلتے ہیں۔ ایک والدین دوسرے کے خلاف شکایت کرتا ہے، دین کو اپنے موقف کے حق میں استعمال کرتا ہے، یا

خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔ نتیجتاً بچہ دین کو یا تو تنازع کا ہتھیار سمجھنے لگتا ہے، یا غیر متعلق شے۔ دونوں صورتیں دینی شخصیت کے لیے زہرِ قاتل ہیں۔

قرآنِ مجید ہمیں انصاف کا حکم دیتا ہے حتیٰ کہ اختلاف میں بھی:

اور آپس کی فضیلت اور بزرگی کو فراموش نہ کرو (سورۃ البقرہ: آیت 237)

یعنی جدائی کے باوجود فضل کو نہ بھولو— مگر عملی زندگی میں یہی چیز سب سے پہلے بھلا دی جاتی ہے۔

خاندانی ٹوٹ پھوٹ بچوں میں عدمِ اعتماد کو جنم دیتی ہے۔ وہ اختیار، وعدے اور رشتوں پر یقین کھو بیٹھتے ہیں۔ جب اعتماد ٹوٹ جائے تو انسان کسی اعلیٰ اخلاقی یا دینی نظام کو قبول کرنے میں بھی ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے، کیونکہ اس نے قریب ترین رشتوں کو بکھرتے دیکھا ہوتا ہے۔

طلاق کے بعد اکثر گھروں میں دین خاموش ہو جاتا ہے۔ پہلے جو اجتماعی عبادت، دعا یا دینی ماحول ہوتا تھا، وہ یا تو بکھر جاتا ہے یا رسمی بن جاتا ہے۔ بچہ یہ دیکھتا ہے کہ جس دین کے نام پر گھر بنا تھا، وہی دین اب گھر کو جوڑ نہ سکا—اور یہی احساس اس کے دل میں دین سے دوری کی بنیاد رکھ دیتا ہے، چاہے وہ شعوری نہ بھی ہو۔

نبی کریم ﷺ بچوں کے جذبات کا غیر معمولی خیال رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی بچے کے سامنے بڑوں کے جھگڑوں کو معمول نہیں بنایا۔ یہی حکمت آج سب سے زیادہ نظر انداز ہو رہی ہے۔

ایک اور سنگین پہلو یہ ہے کہ ٹوٹے ہوئے خاندانوں میں بچے اکثر قبل از وقت بالغ ہو جاتے ہیں۔ وہ ذمہ داریاں اٹھاتے ہیں، فیصلے کرتے ہیں، اور جذبات دباتے

ہیں — جن کی ان کی عمر اجازت نہیں دیتی۔ اس عمل میں دین ان کے لیے سہارا بننے کے بجائے مزید ذمہ داری محسوس ہونے لگتا ہے۔

قرآنِ مجید بچوں کے بارے میں ہمیں نرمی کا حکم دیتا ہے:

اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا (سورۃ البقرہ: آیت 286)

مگر ٹوٹے ہوئے گھر بچوں کو ان کے وسع سے زیادہ بوجھ دے دیتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ خاندانی ٹوٹ پھوٹ محض سماجی مسئلہ نہیں، بلکہ دینی بحران ہے۔ جب بچے گھر میں استحکام، انصاف اور رحمت نہ دیکھیں تو ان کے لیے اللہ کی رحمت، شریعت کی حکمت اور دین کی جامعیت محض نظری باتیں رہ جاتی ہیں۔

گھر ٹوٹتا ہے تو دیواریں نہیں، یقین گرتا ہے۔ اور جب یقین ٹوٹ جائے، تو ایمان کو سنبھالنا سب سے مشکل ہو جاتا ہے۔

(خاندانی نظام کی بحالی، دینی تربیت کے عملی اصول، اور نسلوں کی اصلاح کے راستے)

یہ حقیقت تسلیم کیے بغیر اصلاح ممکن نہیں کہ خاندانی نظام کی کمزوری نے دین کو صرف افراد سے نہیں، بلکہ نسلوں سے دور کیا ہے۔ مگر اسلام مایوسی کا دین نہیں۔ جس طرح زوال بتدریج آتا ہے، اسی طرح بحالی بھی بتدریج ہوتی ہے — بشرطیکہ نیت درست ہو، سمت واضح ہو، اور عمل مستقل ہو۔

خاندانی نظام کی بحالی کا پہلا اصول یہ ہے کہ دین کو دوبارہ گھر کے مرکز میں لایا جائے — نعرے کے طور پر نہیں، بلکہ زندگی کے طریقے کے طور پر۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ گھر کو مدرسہ بنا دیا جائے، بلکہ یہ کہ فیصلوں، ترجیحات، گفتگو اور طرزِ عمل میں دین کو رہنما مانا

جائے۔

قرآنِ مجید نے نبیوں کے گھروں کو اسی بنیاد پر کامیاب قرار دیا: حضرت اسماعیلؑ کے بارے میں ارشاد ہے۔

اور وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور وہ اپنے رب کے ہاں پسند کیا ہوا تھا۔ (سورۃ مریم: آیت 55)

یہ "**امر**" زبردستی نہیں، نظام کی علامت ہے—ایسا نظام جس میں دین روزمرہ زندگی کا حصہ ہو۔

دینی تربیت کا دوسرا بنیادی اصول محبت کے ساتھ تسلسل ہے۔ بچے ایک دن میں دین دار نہیں بنتے، نہ ہی ایک غلطی سے بگڑ جاتے ہیں۔ دین مستقل ماحول سے منتقل ہوتا ہے۔ اگر گھر میں نماز، سچائی، صبر اور شکر کی فضا مستقل ہو، تو بچے ان اوصاف کو سانسوں کی طرح جذب کر لیتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نرمی کرنے والا اور نرمی کو پسند فرماتا ہے اور نرمی کی بنا پر وہ کچھ عطا فرماتا ہے جو درشت مزاجی کی بنا پر عطا نہیں فرماتا، وہ اس کے علاوہ کسی بھی اور بات پر اتنا عطا نہیں فرماتا۔" (صحیح مسلم حدیث: 6601)

نرمی—یہی تربیت کا سب سے مضبوط ہتھیار ہے۔

بحالی کا تیسرا اصول دینی مکالمے کی بحالی ہے۔ گھر میں دین پر بات ہو، سوال ہو، اختلاف ہو، مگر احترام کے ساتھ۔ بچوں کو یہ احساس دیا جائے کہ دین سوال سے نہیں گھبراتا، بلکہ صحیح سوال کا خیر مقدم کرتا ہے۔ جب بچے سنیں گے، سمجھے جائیں گے، تو وہ مانیں گے بھی۔

قرآنِ مجید ہمیں اس اسلوب کی تعلیم دیتا ہے:

اور نصیحت کرتے رہیں یقیناً یہ نصیحت ایمان والوں کو نفع دے گی۔ (سورۃ الذاریات: آیت 55)

یاددہانی — ڈانٹ نہیں، خوف نہیں، بلکہ شعور کی بیداری۔

خاندانی اصلاح کا ایک نہایت اہم پہلو والدین کی خود اصلاح ہے۔ جب تک والدین خود دین کے ساتھ سنجیدہ، متوازن اور مطمئن تعلق قائم نہیں کریں گے، وہ اولاد کو وہی دین منتقل نہیں کر سکیں گے جس پر انہیں خود اعتماد نہ ہو۔ بچے دلیل سے پہلے سچائی محسوس کرتے ہیں۔

قرآنِ مجید میں سخت تنبیہ ہے:

اللہ کے نزدیک ناراض ہونے کے اعتبار سے بڑی بات ہے کہ تم وہ کہو جو تم نہیں کرتے۔ (سورۃ الصّف: آیت 3)

قول و فعل کا یہی فرق نسلوں کو دین سے دور کرتا ہے۔

ٹوٹے ہوئے یا کمزور گھروں کے لیے اسلام مکمل طور پر دروازے بند نہیں کرتا۔ اگر ماضی میں غلطیاں ہوئیں، اگر رشتے ٹوٹے، اگر بچے متاثر ہوئے — تو بھی اصلاح ممکن ہے۔ شرط یہ ہے کہ سچائی، معافی اور مستقل توجہ کے ساتھ دوبارہ جوڑنے کی کوشش کی جائے۔

قرآنِ مجید ہمیں اصلاحِ ذات کا راستہ دکھاتا ہے:

اگر وہ دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ دونوں کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا۔ (سورۃ النساء: آیت 35)

جب نیت اصلاح کی ہو، تو اللہ راستے کھول دیتا ہے— یہ اصول صرف میاں بیوی پر نہیں، پورے خاندان پر لاگو ہوتا ہے۔

نسلوں کی اصلاح کا آخری مگر سب سے طاقتور اصول دعا ہے۔ والدین کی دعا وہ سرمایہ ہے جو نظر نہیں آتا، مگر تقدیریں بدل دیتا ہے۔ انبیاءؑ نے سب سے زیادہ فکر اپنی نسلوں کی کی— اور سب سے زیادہ دعا بھی۔

حضرت ابراہیمؑ کی دعا قرآن میں محفوظ ہے:

اے میرے رب! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی (سورۃ ابراہیم: آیت 40)

یہ دعا آج بھی زندہ ہے— بس اسے دل سے مانگنے والا چاہیے۔

مجموعی خلاصہ یہ ہے کہ دین سے دوری کا سب سے پہلا اور آخری محاذ گھر ہے۔ اگر گھر میں دین زندہ ہو جائے تو اسکول، میڈیا اور معاشرہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور اگر گھر میں دین کمزور ہو جائے تو کوئی ادارہ اس کی تلافی نہیں کر سکتا۔

اصلاح باہر سے نہیں، اندر سے شروع ہوتی ہے۔ اور دین کی سب سے پہلی مسجد اب بھی گھر ہی ہے۔

باب 18

دوستوں، سوشل سرکل اور معاشرتی دباؤ کے ذریعے دین سے دوری

(انسان بطور سماجی وجود، رفاقت کا اثر، اور دینی شناخت کی تشکیل)

انسان تنہا نہیں جیتا۔ وہ جس فضا میں سانس لیتا ہے، جن لوگوں کے درمیان اٹھتا بیٹھتا ہے، اور جن کی رائے کو اہم سمجھتا ہے — وہ سب مل کر اس کی سوچ، ترجیحات اور طرزِ زندگی کو تشکیل دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے فرد کی اصلاح کے ساتھ ساتھ رفاقت اور صحبت کو غیر معمولی اہمیت دی ہے، کیونکہ انسان اکثر وہی بن جاتا ہے جس کے ساتھ وہ زیادہ وقت گزارتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے نہایت مختصر مگر جامع اصول بیان فرمایا: ''آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، لہٰذا تم میں سے ہر شخص کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے''۔ (سنن ابی داود حدیث: 4833)

یہ حدیث صرف عبادت کی مشابہت کی بات نہیں کرتی، بلکہ سوچ، ذوق اور ترجیحات کی منتقلی کی حقیقت بیان کرتی ہے۔

جدید معاشرے میں دوست اور سوشل سرکل کا کردار پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور ہو چکا ہے۔ خاندان اور محلے کی جگہ اب اسکول، یونیورسٹی، دفتر اور ڈیجیٹل کمیونٹیز نے لے لی ہے۔ یہاں قبولیت (Acceptance) سب سے بڑی خواہش بن جاتی ہے۔ انسان اس خوف میں مبتلا رہتا ہے کہ

''کہیں میں مختلف نہ لگوں''

''کہیں میں پیچھے نہ رہ جاؤں''

اور یہی خوف اسے آہستہ آہستہ اپنے دینی تشخص پر سمجھوتہ کرنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔

قرآنِ مجید انسان کی اسی کمزوری کی طرف اشارہ کرتا ہے:

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم نرمی اختیار کرو تو یہ بھی نرم ہو جائیں۔ (سورۃ القلم: آیت 9)

یہ نرمی اکثر اصولوں کی قیمت پر مانگی جاتی ہے۔

دوستوں کے دباؤ میں دین سے دوری عموماً کسی اعلان یا انکار سے نہیں ہوتی، بلکہ شرمندگی کے ذریعے ہوتی ہے۔نماز پڑھنے میں جھجک، دینی بات کرنے میں ہچکچاہٹ، حلال وحرام پر سوال اٹھانے سے گریز—یہ سب اس خوف کی علامت ہیں کہ کہیں ہمیں **''قدامت پسند''**، **''سخت گیر''** یا **''غیر جدید''** نہ سمجھ لیا جائے۔

قرآنِ مجید ہمیں اس نفسیاتی دباؤ سے خبردار کرتا ہے:

تو تم لوگوں سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو (سورۃ المائدہ: آیت 44)

مگر انسان کا دل اکثر اللہ کے بجائے لوگوں کی رائے سے ڈرنے لگتا ہے۔

معاشرتی دباؤ کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ بعض برے اعمال کو نارمل بنا دیا جاتا ہے۔ جب گناہ اجتماعی صورت اختیار کر لے تو وہ گناہ نہیں لگتا، بلکہ روایت محسوس ہونے لگتا ہے۔ ایسے ماحول میں دین ایک **''حد سے زیادہ سنجیدہ''** طرزِ زندگی دکھائی دیتا ہے، اور نوجوان خود کو اس سے دور رکھ کر سماج میں فِٹ ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

قرآنِ مجید اس فریب کو یوں بیان کرتا ہے:

اور اگر تو ان لوگوں میں سے اکثر کا کہنا مانے جو زمین میں ہیں تو وہ تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے (سورۃ الأنعام: آیت 116)

اکثریت ہمیشہ حق کی ضمانت نہیں ہوتی — مگر معاشرتی دباؤ اکثریت کو دلیل بنا دیتا ہے۔

دوستوں کی صحبت دین پر اثر اس لیے ڈالتی ہے کہ انسان تنہائی سے ڈرتا ہے۔ دین بعض اوقات تنہا کھڑے ہونے کا مطالبہ کرتا ہے — اصول پر، حق پر، اور صبر پر۔ مگر سماج فوری تسکین، ہنسی، اور اجتماعی لذت دیتا ہے۔ اس کشمکش میں کمزور دل اکثر وہ راستہ چنتا ہے جو کم مزاحمت والا ہو۔

نبی کریم ﷺ نے قیامت کے منظر کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض لوگ اپنے دوستوں کو دیکھ کر کہیں گے:

ہائے میری بربادی! کاش کہ میں فلاں کو دلی دوست نہ بناتا۔ (سورۃ الفرقان: آیت 28)

کاش میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا — یہ حسرت صرف آخرت کی نہیں، دنیا کی بھی ہے۔

بنیادی نکتہ یہ ہے کہ دوست اور معاشرہ دین چھینتے نہیں، بلکہ حوصلہ کمزور کر دیتے ہیں۔ انسان جانتا سب کچھ ہے، مانتا سب کچھ ہے، مگر کھڑا نہیں ہو پاتا۔ یہی کمزوری آہستہ آہستہ عادت بن جاتی ہے، اور عادت آخر کار شناخت۔

دین کو رد نہیں کیا جاتا، بس اس کے ساتھ اکیلا کھڑا ہونے کی ہمت کھو دی جاتی ہے۔

(نوجوانوں میں Peer Pressure، فیشن، رجحانات اور دینی کمزوری)

نوجوانی وہ مرحلہ ہے جہاں انسان اپنی شناخت تلاش کر رہا ہوتا ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ کون ہے، کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے، اور معاشرے میں اس کی جگہ کیا ہے۔ اسی تلاش میں وہ سب سے زیادہ اثر قبول کرنے والا بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ Peer Pressure، یعنی ہم عمر لوگوں کا دباؤ، نوجوان کی دینی کمزوری کا سب سے طاقتور سبب بن جاتا ہے — خاموش، مسلسل اور بظاہر بے ضرر انداز میں۔

قرآنِ مجید انسان کی اس نفسیاتی کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے:

بلکہ انسان اپنے آپ کو خوب دیکھنے والا ہے۔ اگرچہ وہ اپنے بہانے پیش کرے۔ (سورۃ القیامہ: آیات 15–14)

انسان جانتا سب کچھ ہے، مگر ماحول کے دباؤ میں اپنے لیے جواز تراش لیتا ہے — اور یہی جواز رفتہ رفتہ عادت بن جاتا ہے۔

Peer Pressure ہمیشہ زبردستی کی شکل میں نہیں آتا۔ اکثر یہ تمسخر، نظرانداز کیے جانے کے خوف، یا قبولیت کی خواہش کے ذریعے کام کرتا ہے۔ نوجوان اگر نماز پڑھتا ہو تو اسے **"زیادہ مذہبی"** کہا جاتا ہے، اگر حلال و حرام کی بات کرے تو **"پرانے خیالات کا"** سمجھا جاتا ہے، اور اگر حدود کی بات کرے تو **"بورنگ"** قرار دیا جاتا ہے۔ یہ القابات نوجوان کو چوٹ نہیں پہنچاتے، مگر اس کی ہمت کو کمزور کر دیتے ہیں۔

قرآنِ مجید ہمیں یاد دلاتا ہے:

اور نہ کمزور بنو اور نہ غم کرو اور تم ہی غالب ہو، اگر تم مومن ہو۔ (سورۃ آل عمران: آیت 139)

لیکن جب ایمان کو اعتماد کے بجائے بوجھ بنا دیا جائے، تو یہ برتری احساس کی سطح پر ختم ہو جاتی ہے۔

فیشن اور رجحانات (Trends) Peer Pressure کی سب سے نرم مگر سب سے گہری شکل ہیں۔ نوجوان وہی پہنتا ہے جو مقبول ہو، وہی بولتا ہے جو ٹرینڈ میں ہو، اور وہی سوچ اپناتا ہے جو سوشل سرکل میں قابلِ قبول ہو۔ مسئلہ کپڑوں یا انداز کا نہیں، بلکہ اس حقیقت کا ہے کہ قبولیت کا معیار دین کے بجائے فیشن بن جاتا ہے۔

قرآنِ مجید اس اندھی تقلید سے خبردار کرتا ہے:

اور جب ان سے کہا جاتا ہے اس کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے تو کہتے ہیں بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے (سورۃ البقرہ: آیت 170)

آج "**آباء**" کی جگہ "**دوست**" اور "**ٹرینڈ**" نے لے لی ہے — مگر منطق وہی ہے۔

فیشن صرف ظاہری تبدیلی نہیں لاتا، بلکہ سوچ اور اقدار کو بھی بدل دیتا ہے۔ جب کسی معاشرے میں بے حیائی، فضول خرچی یا نمائش کو اسٹائل بنا دیا جائے، تو حیا، سادگی اور قناعت غیر دلکش محسوس ہونے لگتی ہیں۔ نوجوان یہاں دین کو رد نہیں کرتا، بس اسے "**بعد میں دیکھنے والی چیز**" بنا دیتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی تو وہ انہیں میں سے ہے"۔ (سنن ابی داود حدیث: 4031)

مشابہت صرف لباس کی نہیں، ذہنی وابستگی کی بھی ہوتی ہے۔

Peer Pressure کا ایک اور خطرناک پہلو یہ ہے کہ گناہ اجتماعی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جب سب کچھ کر رہے ہوں تو غلط کام بھی غلط محسوس نہیں ہوتا۔ اس ماحول میں جو نوجوان دین پر قائم رہنے کی کوشش کرے، وہ خود کو اکیلا، اجنبی اور غیر محفوظ محسوس کرتا ہے—اور یہی احساس اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کرتا ہے۔

قرآنِ مجید قیامت کے دن کی حسرت کو یوں بیان کرتا ہے:

اس دن (گہرے) دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے سوائے پرہیزگاروں کے۔ (سورۃ الزخرف: آیت 67)

دوستی اگر تقویٰ پر نہ ہو تو انجام دشمنی ہے— مگر یہ حقیقت نوجوانی میں شاذ ہی نظر آتی ہے۔

نوجوانوں میں دینی کمزوری کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انہیں متبادل رفاقت فراہم نہیں کی جاتی۔ اگر نیک صحبت، باوقار رول ماڈلز، اور بامقصد سرگرمیاں موجود نہ ہوں تو نوجوان خود بخود ایسے گروہوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے جہاں اسے توجہ، ہنسی اور تعلق ملتا ہے—چاہے اس کی قیمت دین ہی کیوں نہ ہو۔

قرآنِ مجید ہمیں دعا سکھاتا ہے:

اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھ جو اپنے رب کو پہلے اور پچھلے پہر پکارتے ہیں (سورۃ الکہف: آیت 28)

اچھوں کے ساتھ جڑے رہنا محض اخلاقی نصیحت نہیں، بلکہ بقا کی حکمتِ عملی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ Peer Pressure نوجوان کو دین سے دور اس لیے نہیں

کرتا کہ وہ دین کا دشمن ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ اکیلا پڑ جانے سے ڈرتا ہے۔ جب معاشرہ دین دار نوجوان کو سہارا دینے کے بجائے شرمندہ کرے، تو کمزور دل پیچھے ہٹ جاتا ہے—اور یہی پیچھے ہٹنا آخر کار دینی شناخت کو دھندلا دیتا ہے۔

نوجوان دین نہیں چھوڑتا، بس ہجوم میں اپنی پہچان چھپا لیتا ہے۔

(بری صحبت، معمولی گناہوں کا معمول بن جانا، اور ایمان کی تدریجی کمزوری)

انسان شاذ و نادر ہی ایک بڑے گناہ سے اپنی دینی زندگی کا خاتمہ کرتا ہے۔ اکثر زوال کی ابتدا چھوٹے، معمولی اور قابلِ جواز سمجھے جانے والے اعمال سے ہوتی ہے۔ یہی اعمال، جب صحبتِ بد کے ماحول میں دہرائے جائیں، تو آہستہ آہستہ دل کی حساسیت کو ختم کر دیتے ہیں۔ گناہ بڑا نہیں ہوتا، مگر بار بار ہونے والا ہوتا ہے—اور یہی تکرار ایمان کو خاموشی سے کمزور کرتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اس حقیقت کو نہایت گہرے انداز میں بیان فرمایا: ''چھوٹے گناہوں سے بھی اپنے آپ کو بچاؤ، کیونکہ بعض اوقات بہت سے چھوٹے گناہ بھی اکٹھے ہو کر انسان کو ہلاک کر دیتے ہیں'' (مسند احمد حدیث: 3818)

بری صحبت کی سب سے خطرناک خاصیت یہ ہے کہ وہ گناہ کو غیر سنجیدہ بنا دیتی ہے۔ جس ماحول میں جھوٹ مذاق بن جائے، غیبت گفتگو کا حصہ ہو، بے حیائی تفریح سمجھی جائے، اور فرض عبادات کو ''بعد میں'' پر ٹال دیا جائے—وہاں ایمان آہستہ آہستہ ایک رسمی شناخت میں بدل جاتا ہے، زندہ حقیقت نہیں رہتا۔

قرآنِ مجید دل کی اس تبدیلی کو یوں بیان کرتا ہے:

یوں نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کیا عمال کی وجہ سے زنگ (چڑھ گیا) ہے۔

(سورۃ المطففین: آیت 14)

یہ **''زنگ''** ایک دن میں نہیں چڑھتا، بلکہ معمولی گناہوں کی تہہ در تہہ جمع ہونے سے دل پر چھا جاتا ہے۔

بری صحبت اکثر یہ تاثر دیتی ہے کہ **''ہم تو بس ایسے ہی ہیں''**، **''دل تو صاف ہے''**، یا **''سب یہی کر رہے ہیں''**۔ یہ جملے گناہ کو جواز دیتے ہیں اور ضمیر کو خاموش کر دیتے ہیں۔ انسان جانتا ہے کہ یہ درست نہیں، مگر ماحول اس کے احساسِ جرم کو کم کر دیتا ہے—اور یہی کمی ایمان کے زوال کی پہلی علامت ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں خبردار کرتا ہے:

اور اس چیز کا پیچھا نہ کر جس کا تجھے کوئی علم نہیں۔ (سورۃ الإسراء: آیت 36)

لیکن بری صحبت میں عقل کے بجائے اکثریت کی پیروی کی جاتی ہے۔

معمولی گناہ جب معمول بن جائیں تو توبہ کی خواہش بھی کمزور ہو جاتی ہے۔ انسان سوچتا ہے کہ **''بعد میں ٹھیک ہو جاؤں گا''**، **''ابھی عمر پڑی ہے''**، یا **''اللہ غفور الرحیم ہے''**۔ یہ سب باتیں درست ہونے کے باوجود، اگر عمل کے بغیر ہوں تو خود فریبی بن جاتی ہیں۔

مومن اپنے گناہ کو پہاڑ سمجھتا ہے—اور جب گناہ پہاڑ نہ لگے، تو سمجھ لینا چاہیے کہ ایمان کمزور ہو رہا ہے۔

بری صحبت کا ایک اور خطرناک اثر یہ ہے کہ انسان نیکی سے بھی دور ہو جاتا ہے۔ نہ اس لیے کہ وہ نیکی سے نفرت کرتا ہے، بلکہ اس لیے کہ نیکی اسے اجنبی محسوس ہونے لگتی ہے۔ مسجد جانا مشکل لگتا ہے، قرآن سننا بوجھ محسوس ہوتا ہے، اور نیک لوگوں کی صحبت غیر

دلچسپ دکھائی دیتی ہے۔ یہ کیفیت اس بات کی علامت ہے کہ دل کا ذوق بدل چکا ہے۔

قرآنِ مجید اس تبدیلی کو یوں بیان کرتا ہے:

پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔ گویا وہ پتھر ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت۔ (سورۃ البقرہ: آیت 74)

دل کی سختی ہمیشہ بڑے گناہوں سے نہیں، بلکہ چھوٹی نافرمانیوں کی عادت سے پیدا ہوتی ہے۔

بری صحبت میں انسان اکثر یہ بھول جاتا ہے کہ ایمان صرف عقیدہ نہیں، بلکہ مسلسل جدوجہد ہے۔ جب ماحول اس جدوجہد کا مذاق اڑائے، تو انسان آہستہ آہستہ ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ وہ خود کو یہ کہہ کر تسلی دیتا ہے کہ **"میں دوسروں سے بہتر ہوں"** یا **"کم از کم میں اتنا برا نہیں"**— مگر یہ موازنہ اسے مزید نیچے لے جاتا ہے۔

قرآنِ مجید قیامت کے دن کے منظر کو یوں بیان کرتا ہے:

اور جس دن ظالم اپنے دونوں ہاتھ دانتوں سے کاٹے گا (سورۃ الفرقان: آیت 27)

یہ پچھتاوا اکثر اسی صحبت کا نتیجہ ہوتا ہے جسے دنیا میں معمولی سمجھا گیا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ بری صحبت ایمان کو ایک دم نہیں چھینتی، بلکہ احساسِ ایمان کو کمزور کرتی ہے۔ جب گناہ کا بوجھ محسوس نہ ہو، نیکی کا شوق ختم ہو جائے، اور ضمیر خاموش ہو جائے— تو سمجھ لینا چاہیے کہ خطرہ شروع ہو چکا ہے، چاہے ظاہری دین باقی ہو۔

ایمان ایک چراغ ہے، جو ہوا سے نہیں، مسلسل بے احتیاطی سے بجھتا ہے۔

(نیک صحبت کی کمی، دینی رول ماڈلز کا فقدان، اور عملی متبادل کا بحران)

انسان صرف برائی کی موجودگی سے نہیں بگڑتا، بلکہ بھلائی کی عدم موجودگی سے بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔ بہت سے لوگ دین سے اس لیے دور نہیں ہوتے کہ وہ جان بوجھ کر گمراہی اختیار کرتے ہیں، بلکہ اس لیے کہ ان کے سامنے کوئی ایسا زندہ، متوازن اور قابلِ تقلید نمونہ موجود نہیں ہوتا جو انہیں یہ دکھا سکے کہ دین کے ساتھ جینا کیسا ہوتا ہے۔

قرآنِ مجید نے اسی خلا کی طرف اشارہ کیا ہے:

تو کیا جو حق کی طرف رہنمائی کرے وہ زیادہ حق دار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے، یا وہ جو خود اس کے سوا راستہ نہیں پاتا کہ اسے راستہ بتایا جائے؟ (سورۃ یونس: آیت 35)

یعنی جو خود راستہ دکھائے، وہی اتباع کے لائق ہوتا ہے— مگر جب ایسے لوگ ہی کم ہو جائیں تو گمراہی فطری نتیجہ بن جاتی ہے۔

آج کے نوجوان اور عام افراد کے سامنے دینی کردار اکثر یا تو غیر حقیقی دکھائے جاتے ہیں یا انتہاؤں میں پیش کیے جاتے ہیں۔ یا تو ایسا کردار سامنے آتا ہے جو دنیا سے کٹا ہوا محسوس ہو، یا پھر ایسا جو دین کے نام پر سختی، تلخی اور عدم توازن کی علامت بن چکا ہو۔ ان دونوں صورتوں میں دین قابلِ تقلید نہیں رہتا، بلکہ خوف یا بیزاری کا سبب بن جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی ذات اس توازن کی سب سے روشن مثال ہے۔ آپ ﷺ عبادت بھی کرتے تھے، خاندان بھی سنبھالتے تھے، بازار میں بھی جاتے تھے، ہنستے بھی تھے اور غم بھی بانٹتے تھے۔

قرآنِ مجید فرماتا ہے:

یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے (سورۃ الأحزاب: آیت 21)

یہ اسوہ صرف پڑھنے کے لیے نہیں، دکھانے کے لیے تھا— مگر آج دکھانے والے کم ہو گئے ہیں۔

نیک صحبت کی کمی کا مطلب صرف اچھے دوستوں کا نہ ملنا نہیں، بلکہ اچھے ماحول کا ناپید ہو جانا بھی ہے۔ جب مسجد صرف عبادت تک محدود ہو جائے، دین صرف نصاب بن جائے، اور نیکی صرف تقریر میں رہ جائے— تو عام آدمی کے لیے دین روزمرہ زندگی سے کٹ جاتا ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں اجتماعی نیکی کی تلقین کرتا ہے:

نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو (سورۃ المائدہ: 2)

لیکن جب تعاون ختم ہو جائے تو فرد تنہا رہ جاتا ہے، اور تنہائی میں ایمان اکثر کمزور پڑ جاتا ہے۔

دینی رول ماڈلز کے فقدان کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ معاشرہ شہرت کو کردار پر ترجیح دینے لگا ہے۔ جو زیادہ نظر آئے، وہی قابلِ تقلید سمجھا جاتا ہے— چاہے اس کی زندگی میں دین صرف نام کی حد تک ہو۔ نتیجتاً نوجوان ایسے لوگوں سے متاثر ہوتے ہیں جن کے پاس کامیابی تو ہوتی ہے، مگر اخلاقی و دینی گہرائی نہیں۔

قرآنِ مجید ہمیں معیار بدلنے کی دعوت دیتا ہے:

بے شک تم میں سب سے عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے

زیادہ تقویٰ والا ہے (سورۃ الحجرات: آیت 13)

مگر جب تقویٰ نظر نہ آئے، اور صرف ظاہری چمک باقی رہ جائے، تو اصل قدر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

عملی متبادل کا بحران اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم برائی سے تو روکتے ہیں، مگر بھلائی کا راستہ واضح نہیں کرتے۔ ہم کہتے ہیں:

یہ مت کرو،

وہ مت پہنو،

ایسے مت رہو—

مگر یہ نہیں بتاتے کہ پھر کیا کرو؟

نوجوان سوال کرتا ہے: **"اگر یہ سب غلط ہے، تو صحیح زندگی کیسی ہے؟"**

قرآنِ مجید کا اسلوب ہمیشہ متبادل پیش کرتا ہے:

بلاشبہ ہدایت گمراہی سے صاف واضح ہو چکی (سورۃ البقرہ: آیت 256)

صرف انکار نہیں، بلکہ ایمان کا راستہ بھی ساتھ دکھایا گیا ہے۔

جب نیک صحبت، قابلِ تقلید نمونے اور واضح متبادل موجود نہ ہوں، تو معاشرہ خود بخود ایسے گروہوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے جو شناخت، تعلق اور مقصد کا جھوٹا احساس دیتے ہیں۔ یہ گروہ دین کا نعم البدل نہیں ہوتے، مگر وقتی خلا کو پُر کر دیتے ہیں—اور یہی وقتی تسکین بعد میں مستقل گمراہی بن جاتی ہے۔

مرکزی خلاصہ یہ ہے کہ دین سے دوری ہمیشہ دشمنی کا نتیجہ نہیں ہوتی، بلکہ اکثر

راہنمائی کی کمی کا انجام ہوتی ہے۔ جب ہم اچھائی کو جیتا ہوا، متوازن اور قابلِ عمل بنا کر پیش نہیں کریں گے، تو برائی خود کو واحد آپشن کے طور پر پیش کر دے گی۔

لوگ برائی اس لیے نہیں چنتے کہ وہ برائی سے محبت کرتے ہیں، بلکہ اس لیے کہ انہیں بھلائی جیتی جاگتی نظر نہیں آتی۔

(نیک صحبت کی تعمیر، مثبت سوشل سرکل، اور دین کو اجتماعی سطح پر دوبارہ قابلِ عمل بنانے کے اصول)

اگر بری صحبت انسان کو آہستہ آہستہ دین سے دور لے جاتی ہے تو نیک صحبت اسی خاموشی کے ساتھ انسان کو دوبارہ اللہ کی طرف واپس بھی لے آتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ برائی فوری لذت دیتی ہے اور نیکی تدریجی سکون — اور انسان اکثر فوری کو ترجیح دیتا ہے۔ مگر تاریخ، تجربہ اور وحی — تینوں گواہ ہیں کہ پائیدار زندگی صرف نیکی کے ساتھ ہی ممکن ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں واضح اصول دیتا ہے:

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ (سورۃ التوبہ: آیت 119)

یہ "ساتھ" ہونا محض جسمانی قربت نہیں، بلکہ فکری، اخلاقی اور عملی رفاقت کا حکم ہے۔

نیک صحبت کی تعمیر کا پہلا اصول یہ ہے کہ ہم دین کو انفرادی نیکی کے بجائے اجتماعی تجربہ بنائیں۔ جب دین صرف اکیلے نماز پڑھنے، اکیلے بچنے اور اکیلے صبر کرنے تک محدود ہو جائے تو انسان جلد تھک جاتا ہے۔ لیکن جب نیکی مشترک ہو — مشترک دعا، مشترک خدمت، مشترک مقصد — تو دین بوجھ نہیں، سہارا بن جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ کا ہاتھ (اس کی مدد و نصرت) جماعت کے ساتھ ہوتا ہے‘‘۔(سنن ترمذی حدیث:2166)

اللہ کی مدد تنہائی میں کم اور جماعت میں زیادہ محسوس ہوتی ہے—یہ صرف حدیث نہیں، زندگی کا مشاہدہ ہے۔

مثبت سوشل سرکل بنانے کا دوسرا اصول یہ ہے کہ ہم نیکی کو خوش اخلاقی، وقار اور توازن کے ساتھ جوڑیں۔ دین اگر چہرے پر سختی، زبان میں تلخی اور رویّے میں نفرت بن جائے تو وہ قابلِ تقلید نہیں رہتا۔ لوگ دلیل سے پہلے رویّہ دیکھتے ہیں—اور اکثر اسی پر فیصلہ کرتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

اللہ تعالیٰ کی رحمت کے باعث آپ ان پر نرم دل ہیں (سورۃ آل عمران: آیت 159)

نرمی—یہی وہ وصف تھا جس نے لوگوں کو جوڑا، دور نہیں کیا۔

اجتماعی سطح پر دین کو قابلِ عمل بنانے کے لیے ضروری ہے کہ دینی سرگرمیوں کو زندگی کے حقیقی مسائل سے جوڑا جائے۔ اگر دین صرف منبر تک محدود رہے، اور روزگار، تعلقات، ذہنی دباؤ اور جدید چیلنجز سے کٹا رہے—تو نوجوان اسے غیر متعلق سمجھنے لگتا ہے۔ مگر جب دین ان سب میدانوں میں رہنمائی دے، تو وہ دوبارہ معتبر بن جاتا ہے۔

قرآنِ مجید دین کو زندگی کا مکمل نظام قرار دیتا ہے:

مومنو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ (سورۃ البقرہ: آیت 208)

جزوی دین انسان کو مطمئن نہیں کرتا— کامل دین ہی زندگی سنبھالتا ہے۔

نیک صحبت کی بحالی کا ایک اہم مرحلہ نئے رول ماڈلز کی تیاری ہے۔ ہر زمانے کو اپنے نمائندے چاہیے ہوتے ہیں—ایسے لوگ جو دین پر بھی قائم ہوں اور دنیا میں بھی مؤثر ہوں؛ جو مسجد سے جڑے ہوں مگر معاشرے سے کٹے نہ ہوں؛ جو نوجوانوں کی زبان سمجھتے ہوں مگر اصولوں پر سمجھوتہ نہ کرتے ہوں۔

قرآنِ مجید ہمیں قیادت کا معیار سکھاتا ہے:

اور ان کو پیشوا بنایا کہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے (سورۃ الأنبیاء: آیت 73)

راہنمائی صرف بات سے نہیں، عمل سے ہوتی ہے۔

سوشل سرکل کی اصلاح کا ایک عملی اصول یہ ہے کہ ہم تعلق کو شرط کے ساتھ نہ جوڑیں۔ یعنی اگر کوئی مکمل دین دار نہ بھی ہو، تب بھی اسے قریب لایا جائے، دور نہ کیا جائے۔ اصلاح قربت سے ہوتی ہے، علیحدگی سے نہیں۔ نبی ﷺ نے گناہ گاروں کو بھی مجلس میں جگہ دی—اور یہی حکمت ان کے بدلنے کا سبب بنی۔

مجموعی خلاصہ یہ ہے کہ دین سے دوری کا علاج صرف نصیحت نہیں، بلکہ متبادل نظام ہے۔ ہمیں ایسے ماحول بنانے ہوں گے جہاں دین کے ساتھ جینا ممکن، آسان اور باوقار ہو۔ جہاں نیکی اکیلا سفر نہ ہو، اور ایمان ہجوم میں بھی محفوظ رہے۔

لوگ دین کی طرف تب واپس آتے ہیں جب دین انہیں تنہا چھوڑنے کے بجائے اپنا سا محسوس ہو۔

باب 19

میڈیا، ڈیجیٹل کلچر اور سوشل نیٹ ورکس کے ذریعے دینی فکر کی تشکیل یا بگاڑ

(میڈیا بطور خاموش معلم، اور فکر و اقدار کی غیر محسوس تشکیل)

تاریخِ انسانی میں شاید ہی کوئی دور ایسا گزرا ہو جہاں انسان کی سوچ، اقدار اور ترجیحات اتنی تیزی سے اور اتنی خاموشی کے ساتھ تبدیل کی گئی ہوں جتنی آج کے ڈیجیٹل دور میں ہو رہی ہیں۔ میڈیا اب صرف خبر دینے کا ذریعہ نہیں رہا، بلکہ سوچ پیدا کرنے، ذوق بدلنے اور سچ و جھوٹ کی تعریف متعین کرنے والا طاقتور معلم بن چکا ہے—ایسا معلم جو نہ سوال کرتا ہے، نہ اجازت لیتا ہے، بلکہ مسلسل سکھاتا رہتا ہے۔

قرآنِ مجید نے انسان کے سیکھنے کے اس غیر محسوس عمل کی طرف اشارہ فرمایا:

جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ (سورۃ العلق: آیت 4)

آج یہ "قلم" کاغذ پر نہیں، بلکہ اسکرین پر چل رہا ہے—اور جو کچھ اس قلم سے لکھا جا رہا ہے، وہ دلوں میں اتر رہا ہے۔

میڈیا کی سب سے خطرناک خاصیت یہ ہے کہ وہ خود کو غیر جانبدار ظاہر کرتا ہے، حالانکہ وہ ہر لمحہ اقدار منتقل کر رہا ہوتا ہے۔ کون سا موضوع اہم ہے، کس خبر کو نمایاں کرنا ہے، کس سوچ کو نارمل دکھانا ہے، اور کس کو دقیانوسی—یہ سب فیصلے کسی ادارتی صفحے پر نہیں، بلکہ انسان کے لاشعور میں اثر انداز ہوتے ہیں۔

قرآنِ مجید اس غیر محسوس اثر کو یوں بیان کرتا ہے:

شیطان نے ان کے اعمال بد ان کی نگاہوں میں آراستہ کر دیئے (سورۃ النحل: آیت 63)

تزئین — یعنی کسی چیز کو خوبصورت بنا کر پیش کرنا — یہی میڈیا کا سب سے مؤثر ہتھیار رہے۔

جدید میڈیا نے دین سے دوری کا ایک نیا اسلوب متعارف کروایا ہے: خاموش بے توقیری۔ دین کا مذاق اڑانا ضروری نہیں، بس اسے غیر متعلق، غیر عملی یا ذاتی معاملہ بنا کر پیش کر دیا جائے۔ جب دین کو **"پرائیویٹ چوائس"** اور **"ذاتی عقیدہ"** کہہ کر اجتماعی زندگی سے نکال دیا جائے، تو وہ خود بخود اثر کھو دیتا ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں متنبہ کرتا ہے:

اور یہ دنیا کی زندگی تو صرف کھیل اور تماشہ ہے (سورۃ العنکبوت: آیت 64)

جب زندگی کو محض تفریح بنا دیا جائے، تو دین سنجیدگی محسوس ہونے لگتا ہے — اور یہی احساس دین سے دوری کی بنیاد بنتا ہے۔

ڈیجیٹل کلچر نے انسان کو مسلسل مصروف مگر بے فکر بنا دیا ہے۔ اسکرولنگ، ویڈیوز، نوٹیفکیشنز اور مختصر مواد نے گہرے غور و فکر کی صلاحیت کمزور کر دی ہے۔ دین چونکہ توقف، تدبر اور توجہ مانگتا ہے، اس لیے وہ اس شور میں دب جاتا ہے۔ انسان کہتا ہے **"میرے پاس وقت نہیں"**، حالانکہ مسئلہ وقت کا نہیں، توجہ کی تقسیم کا ہے۔

قرآنِ مجید تدبر کی دعوت دیتا ہے:

کیا یہ قران میں غور و فکر نہیں کرتے؟ (سورۃ محمد: 24)

مگر ڈیجیٹل دنیا انسان کو سوچنے نہیں، صرف دیکھتے رہنے کی عادت ڈالتی ہے۔

سوشل میڈیا نے رائے عامہ کو بھی بدل دیا ہے۔ اب سچ کا معیار دلیل نہیں، بلکہ وائرل ہونا ہے۔ جو بات زیادہ دیکھی جائے، زیادہ لائک ہو، زیادہ شیئر ہو—وہی معتبر سمجھی جاتی ہے، چاہے اس کی بنیاد کمزور ہی کیوں نہ ہو۔ اس ماحول میں دینی حقائق، جو تدریج اور حکمت سے سمجھائے جاتے ہیں، فوری اثر نہیں دکھا پاتے۔

قرآنِ مجید اس فتنہ اکثریت کو یوں بیان کرتا ہے:

اور اگر تو ان لوگوں میں سے اکثر کا کہنا مانے جو زمین میں ہیں تو وہ تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے (سورۃ الأنعام: آیت 116)

اکثریت کی پیروی ہمیشہ ہدایت نہیں ہوتی— مگر ڈیجیٹل دنیا نے اکثریت کو سچ کا مترادف بنا دیا ہے۔

میڈیا کا ایک اور خطرناک پہلو یہ ہے کہ وہ دینی شناخت کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ کچھ چیزیں **"اسپریچول"** کہلا کر قابلِ قبول بن جاتی ہیں، اور کچھ **"مذہبی"** کہلا کر بوجھ۔ اس تقسیم میں دین اپنی جامعیت کھو دیتا ہے، اور انسان ایک ایسا عقیدہ اختیار کر لیتا ہے جو زندگی کو چیلنج نہیں کرتا۔

قرآنِ مجید ہمیں مکمل دین کی دعوت دیتا ہے:

مومنو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ (سورۃ البقرہ: آیت 208)

لیکن میڈیا دین کو ٹکڑوں میں پیش کر کے اسے کمزور کر دیتا ہے۔

مرکزی نکتہ یہ ہے کہ میڈیا دین سے دوری کا سبب اس لیے نہیں بنتا کہ وہ کھلے عام دشمنی کرتا ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ متبادل بیانیہ اتنی خوبصورتی سے پیش کرتا ہے کہ اصل بیانیہ غیر ضروری محسوس ہونے لگتا ہے۔ انسان دین کو رد نہیں کرتا، بس اس کی جگہ کسی اور کہانی

کو مان لیتا ہے۔

دورِ حاضر میں سب سے بڑی جنگ تلواروں کی نہیں، کہانیوں کی ہے—اور جو کہانی دل جیت لے، وہی سوچ پر حکومت کرتی ہے۔

(سوشل میڈیا، شارٹ فارم مواد، اور دین کی سطحی تفہیم کا بڑھتا ہوا رجحان)

سوشل میڈیا نے انسان کو معلومات تو بہت دی ہیں، مگر فہم چھین لی ہے۔ آج انسان بہت کچھ جانتا ہے، مگر کم ہی چیز کو گہرائی سے سمجھتا ہے۔ دین، جو صبر، تدبر اور تسلسل مانگتا ہے، اس ماحول میں سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے۔ آیات، احادیث اور فقہی اصول—جو صدیوں کے فہم، سیاق اور علمی روایت سے جڑے ہوئے تھے—اب چند سیکنڈ کی ویڈیو، ایک جملے کے اقتباس یا کسی جذباتی کیپشن میں سمٹتے جا رہے ہیں۔

قرآنِ مجید علم کو محض معلومات نہیں بلکہ فہم اور بصیرت قرار دیتا ہے:

اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور انھیں صرف جاننے والے ہی سمجھتے ہیں۔ (سورۃ العنکبوت: آیت 43)

لیکن شارٹ فارم مواد عقل سے زیادہ ردِعمل پیدا کرتا ہے—سوچ نہیں، جذبہ۔

سوشل میڈیا کا سب سے بڑا فتنہ یہ ہے کہ وہ ہر شخص کو مقرر، ناقد اور مفتی بنا دیتا ہے۔ بغیر علم، بغیر سیاق، اور بغیر ذمہ داری—ہر کوئی دین پر رائے دینے لگتا ہے۔ نتیجتاً دین ایک منظّم علمی نظام کے بجائے آراء کا بازار بن جاتا ہے، جہاں جو بات زیادہ پسند کی جائے، وہی ''درست'' سمجھی جاتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے سخت تنبیہ فرمائی: ''اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں سے چھینتے ہوئے نہیں

اٹھائے گا بلکہ وہ علماء کو اٹھا کر علم کو اٹھالے گا حتی کہ جب وہ (لوگوں میں) کسی عالم کو (باقی) نہیں چھوڑے گا تو لوگ (دین کے معاملات میں بھی) جاہلوں کو اپنے سربراہ بنالیں گے۔ ان سے (دین کے بارے میں) سوال کیے جائیں گے تو وہ علم کے بغیر فتوے دیں گے، اس طرح خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔'' (صحیح مسلم حدیث: 6796)

جب علم والے کم ہوں اور بولنے والے زیادہ، تو گمراہی فطری نتیجہ بن جاتی ہے۔

شارٹ فارم دینی مواد کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ مسائل کو سادہ بنانے کے بجائے سطحی بنا دیتا ہے۔ دین کے پیچیدہ سوالات — جیسے اختلاف، اجتہاد، حالات کا فرق، اور نیت کی اہمیت — سب غائب ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوجوان دین کو یا تو حد سے زیادہ آسان سمجھنے لگتا ہے، یا حد سے زیادہ سخت — درمیانی راستہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں توازن کا دین دیتا ہے:

اور اسی طرح ہم نے تمھیں سب سے بہتر امت بنایا (سورۃ البقرہ: آیت 143)

مگر ڈیجیٹل کلچر توازن نہیں، انتہائیں پسند کرتا ہے — کیونکہ انتہائیں زیادہ وائرل ہوتی ہیں۔

سوشل میڈیا نے دین کے ساتھ تعلق کو بھی کنزیومر ریلیشن بنا دیا ہے۔ انسان وہی سنتا ہے جو اس کے مزاج کے مطابق ہو، وہی دیکھتا ہے جو اس کے خیالات کی تصدیق کرے۔ اصلاح کی بات، تنبیہ کی نصیحت، یا خود احتسابی کا پیغام فوراً اسکرول ہو جاتا ہے۔ اس طرح دین انسان کو بدلنے کے بجائے، انسان کے مطابق ڈھلنے لگتا ہے۔

قرآنِ مجید اس خود فریبی کی نشاندہی کرتا ہے:

پھر کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنا معبود اپنی خواہش کو بنا لیا (سورۃ الجاثیہ: آیت 23)

جب خواہش معیار بن جائے، تو ہدایت بوجھ لگنے لگتی ہے۔

شارٹ فارم مواد کی رفتار نے دینی صبر کو بھی نقصان پہنچایا ہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ دین فوراً جواب دے، فوری سکون دے، اور فوری حل بتائے۔ حالانکہ دین کا طریقہ تدریجی ہے — دل کی اصلاح، عادتوں کی تبدیلی، اور کردار کی تعمیر وقت مانگتی ہے۔ جب یہ وقت نہ دیا جائے، تو دین ادھورا رہ جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی تربیت 23 سال پر محیط تھی — یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تبدیلی کلپ میں نہیں، سفر میں آتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سوشل میڈیا نے دین کو ختم نہیں کیا، بلکہ اسے کم گہرا کر دیا ہے۔ مسئلہ یہ نہیں کہ لوگ دین سن نہیں رہے، بلکہ یہ ہے کہ وہ اسے سمجھ نہیں رہے۔ جب فہم کے بجائے فالوورز، اور بصیرت کے بجائے بریکنگ کلپس معیار بن جائیں، تو دین زندہ رہتے ہوئے بھی کمزور ہو جاتا ہے۔

آج مسئلہ دین کی کمی نہیں، بلکہ دین کی گہرائی کے ختم ہونے کا ہے۔ اور جب گہرائی چلی جائے، تو سچ بھی سطحی لگنے لگتا ہے۔

(ڈیجیٹل مبلغین، آن لائن مذہبی اتھارٹی، اور علم و شہرت کا تصادم)

ہر دور میں دین سکھانے والے موجود رہے ہیں، مگر ہر دور میں سکھانے کا ذریعہ بدلتا رہا ہے۔ ماضی میں مسجد، مدرسہ اور درس گاہ علم کی پہچان تھے؛ آج اسکرین، کیمرہ اور

پلیٹ فارم یہ کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہ تبدیلی بذاتِ خود نہ خیر ہے نہ شر—اصل سوال یہ ہے کہ علم کی جگہ شہرت تو نہیں لے رہی؟

قرآنِ مجید ہمیں علم کی بنیاد بتاتا ہے:

کہو بھلا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو نہیں رکھتے دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ (سورۃ الزمر: آیت 9)

یہ سوال علم اور جہالت کا ہے، مگر ڈیجیٹل دنیا نے ایک تیسری قسم پیدا کر دی ہے:

مشہور مگر غیر مستند۔

ڈیجیٹل مبلغین کا ابھرنا ایک فطری عمل تھا۔ لوگوں نے وہیں سوال پوچھنا شروع کیے جہاں وہ وقت گزارتے تھے۔ مسئلہ یہاں سے شروع ہوا کہ اتھارٹی کا معیار بدل گیا۔ پہلے علم، تقویٰ، سند اور کردار معیار تھے؛ اب ویوز، فالوورز اور وائرل کلپس معیار بن گئے۔ اس تبدیلی نے دینی رہنمائی کو غیر محسوس انداز میں کمزور کر دیا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اپنے بھائی کو کسی ایسے امر کا مشورہ دیا جس کے متعلق وہ یہ جانتا ہو کہ بھلائی اس کے علاوہ دوسرے میں ہے تو اس نے اس کے ساتھ خیانت کی''۔ (سنن ابی داود حدیث: 3657)

لیکن ڈیجیٹل ماحول میں فتویٰ اور رائے کے درمیان فرق مٹ گیا ہے—ہر بات ''Openion'' بن گئی ہے۔

آن لائن مذہبی اتھارٹی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ احتساب سے آزاد ہوتی ہے۔ نہ استاد، نہ ادارہ، نہ علمی روایت—صرف کیمرہ اور سامع۔ اس آزادی میں بعض لوگ خلوص کے ساتھ کام کرتے ہیں، مگر بہت سے لوگ نادانستہ یا دانستہ دین کو اپنی

برانڈنگ کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ یہاں نیت کا سوال ثانوی ہو جاتا ہے، اثرات بنیادی مسئلہ بن جاتے ہیں۔

قرآنِ مجید ہمیں نیت کی اہمیت یاد دلاتا ہے:

انہیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ صرف اللہ کی عبادت کریں اسی کے لئے دین کو خالص رکھیں۔ (سورۃ البینۃ: آیت 5)

جب دین اخلاص کے بجائے الگورتھم کے تابع ہو جائے، تو پیغام بھی بدلنے لگتا ہے۔

علم و شہرت کا تصادم اس وقت شدید ہو جاتا ہے جب سچ کم مقبول اور سنسنی زیادہ مقبول ہو۔ پیچیدہ دینی باتیں، اختلافی مسائل کی حکیمانہ وضاحت، یا تدریجی اصلاح—یہ سب کم وائرل ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس سخت بیانات، جذباتی جملے اور سادہ مگر ادھورے حل فوراً پھیل جاتے ہیں۔ یوں دین کا مزاج بدلنے لگتا ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں اس روش سے خبردار کرتا ہے:

اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو (سورۃ البقرہ: آیت 42)

مگر ڈیجیٹل دنیا میں حق کو باطل سے ملانے کے لیے صرف ایک کلپ کافی ہوتا ہے۔

اس تصادم کا ایک اور خطرناک پہلو یہ ہے کہ اصل علماء پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ جو لوگ برسوں کی محنت، مطالعہ اور ضبطِ نفس سے علم حاصل کرتے ہیں، وہ شور کے اس بازار میں کم سنائی دیتے ہیں۔ نتیجتاً عام آدمی کے ذہن میں یہ تاثر بنتا ہے کہ علم آسان ہے، فوری ہے، اور ہر کسی کے لیے یکساں ہے—حالانکہ دین نے ہمیشہ علم کو ذمہ داری کے ساتھ

جوڑا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”عالم کی فضیلت عابد پر ایسے ہی ہے جیسے چودھویں رات کی تمام ستاروں پر، اور علماء انبیاء کے وارث ہیں، اور نبیوں نے اپنا وارث درہم و دینار کا نہیں بنایا بلکہ علم کا وارث بنایا تو جس نے علم حاصل کیا اس نے ایک وافر حصہ لیا“۔ (سنن ابی داود حدیث: 3641)

وراثت شور سے نہیں، امانت سے ملتی ہے۔

آن لائن مذہبی ماحول نے ایک اور مسئلہ بھی پیدا کیا ہے: دینی تقسیم۔ ہر مبلغ اپنے مخصوص زاویے، مسلک یا اسلوب کو مکمل دین کے طور پر پیش کرتا ہے۔ سننے والا جب مختلف بیانیے سنتا ہے تو یا تو الجھن کا شکار ہو جاتا ہے، یا کسی ایک کو جذباتی بنیاد پر چن لیتا ہے۔ اس طرح دین وحدت کے بجائے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

قرآنِ مجید اس تفرقے سے سختی سے روکتا ہے:

اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے اور اس سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور شرک کرنے والوں سے نہ ہو جاؤ۔ ان لوگوں سے جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کئی گروہ ہو گئے، ہر گروہ اسی پر جو ان کے پاس ہے، خوش ہیں۔ (سورۃ الروم: آیت 31–32)

مرکزی خلاصہ یہ ہے کہ ڈیجیٹل مبلغ بذاتِ خود مسئلہ نہیں، مگر بغیر معیار کے اتھارٹی مسئلہ ہے۔ جب علم کی جگہ شہرت، تحقیق کی جگہ ردِعمل، اور حکمت کی جگہ جذبات لے لیں— تو دین زندہ رہتے ہوئے بھی اپنی رہنمائی کی قوت کھو دیتا ہے۔

مسئلہ یہ نہیں کہ کون بول رہا ہے، مسئلہ یہ ہے کہ بولنے والا کس بنیاد پر بول رہا

ہے۔

(میڈیا میں دین کی نمائندگی، اسلاموفوبیا، اور خود مسلمانوں کے بیانیے کا بحران)

ہر دور میں طاقت صرف ہتھیاروں سے نہیں ناپی جاتی، بلکہ بیانیے (Narrative) سے بھی۔ جو قوم اپنی کہانی خود نہ سنائے، اس کی کہانی کوئی اور سنا دیتا ہے—اور اکثر اپنے مفاد میں۔ آج میڈیا، فلم، ڈرامہ، خبروں اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کے ذریعے اسلام کی جو تصویر دنیا کے سامنے آ رہی ہے، وہ زیادہ تر مسلمانوں کی اپنی بیان کردہ نہیں، بلکہ دوسروں کی تشریح کردہ ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں خبر کے معاملے میں ہوشیار رہنے کی تعلیم دیتا ہے:

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تمھارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو اچھی طرح تحقیق کر لو (سورۃ الحجرات: آیت 6)

مگر مسئلہ یہ ہے کہ آج خبر دینے والا صرف "فاسق" نہیں، بلکہ طاقتور بھی ہے—اور طاقتور کی بات بغیر تحقیق قبول کر لی جاتی ہے۔

اسلاموفوبیا کسی ایک واقعے یا حادثے کا نتیجہ نہیں، بلکہ ایک منظّم بیانیے کی پیداوار ہے۔ میڈیا میں مسلمان اکثر یا تو شدت پسند کے طور پر دکھایا جاتا ہے، یا پسماندہ، غصے والا، غیر مہذب انسان کے طور پر۔ اس تصویر کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ یہ اتنی بار دہرائی جاتی ہے کہ سچ محسوس ہونے لگتی ہے— حتیٰ کہ خود مسلمانوں کے ذہنوں میں بھی۔

قرآنِ مجید اس نفسیاتی دباؤ کی طرف اشارہ کرتا ہے:

ان کی تو چاہت ہے کہ جس طرح کے کافر وہ ہیں تو بھی ان کی طرح کفر کرنے لگو اور پھر سب یکساں ہو جاؤ (سورۃ النساء: آیت 89)

یعنی وہ چاہتے ہیں کہ تم اپنی شناخت کھو دو، تاکہ سب برابر ہو جائیں—یہ خواہش آج اسلاموفوبیا کے مختلف رویوں میں سامنے آ رہی ہے۔

میڈیا کا اثر صرف غیر مسلم معاشروں تک محدود نہیں رہتا، بلکہ مسلمان بھی اسی اسکرین کو دیکھتے ہیں، اسی زبان میں سوچتے ہیں، اور اسی زاویے سے خود کو دیکھنے لگتے ہیں۔ یہاں سے داخلی احساسِ کمتری جنم لیتا ہے۔ مسلمان اپنے دین کو دفاعی انداز میں بیان کرنے لگتا ہے، معذرت خواہ بن جاتا ہے، اور کبھی کبھی اپنی ہی اقدار پر شرمندہ محسوس کرتا ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں اس کیفیت سے نکالتا ہے:

اور نہ کمزور بنو اور نہ غم کرو اور تم ہی غالب ہو، اگر تم مومن ہو۔ (سورۃ آل عمران: آیت 139)

لیکن جب ایمان فخر کے بجائے وضاحت بن جائے، تو کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔

اس بحران کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ مسلمان اپنا بیانیہ خود بھی واضح انداز میں پیش نہیں کر پا رہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اسلام کیا ہے، مگر یہ نہیں جانتے کہ اسے جدید زبان، جدید مسائل اور جدید ذہن کے سامنے کیسے رکھا جائے۔ نتیجتاً یا تو ہم خاموش رہتے ہیں، یا جذباتی ردِعمل دیتے ہیں—دونوں صورتیں بیانیہ مضبوط نہیں کرتیں۔

قرآنِ مجید دعوت کے اسلوب کو واضح کرتا ہے:

اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلا اور ان سے اس طریقے کے ساتھ بحث کر جو سب سے اچھا ہے۔ (سورۃ النحل: آیت 125)

حکمت — یعنی موقع، زبان اور مخاطب کو سمجھ کر بات کرنا — یہی وہ چیز ہے جس کی آج شدید کمی ہے۔

میڈیا میں دین کی غلط نمائندگی کا ایک سبب مسلمانوں کا آپس کا انتشار بھی ہے۔ جب ہم خود دین کے بنیادی اصولوں پر متفق نہ ہوں، جب ہم ایک دوسرے کو کافر، گمراہ یا دشمن قرار دیں، تو بیرونی دنیا ہمارے اختلافات کو پورے دین کے طور پر پیش کر دیتی ہے۔ یوں ہمارا اندرونی جھگڑا عالمی بیانیہ بن جاتا ہے۔

قرآنِ مجید اس انجام سے خبردار کرتا ہے:

اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو اور آپس میں مت جھگڑو، ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی (سورۃ الأنفال: آیت 46)

نزاع صرف رشتے نہیں توڑتا، اثر بھی ختم کر دیتا ہے۔

اسلاموفوبیا کا مقابلہ صرف احتجاج یا وضاحت سے نہیں ہو سکتا، بلکہ مثالی کردار سے ہوتا ہے۔ جب مسلمان اپنے عمل، اخلاق، انصاف اور خدمت کے ذریعے دین کو جیتا ہوا دکھائیں، تو میڈیا کا منفی بیانیہ خود کمزور پڑ جاتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسلام سب سے زیادہ تلوار سے نہیں، کردار سے پھیلا۔

نبی کریم ﷺ کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

اور بیشک تو بہت بڑے (عمدہ) اخلاق پر ہے۔ (سورۃ القلم: آیت 4)

یہ اخلاق ہی تھا جس نے دشمنوں کے دل بھی بدل دیے۔

مرکزی خلاصہ یہ ہے کہ میڈیا میں دین کی منفی نمائندگی ایک حقیقت ہے، مگر اس سے بڑا مسئلہ اپنے بیانیے کی کمزوری ہے۔ جب ہم خود واضح، متوازن اور باوقار انداز میں

اسلام کو پیش نہیں کریں گے، تو دوسروں کی پیش کردہ تصویر غالب آ جائے گی۔ دین کو دفاع نہیں، اعتماد کے ساتھ تعارف درکار ہے۔

جو قوم اپنی پہچان خود بیان نہیں کرتی، وہ ایک دن دوسروں کی لکھی ہوئی کہانی میں گم ہو جاتی ہے۔

(ڈیجیٹل دور میں دینی بیانیے کی تعمیر، میڈیا لٹریسی، اور فکری خوداعتمادی کے اصول)

ڈیجیٹل دور نے مسلمانوں کے سامنے ایک غیر معمولی چیلنج رکھا ہے، مگر اسی کے ساتھ ایک تاریخی موقع بھی فراہم کیا ہے۔ اگر میڈیا نے دین کو بگاڑنے میں کردار ادا کیا ہے، تو یہی میڈیا دین کو درست، متوازن اور مؤثر انداز میں پیش کرنے کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ میڈیا طاقتور ہے یا نہیں، سوال یہ ہے کہ اس طاقت کو کون اور کس شعور کے ساتھ استعمال کر رہا ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں ذمہ داری کا احساس دلاتا ہے:

اور انھیں ٹھہراؤ، بے شک یہ سوال کیے جانے والے ہیں۔ (سورۃ الصافات: آیت 24)

یہ جواب دہی صرف اعمال کی نہیں، بلکہ بیانیوں، الفاظ اور اثرات کی بھی ہے۔

ڈیجیٹل دور میں دینی بیانیے کی تعمیر کا پہلا اصول یہ ہے کہ ہم ردِعمل کے بجائے مقصد کے ساتھ بات کریں۔ جب بھی اسلام پر اعتراض ہو، ہمارا پہلا ردِعمل دفاع یا غصہ نہیں ہونا چاہیے، بلکہ یہ سوال ہونا چاہیے کہ **"ہم کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟"** ردِعمل وقتی توجہ دلاتا ہے، مگر مقصدی بیانیہ دیرپا اثر چھوڑتا ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں مقصدیت سکھاتا ہے:

آپ کہہ دیجئے میری راہ یہی ہے۔ میں اور میرے متبعین اللہ کی طرف بلا رہے ہیں (سورۃ یوسف: آیت 108)

بصیرت — یعنی سمت، علم اور شعور کے ساتھ دعوت۔

دوسرا بنیادی اصول میڈیا لٹریسی ہے، یعنی میڈیا کو سمجھنے کی صلاحیت۔ ہر خبر، ہر ویڈیو اور ہر بیانیہ حقیقت نہیں ہوتا۔ مسلمان اگر خود میڈیا کے طریقہ کار، الگورتھمز، اور مفاداتی ڈھانچوں کو نہ سمجھیں، تو وہ ہمیشہ دوسروں کی لکھی ہوئی کہانی کا حصہ بنتے رہیں گے۔

قرآنِ مجید ہمیں تنقیدی شعور دیتا ہے:

﴿أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾

یہ سوال بار بار دہرایا گیا — تاکہ انسان دیکھے بھی اور سمجھے بھی۔

میڈیا لٹریسی کا مطلب یہ بھی ہے کہ ہم سچ اور مقبولیت میں فرق کرنا سیکھیں۔ جو بات زیادہ وائرل ہو، ضروری نہیں کہ وہ زیادہ درست ہو۔ دین کا معیار ہمیشہ دلیل، اخلاق اور حکمت رہے گا — ویوز اور لائکس نہیں۔

قرآنِ مجید ہمیں یاد دلاتا ہے:

اور میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہیں۔ (سورۃ سبأ: آیت 13)

حق ہمیشہ اقلیت میں رہا ہے، مگر اثر ہمیشہ اسی کا رہا ہے۔

دینی بیانیے کی تعمیر کا تیسرا اصول مثبت نمائندگی ہے۔ ہمیں صرف غلط کی تردید نہیں کرنی، بلکہ صحیح کو جیتا ہوا دکھانا ہے۔ جب مسلمان اپنی روزمرہ زندگی میں عدل، دیانت، خدمت، علم اور رحم کو نمایاں کریں، تو میڈیا کا منفی بیانیہ خود کمزور پڑ جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی زندگی اس کی زندہ مثال ہے۔ آپ ﷺ نے خطبات سے زیادہ عمل کے ذریعے اسلام متعارف کروایا۔

قرآنِ مجید گواہی دیتا ہے:

اور ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لئے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے۔ (سورۃ الأنبیاء: آیت 107)

فکری خود اعتمادی دینی بیانیے کی روح ہے۔ جب مسلمان اپنے دین پر خود یقین رکھتے ہوں، تو وہ نہ معذرت خواہ ہوتے ہیں، نہ جارح۔ وہ وضاحت کرتے ہیں، صفائی نہیں؛ دعوت دیتے ہیں، بحث نہیں۔ یہ اعتماد علم، تاریخ اور وحی سے جڑا ہوتا ہے—نعرے سے نہیں۔

قرآنِ مجید ہمیں اسی اعتماد کی دعوت دیتا ہے:

اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لائے، وہ انھیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے (سورۃ البقرہ: آیت 257)

ڈیجیٹل دور میں دینی ذمہ داری صرف علماء یا مبلغین تک محدود نہیں رہی۔ ہر وہ شخص جو پوسٹ کرتا ہے، شیئر کرتا ہے، تبصرہ لکھتا ہے—وہ کسی نہ کسی درجے میں دین کا نمائندہ بن جاتا ہے۔ اس لیے خاموشی بھی پیغام ہے، اور غیر ذمہ دار گفتگو بھی۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اسے چاہیئے کہ اچھی بات زبان سے نکالے ورنہ چپ رہے۔'' (صحیح البخاری حدیث: 6138)

مجموعی خلاصہ یہ ہے کہ میڈیا دین کو ختم نہیں کر سکتا، اگر مسلمان سمجھداری، بصیرت اور اعتماد کے ساتھ اس میدان میں موجود ہوں۔ اصل مسئلہ طاقت کا نہیں، تیاری کا ہے۔

جب ہم اپنے بیانیے کو خود نہیں بناتے، تو کوئی اور ہمیں ہمارے بارے میں بتا دیتا ہے — اور اکثر غلط بتاتا ہے۔

ڈیجیٹل دنیا میں خاموشی بھی ہار ہے، اور شور بھی — جیت صرف اس کی ہے جو سچ کو حکمت کے ساتھ پیش کرے۔

باب 20

تعلیمی نظام، نصاب اور فکری تشکیل میں دین کی کمزوری

(تعلیم بطور فکری سانچہ، اور دین کی تدریجی بے دخلی)

تعلیم صرف معلومات کی منتقلی کا نام نہیں، بلکہ یہ وہ عمل ہے جس کے ذریعے ایک نسل کی سوچ، ترجیحات اور زندگی کا مقصد تشکیل پاتا ہے۔ جو کچھ بچے اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں سیکھتے ہیں، وہ محض مضامین نہیں ہوتے، بلکہ ایک خاص زاویہ نظر، ایک مخصوص تصورِ کامیابی، اور ایک طے شدہ فکری سمت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تعلیم سے دین کمزور ہوتا ہے، تو دین فرد کی زندگی سے بھی آہستہ آہستہ غیر متعلق ہوتا چلا جاتا ہے۔

جدید تعلیمی نظام کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ وہ علم کو مقصد سے کاٹ دیتا ہے۔ بچوں کو بتایا جاتا ہے کہ تعلیم کا مقصد اچھی نوکری، مالی استحکام اور سماجی حیثیت ہے۔ کہیں یہ نہیں بتایا جاتا کہ علم انسان کو کیا بناتا ہے، نہ یہ کہ وہ علم اسے اللہ کے قریب کیسے لے جا سکتا ہے۔ یوں تعلیم کامیابی تو سکھاتی ہے، مگر معنویت نہیں۔

قرآنِ مجید اس یک رخی علم پر سوال اٹھاتا ہے:

وہ دنیا کی زندگی کے کچھ ظاہر کو جانتے ہیں اور وہ آخرت سے، وہی غافل ہیں۔ (سورۃ الروم: آیت 7)

یہ آیت آج کے تعلیمی ماڈل کی واضح تصویر ہے — دنیا کا علم، مگر آخرت سے غفلت۔

نصاب (Curriculum) کسی قوم کی خاموش دستاویز ہوتا ہے۔ جو چیز نصاب میں شامل ہو، وہ اہم سمجھی جاتی ہے؛ جو نکال دی جائے، وہ غیر اہم۔ جب دینی

اقدار، اسلامی تاریخ، اخلاقی سوالات اور روحانی پہلو نصاب کے حاشیے پر چلے جائیں، تو طالب علم لاشعوری طور پر یہ سیکھتا ہے کہ دین زندگی کے مرکزی معاملات سے متعلق نہیں۔

لیکن نصاب میں فضل، اخلاق اور مقصد کی بات کم، مقابلہ، نمبرز اور رینکنگ کی بات زیادہ ہوتی ہے۔

تعلیمی اداروں میں دین کی کمزوری کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ سوال اور ایمان کو متضاد بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ تنقیدی سوچ کے نام پر بعض اوقات مذہب کو قدامت، غیر سائنسی یا ذاتی معاملہ قرار دیا جاتا ہے۔ نتیجتاً طالب علم یہ سمجھنے لگتا ہے کہ عقیدہ رکھنا علمی کمزوری ہے، اور سوال اٹھانا دین سے دوری۔

قرآنِ مجید اس تاثر کو رد کرتا ہے:

﴿أَفَلَا يَتَفَكَّرُونَ﴾

﴿أَفَلَا يَعْقِلُونَ﴾

یہ سوالات قرآن میں بار بار آتے ہیں — یہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ ایمان عقل کے خلاف نہیں، بلکہ عقل کی رہنمائی ہے۔

تعلیمی ماحول کا اثر صرف کلاس روم تک محدود نہیں رہتا۔ وہاں کی ثقافت، اساتذہ کا رویہ، اور ادارے کی اقدار — سب مل کر ایک پیغام دیتے ہیں۔ جب کامیاب وہی استاد سمجھا جائے جو دین سے لاتعلق ہو، اور رول ماڈل وہی طالب علم جو مذہبی شناخت سے دور ہو — تو پیغام واضح ہو جاتا ہے، چاہے الفاظ میں نہ کہا جائے۔

نبی کریم ﷺ نے تعلیم کو تربیت سے جدا نہیں کیا۔ آپ ﷺ معلم بھی تھے اور مربی بھی۔

قرآنِ مجید گواہی دیتا ہے:

جو ان کے سامنے اس کی آیات پڑھتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے (سورۃ الجمعہ: آیت 2)

تعلیم، حکمت اور تزکیہ — یہ تینوں ایک ساتھ تھے، الگ الگ نہیں۔

مرکزی خلاصہ یہ ہے کہ تعلیمی نظام دین سے دوری کا سبب اس لیے بنتا ہے کہ وہ علم کو بے مقصد، انسان کو بے سمت، اور کامیابی کو بے روح بنا دیتا ہے۔ جب نسلیں یہ سیکھ لیں کہ دین امتحان میں نہیں آتا، کیریئر میں نہیں آتا، اور ترقی میں رکاوٹ ہے — تو وہ دین کو زندگی کے حاشیے پر رکھ دیتی ہیں، چاہے زبان سے اس کا انکار نہ بھی کریں۔

تعلیم اگر صرف دماغ بنائے اور دل نہ سنوارے، تو وہ ترقی تو دیتی ہے، ہدایت نہیں۔

(نصاب کی سیکولرائزیشن، اقدار کی تبدیلی، اور دینی و اخلاقی خلا)

نصاب کسی قوم کا صرف تعلیمی خاکہ نہیں ہوتا، بلکہ اس کا فکری آئینہ ہوتا ہے۔ یہ طے کرتا ہے کہ آئندہ نسل کن چیزوں کو اہم سمجھے گی، کن سوالات پر سوچے گی، اور کن اقدار کو زندگی کا حصہ بنائے گی۔ جب کسی نصاب سے دین کو بتدریج نکالا جاتا ہے، تو یہ عمل محض ایک مضمون کے اخراج کا نہیں ہوتا، بلکہ پورے تصورِ زندگی کی تبدیلی کا اعلان ہوتا ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں یاد دلاتا ہے کہ علم کبھی غیر جانب دار نہیں ہوتا:

تو کیا ہم فرماں برداروں کو جرم کرنے والوں کی طرح کر دیں گے؟ کیا ہے تمھیں، تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟ (سورۃ القلم: آیت 36–35)

یہ آیات اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ فیصلے ہمیشہ کسی نہ کسی قدر

(Value) کی بنیاد پر ہوتے ہیں—اور نصاب بھی انہی اقدار کا ترجمان ہوتا ہے۔

نصاب کی سیکولرائزیشن کا مطلب یہ نہیں کہ مذہب کا نام مکمل طور پر ختم کر دیا جائے، بلکہ یہ ہے کہ دین کو زندگی سے غیر متعلق بنا کر پیش کیا جائے۔ کبھی اسے محض تاریخ کا حصہ بنا دیا جاتا ہے، کبھی ثقافت تک محدود کر دیا جاتا ہے، اور کبھی صرف نجی عقیدے کے طور پر دکھایا جاتا ہے۔ نتیجتاً طالب علم کے ذہن میں یہ تصور راسخ ہو جاتا ہے کہ دین کا تعلق امتحان، معیشت، سیاست یا سماجی فیصلوں سے نہیں۔

قرآنِ مجید اس تقسیم کو رد کرتا ہے:

پھر کیا تم کتاب کے بعض پر ایمان لاتے ہو اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ (سورۃ البقرہ: آیت 85)

یہ آیت ہمیں خبردار کرتی ہے کہ دین کو ٹکڑوں میں قبول کرنا دراصل اسے کمزور کرنے کا راستہ ہے۔

جب نصاب میں اخلاقیات کو خدا کے تصور سے جدا کر دیا جاتا ہے تو ایک اخلاقی خلا جنم لیتا ہے۔ اچھائی اور برائی اب وحی کی بنیاد پر نہیں، بلکہ حالات، اکثریت یا مفاد کی بنیاد پر طے ہونے لگتی ہے۔ طالب علم سیکھتا ہے کہ سچ وہ ہے جو فائدہ دے، اور غلط وہ ہے جو نقصان پہنچائے—یوں اخلاق مستقل قدر نہیں رہتا، بلکہ (Negotiable) شے بن جاتا ہے۔

قرآنِ مجید اخلاق کو مضبوط بنیاد دیتا ہے:

اللہ تعالیٰ عدل کا، بھلائی کا اور قرابت داروں کے ساتھ سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے (سورۃ النحل: آیت 90)

یہ حکم کسی معاشی یا سماجی فائدے سے مشروط نہیں، بلکہ حق کی بنیاد پر ہے۔

نصاب کی اقداری تبدیلی کا ایک گہرا اثر یہ بھی ہے کہ کامیابی کا تصور بدل جاتا ہے۔ تعلیم کا مقصد اب **''اچھا انسان''** بنانا نہیں، بلکہ **''موثر فرد''** بنانا رہ جاتا ہے۔ مقابلہ، خود غرض ترقی، اور ذاتی فائدہ مرکزی اقدار بن جاتے ہیں، جبکہ ایثار، خدمت، اور جواب دہی ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔

قرآنِ مجید ہمیں کامیابی کی مختلف تعریف دیتا ہے:

کہ جس نے (اپنے) نفس (یعنی روح) کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا۔ (سورۃ الشّمس: آیت 9)

اصل کامیابی نفس کی پاکیزگی ہے، مگر نصاب اس پہلو کو شاذ ہی چُھوتا ہے۔

سیکولرائزڈ نصاب کا ایک اور نقصان یہ ہے کہ وہ دینی سوالات کو غیر سائنسی یا غیر ضروری سمجھنے لگتا ہے۔ خدا، مقصدِ حیات، موت اور جواب دہی جیسے سوالات کو یا تو فلسفے کے کمرے میں بند کر دیا جاتا ہے یا سرے سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ طالب علم دنیا کے بارے میں تو بہت کچھ جان لیتا ہے، مگر خود اپنے بارے میں لاعلم رہتا ہے۔

قرآنِ مجید انسان کو خود شناسی کی دعوت دیتا ہے:

اور یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں (بہت سی) نشانیاں ہیں۔ اور خود تمہارے نفوس میں تو کیا تم دیکھتے نہیں؟۔ (سورۃ الذاریات: آیت 21)

دینی و اخلاقی خلا سب سے زیادہ اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب تعلیم یافتہ فرد مشکل فیصلوں سے دوچار ہوتا ہے۔ جب کوئی واضح اخلاقی رہنمائی نہ ہو، تو وہ یا تو قانون کی حد تک خود کو محدود کر لیتا ہے، یا اکثریت کی پیروی کرتا ہے۔ یوں تعلیم یافتہ مگر بے سمت افراد

پیدا ہوتے ہیں— جو مہارت رکھتے ہیں، مگر حکمت سے خالی ہوتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے علم کے مقصد کو واضح فرمایا: ''اے اللہ! میں اس علم سے پناہ مانگتا ہوں جو نفع نہ دے، اور اس دعا سے جو سنی نہ جائے، اور اس دل سے جو (اللہ سے) نہ ڈرے، اور اس نفس سے جو آسودہ نہ ہوتا ہو''۔ (سنن ابن ماجہ حدیث: 250)

ایسا علم جو فائدہ نہ دے— یہی وہ خطرہ ہے جو اخلاق سے خالی تعلیم میں پوشیدہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نصاب کی سیکولرائزیشن نے تعلیم کو غیر مذہبی نہیں، بلکہ غیر معنوی بنا دیا ہے۔ جب دین کو زندگی کے سوالات سے الگ کر دیا جائے، تو خالی جگہ کو مادیت، مفاد اور خود غرضی پُر کر لیتی ہے۔ یہی خلا بعد میں فکری بے چینی، اخلاقی تضاد اور روحانی تشنگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

نصاب اگر صرف ہنر دیا ور حکمت نہ دے، تو وہ ماہر تو بناتا ہے، انسان نہیں۔

(زوال کے اسباب: جب قومیں اپنے اصول کھو بیٹھتی ہیں)

تاریخِ انسانی کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ قوموں کا عروج یا زوال محض اسلحے، وسائل یا آبادی سے طے نہیں ہوتا بلکہ اس کا اصل فیصلہ فکری، اخلاقی اور روحانی بنیادیں کرتی ہیں۔ جب کوئی قوم اپنے بنیادی اصولوں سے جُڑی رہتی ہے تو وقت کی آندھیاں بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں، اور جب وہی قوم اپنے نظریے سے منہ موڑ لے تو مضبوط قلعے بھی ریت کی دیوار ثابت ہوتے ہیں۔ قرآن مجید اسی حقیقت کو ایک آفاقی قانون کی صورت میں بیان کرتا ہے:

بے شک اللہ نہیں بدلتا جو کسی قوم میں ہے، یہاں تک کہ وہ اسے بدلیں جوان

کے دلوں میں ہے (سورۃ الرعد: آیت 11)

یعنی اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدل لے۔ یہ آیت تاریخ کی ہر قوم پر صادق آتی ہے، خواہ وہ عاد و ثمود ہوں یا روم و فارس، یا پھر امتِ مسلمہ کے عروج و زوال کے ادوار۔

جب ہم اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ایک روشن حقیقت نظر آتی ہے کہ مسلمانوں کا ابتدائی عروج عدل، علم، تقویٰ اور جواب دہی پر قائم تھا۔ خلافتِ راشدہ میں حکمران اپنے آپ کو عوام کا خادم سمجھتے تھے۔ حضرت عمر بن خطابؓ کا وہ مشہور قول کہ **"اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر گیا تو عمر اس کا جواب دہ ہوگا"** محض ایک جملہ نہیں بلکہ ایک پورا ریاستی فلسفہ ہے۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، اقتدار خدمت کے بجائے وراثت بننے لگا، اور جواب دہی کی جگہ جواز تراشی نے لے لی۔

یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں زوال خاموشی سے جنم لیتا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بنو امیہ اور بنو عباس کے ادوار میں اگرچہ علمی ترقی، تمدنی وسعت اور عسکری طاقت موجود تھی، مگر آہستہ آہستہ عدل کمزور اور طاقت کا غلط استعمال بڑھنے لگا۔ قرآن مجید نے فرعون کے طرزِ حکومت کو اسی لیے نمونہ عبرت بنایا:

بے شک فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے رہنے والوں کو کئی گروہ بنا دیا (سورۃ القصص: آیت 4)

جب اقتدار تکبر میں بدل جائے اور قوم کو گروہوں میں تقسیم کر دے تو انجام لازماً تباہی ہوتا ہے۔

زوال کا ایک اور بڑا سبب علم سے دوری ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے علم کو امت کی بقا سے جوڑا اور فرمایا: ''جس کے ساتھ اللہ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے، اسے دین کی سمجھ عطا کر دیتا ہے'' (بخاری حدیث: 71)۔

جب قومیں علم کو محض رسمی یا دنیاوی فائدے تک محدود کر لیں اور فکر، تدبر اور اخلاقی بصیرت کو ترک کر دیں تو وہ زندہ ہوتے ہوئے بھی فکری طور پر مردہ ہو جاتی ہیں۔ اندلس کی تاریخ اس کی واضح مثال ہے، جہاں علم و تہذیب کا عظیم مرکز داخلی اختلافات، اخلاقی کمزوری اور فکری زوال کے باعث چند دہائیوں میں مٹ گیا۔

امتِ مسلمہ کے زوال میں ایک اور خطرناک عنصر قرآن سے جذباتی تعلق اور عملی دوری ہے۔ ہم تلاوت تو کرتے رہے، مگر ہدایت کو اجتماعی نظام میں نافذ نہ کر سکے۔ قرآن ہمیں بار بار عدل، امانت اور دیانت کی تلقین کرتا ہے:

بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کرو (صورۃ النساء: آیت 58)

جب امانت نااہل ہاتھوں میں چلی جائے، جیسا کہ نبی ﷺ نے قیامت کی نشانیوں میں فرمایا، تو دراصل وہ معاشرہ زوال کی آخری دہلیز پر کھڑا ہوتا ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ زوال ہمیشہ اچانک نہیں آتا۔ یہ ایک تدریجی عمل ہوتا ہے۔ پہلے اقدار کمزور ہوتی ہیں، پھر ادارے، پھر ریاستیں۔ قومیں اپنے ماضی پر فخر تو کرتی ہیں مگر حال کی اصلاح نہیں کرتیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی نفسیات کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا: ''تم ضرور ان لوگوں کے طریقوں پر بالشت بر بالشت اور ہاتھ بر ہاتھ چلتے جاؤ گے جو تم سے پہلے تھے (بعینہ ان کے طریقے اختیار کرو گے، ان سے ذرہ برابر آگے پیچھے نہ ہو گے) حتیٰ کہ اگر وہ سانڈے کے بل میں گھسے تو تم بھی ان کے پیچھے گھسو گے۔'' ہم نے عرض کی: اللہ کے رسول! کیا یہود اور نصاریٰ (کے پیچھے چلیں گے؟) آپ نے فرمایا

’’تو (اور) کن کے؟‘‘ (صحیح مسلم حدیث: 6781)

یعنی اگر اسباب وہی ہوں تو انجام بھی مختلف نہیں ہوسکتا۔

یہاں ہم نے یہ سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ زوال کسی بیرونی دشمن کی سازش سے پہلے اندرونی کمزوریوں سے جنم لیتا ہے۔ جب ایمان محض دعویٰ بن جائے، عدل نعرہ اور علم رسمی، تو تاریخ کا پہیہ الٹا گھومنے لگتا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس پر غور کیے بغیر نہ حال سنورتا ہے اور نہ مستقبل۔

زوال سے نکلنے کے قرآنی و تاریخی اصول

(احیا، اصلاح اور فکری واپسی کا راستہ)

قرآنِ مجید تاریخ کو محض قصے کہانی کے طور پر بیان نہیں کرتا بلکہ اسے قانونِ حیات کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ہر عروج و زوال کے پیچھے واضح اسباب ہوتے ہیں، اور انہی اسباب کی روشنی میں اصلاح کا راستہ بھی متعین کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلا اور بنیادی اصول اندرونی اصلاح ہے۔ قرآن کا اعلان ہے:

بے شک اللہ نہیں بدلتا جو کسی قوم میں ہے، یہاں تک کہ وہ اسے بدلیں جو ان کے دلوں میں ہے (سورۃ الرعد: آیت 11)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ تبدیلی کا آغاز باہر سے نہیں، دل، نیت اور فکر سے ہوتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی امت نے اپنے باطن کی اصلاح کی، اللہ نے حالات بدل دیے۔

زوال سے نکلنے کا دوسرا عظیم اصول قرآن کی طرف عملی رجوع ہے۔ قرآن کو محض تلاوت یا برکت تک محدود کرنا احیا نہیں، بلکہ اسے فرد، معاشرہ اور ریاست کے فیصلوں کا

مرکز بنانا احیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں کوئی نیا فلسفہ ایجاد نہیں کیا، بلکہ وحی کو زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کیا۔ اسی لیے چند برسوں میں ایک منتشر قوم، امتِ وسط بن گئی۔

قرآن خود کہتا ہے:

آپ ان کے معاملات میں خدا کی نازل کردہ وحی کے مطابق ہی حکم کیا کیجیے (سورۃ المائدہ: آیت 49)

تیسرا اصول عدل کا قیام ہے۔ کوئی قوم ظلم کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتی، چاہے وہ ظالم مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ حضرت علیؓ کا قول تاریخ کا خلاصہ ہے:

"ریاست کفر کے ساتھ تو قائم رہ سکتی ہے، مگر ظلم کے ساتھ نہیں۔"

قرآن نے عدل کو ایمان کا تقاضا قرار دیا:

اے ایمان والو! تم اللہ کی خاطر حق پر قائم ہو جاؤ، راستی اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ (سورۃ المائدہ: آیت 8)

جب عدل بحال ہوتا ہے تو اعتماد بحال ہوتا ہے، اور یہی اجتماعی قوت بن جاتا ہے۔

چوتھا اصول علم اور تربیت کی اصلاح ہے۔ زوال کا آغاز ہمیشہ علم کے بگاڑ سے ہوتا ہے، اور احیا کا آغاز بھی وہیں سے ہوتا ہے۔ تاریخ میں امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ جیسے ائمہ کا کردار محض فقہی نہیں بلکہ فکری احیا کا تھا۔ انہوں نے علم کو اخلاق، تقویٰ اور جواب دہی سے جوڑا

پانچواں اصول قیادت کی اصلاح ہے۔ قومیں ویسی ہی قیادت پاتی ہیں جیسی وہ خود ہوتی ہیں۔ جب قومیں کردار کو معیار بنائیں تو اللہ صالح قیادت عطا کرتا ہے۔ خلافتِ

راشدہ کی قیادت اس کی روشن مثال ہے، جہاں حکمران احتساب سے نہیں ڈرتے تھے۔ قرآن ہمیں خبردار کرتا ہے:

اور اسی طرح ہم ظالموں کو ان کے اعمال کے سبب جو وہ کرتے تھے ایک دوسرے پر مسلط کر دیتے ہیں۔(سورۃ الانعام: آیت 129)

یعنی اگر قوم خود ظلم قبول کر لے تو ظالم حکمران مسلط ہو جاتے ہیں۔

چھٹا اصول اتحادِ امت اور مقصد کی وحدت ہے۔زوال کے ادوار میں سب سے پہلے دل بٹتے ہیں، پھر صفیں۔قرآن نے واضح کہا:

اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر چلو اور آپس میں جھگڑا نہ کرنا کہ (ایسا کرو گے تو) تم بزدل ہو جاؤ گے(سورۃ الانفال: آیت 46)

اندلس کی تباہی ہو یا بغداد کا سقوط، ہر جگہ اندرونی انتشار دشمن سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔احیا تب آتا ہے جب اختلاف کے باوجود مشترکہ مقصد پر اتفاق ہو۔

ساتواں اور نہایت اہم اصول امید اور رجاء ہے۔قرآن مایوسی کو کفر کے قریب قرار دیتا ہے:

اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ(سورۃ الزمر: آیت 53)

تاریخ بتاتی ہے کہ تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی کے بعد بھی امت ختم نہیں ہوئی، بلکہ علم، دعوت اور فکر کے نئے مراکز وجود میں آئے۔یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ کی مدد اس قوم کے ساتھ ہوتی ہے جو مایوسی کے بجائے توبہ اور عمل کو اپناتی ہے۔

زوال سے نکلنے کا راستہ کوئی جادو نہیں، بلکہ ایک مسلسل، صبر آزما اور شعوری جدوجہد ہے۔قرآن ہمیں نتیجے کی نہیں، کوشش کی ذمہ داری دیتا ہے:

اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم انہیں اپنی راہیں ضرور دکھادیں گے۔(سورۃ العنکبوت: آیت 69)

آخر میں، اگر اس پورے باب کو ایک جملے میں سمیٹا جائے تو وہ یہ ہے:

قومیں جب اللہ کی طرف لوٹتی ہیں، اللہ تاریخ کو ان کی طرف موڑ دیتا ہے۔

اللہ ہمیں زوال کے تجزیے پر نہیں، احیا کے عمل پر لگا دے۔

آمین

(عملی احیا: فرد، خاندان اور ریاست کی سطح پر اصلاح)

زوال کا تجزیہ اگر عمل میں نہ ڈھلے تو وہ محض علمی مشق بن کر رہ جاتا ہے۔ قرآن کا اسلوب یہی ہے کہ وہ فکر کے ساتھ ساتھ عمل کی دعوت دیتا ہے۔ اسی لیے جب وہ قوموں کے عروج وزوال کا ذکر کرتا ہے تو ساتھ ہی یہ بھی بتاتا ہے کہ واپسی کا راستہ کہاں سے شروع ہوگا۔ یہ راستہ کسی ایک انقلاب، ایک جلسے یا ایک نعرے سے نہیں بلکہ فرد کے اندر سے شروع ہوتا ہے، پھر خاندان میں پھیلتا ہے اور بالآخر ریاستی ڈھانچے تک پہنچتا ہے۔

سب سے پہلے فرد کی اصلاح کو لیجیے۔ قرآن کی نگاہ میں فرد محض ہجوم کا ایک عدد نہیں بلکہ پورے معاشرے کی بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

کہ جس نے (اپنے) نفس (یعنی روح) کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا۔ (سورۃ الشّمس: آیت 9)

یعنی فلاح اسے ملی جس نے اپنے نفس کو پاک کیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہر بڑی تبدیلی کا آغاز چند بیدار دل افراد سے ہوا۔ نبی کریم ﷺ نے مکہ کے جاہلی معاشرے کو بدلنے کے لیے پہلے دلوں کی تربیت کی، کردار سنوارے، سچ، امانت اور صبر کو راسخ کیا۔ یہی

وجہ تھی کہ جب یہ افراد اقتدار تک پہنچے تو نظام خود بخود بدل گیا۔ فرد کی سطح پر احیا کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے علم، عبادت، اخلاق اور ذمہ داری کے شعور کو از سرِ نو زندہ کرے۔

فرد کے بعد خاندان آتا ہے، جو کسی بھی تہذیب کی نرسری ہوتا ہے۔ اگر خاندان کمزور ہو جائے تو ریاست مضبوط نہیں رہ سکتی۔ قرآن خاندان کو محض سماجی اکائی نہیں بلکہ دینی ذمہ داری قرار دیتا ہے:

مومنو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل عیال کو آتش (جہنم) سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں (سورۃ التحریم: آیت 6)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ احیا کی ذمہ داری گھر کی دہلیز سے شروع ہوتی ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب مسلمانوں کے گھروں میں علم، حیا، عدل اور خوفِ خدا زندہ تھے تو بیرونی یلغاریں بھی ان کی تہذیب کو مٹا نہ سکیں۔ لیکن جب گھروں میں تربیت کی جگہ صرف سہولت اور خواہش نے لے لی تو زوال نے جڑ پکڑ لی۔

احیا کا تیسرا اور سب سے مشکل مرحلہ ریاست اور اجتماعی نظام کی اصلاح ہے۔ یہاں محض نیک نیتی کافی نہیں ہوتی بلکہ واضح اصول، عدل پر مبنی قانون اور جواب دہ قیادت درکار ہوتی ہے۔ قرآن ریاستی نظام کی بنیاد عدل پر رکھتا ہے:

بلا شبہ یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو کو نازل کیا، تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں (سورۃ الحدید: آیت 25)

یعنی انبیاء کی بعثت کا مقصد ہی یہ تھا کہ معاشرہ عدل پر قائم ہو۔ خلافتِ راشدہ اس کی زندہ مثال ہے، جہاں قانون حکمران اور عام شہری دونوں کے لیے یکساں تھا۔

عملی احیا کا ایک اہم پہلو تعلیم اور ابلاغ بھی ہے۔ جب تک علم کو ایمان، اخلاق

اور مقصد سے نہ جوڑا جائے، وہ معاشرے کو بدلنے کے بجائے بگاڑ دیتا ہے۔ تاریخ میں امام غزالیؒ کی احیاء العلوم ہو یا شاہ ولی اللہؒ کی فکری جدوجہد، ہر جگہ علم کو روحانیت اور عمل کے ساتھ جوڑنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے'' (بخاری حدیث: 5028)

یہ تعلیم کا وہ ماڈل ہے جو فرد بھی سنوارتا ہے اور معاشرہ بھی۔

احیا کا راستہ کبھی ہموار نہیں ہوتا۔ اس میں مخالفت، آزمائش اور صبر آتا ہے۔ قرآن ہمیں یاد دلاتا ہے کہ تبدیلی وقت مانگتی ہے:

اور صبر کر کہ بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ (سورۃ ہود: آیت 115)

تاریخ میں ہر مصلح نے یہی راستہ اختیار کیا— خواہ وہ انبیاء ہوں یا بعد کے مجددین۔

خلاصہ یہ ہے کہ احیا کوئی خواب نہیں بلکہ ایک قابلِ عمل منصوبہ ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ ہم الزام دوسروں پر ڈالنے کے بجائے آغاز خود سے کریں، اپنے گھروں سے کریں، اور پھر اجتماعی سطح پر اصولوں کی طرف لوٹ آئیں۔

زوال شکایت سے نہیں جاتا، احیا قربانی مانگتا ہے۔

(عصرِ حاضر میں احیا کے امکانات اور چیلنجز)

ہر دور اپنے ساتھ آزمائشیں بھی لاتا ہے اور امکانات بھی۔ تاریخ کا المیہ یہ نہیں کہ زمانے بدلتے ہیں، بلکہ اصل المیہ یہ ہوتا ہے کہ قومیں بدلتے زمانے کو سمجھنے کے بجائے اس

سے بھاگنے لگتی ہیں۔عصرِ حاضر میں احیا کا سوال اسی نکتے سے جڑا ہے: کیا ہم اس دور کو صرف فتنہ سمجھ کر رد کر دیں، یا اسے ایک امتحان سمجھ کر اس کے اندر راستہ تلاش کریں؟ قرآن کا اسلوب دوسرا ہے—وہ ہر دور میں ہدایت کے دروازے کھلے رکھتا ہے۔

عصرِ حاضر کا سب سے بڑا امکان یہ ہے کہ علم، رسائی اور رابطہ پہلے سے کہیں زیادہ آسان ہو چکا ہے۔ وہ بات جو ماضی میں برسوں میں ایک شہر سے دوسرے شہر پہنچتی تھی، آج لمحوں میں پوری دنیا تک پہنچ جاتی ہے۔ اگر باطل اس سہولت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے تو حق کیوں نہیں؟ نبی کریم ﷺ کا یہ اصول آج بھی زندہ ہے: ''میرا پیغام لوگوں کو پہنچاؤ! اگرچہ ایک ہی آیت ہو۔'' (صحیح البخاری حدیث: 3461)

ڈیجیٹل دنیا، سوشل میڈیا، آن لائن تعلیم—یہ سب اگر نیت اور حکمت کے ساتھ استعمال ہوں تو دعوت، تعلیم اور اصلاح کے غیر معمولی ذرائع بن سکتے ہیں۔

عصرِ حاضر کا ایک اور بڑا امکان شعور کی بیداری ہے۔ آج کا انسان سوال کرتا ہے، تقلید پر مطمئن نہیں ہوتا۔ اگرچہ یہ رویہ بعض اوقات بغاوت کی صورت اختیار کر لیتا ہے، مگر یہی سوال اگر صحیح رہنمائی پائے تو گہرا ایمان بن جاتا ہے۔ قرآن بار بار غور و فکر کی دعوت دیتا ہے:

﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ﴾

یہ دور اگرچہ شکوک پیدا کرتا ہے، مگر اسی کے اندر یقین کی تلاش بھی چھپی ہے—بشرطیکہ ہم جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔

لیکن امکانات کے ساتھ ساتھ چیلنجز بھی غیر معمولی ہیں۔ عصرِ حاضر کا سب سے بڑا چیلنج فکری انتشار ہے۔ معلومات کی زیادتی نے حکمت کو کمزور کر دیا ہے۔ ہر شخص بول رہا ہے، مگر سننے والا کم ہے؛ ہر رائے دستیاب ہے، مگر معیار ناپید۔ اس شور میں حق کی آواز دب

جاتی ہے۔قرآن ہمیں اس کیفیت سے خبردار کرتا ہے:

اور اگر تو ان لوگوں میں سے اکثر کا کہنا مانے جو زمین میں ہیں تو وہ تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے(سورۃ الانعام: آیت116)

اکثریت ہمیشہ حق کی ضامن نہیں ہوتی—یہ اصول آج پہلے سے زیادہ واضح ہے۔

ایک بڑا چیلنج دین کی نجکاری (Privatization of Religion) ہے۔ عصرِ حاضر نے دین کو اجتماعی نظام کے بجائے ذاتی تسلی تک محدود کر دیا ہے۔ **"میرا ایمان، میری مرضی"** کا نعرہ بظاہر آزادی لگتا ہے، مگر درحقیقت یہ دین کو سماج سے کاٹ دیتا ہے۔ حالانکہ قرآن دین کو زندگی کے ہر شعبے سے جوڑتا ہے:

کہہ دے بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے، جو جہانوں کا رب ہے۔(سورۃ الانعام: آیت162)

جب دین حیات و ممات سے نکل جائے تو وہ رسم تو رہتا ہے، قوت نہیں۔

عصرِ حاضر کا ایک اور شدید چیلنج اخلاقی ابہام ہے۔ سچ اور جھوٹ، حق اور مفاد، حیا اور آزادی—سب کے مفاہیم دھندلا دیے گئے ہیں۔ میڈیا اور تفریح نے گناہ کو معمول اور نیکی کو دقیانوسی بنا دیا ہے۔ ایسے ماحول میں احیا کا کام محض وعظ سے نہیں ہو سکتا، بلکہ متبادل اخلاقی بیانیہ دینا ہوگا—ایسا بیانیہ جو سخت بھی نہ ہو اور کمزور بھی نہیں، بلکہ متوازن، باوقار اور قابلِ عمل ہو۔

ان چیلنجز کے باوجود امید کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اللہ کے قوانین نہیں بدلتے۔ جس طرح ماضی میں قلیل افراد کے ذریعے بڑے انقلابات آئے، ویسے ہی آج

بھی آسکتے ہیں۔قرآن ہمیں یقین دلاتا ہے:

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے قدم جما دے گا۔(سورۃ محمد: آیت 7)

مدد کی شرط زمانہ نہیں، نیت اور عمل ہے۔

عصرِ حاضر میں احیا کا راستہ شاید مشکل ہو، مگر ناممکن نہیں۔ یہ راستہ شور کے مقابلے میں حکمت، نفرت کے مقابلے میں اخلاق، اور مایوسی کے مقابلے میں امید مانگتا ہے۔ یہ فوری نتائج نہیں، بلکہ مضبوط بنیادیں چاہتا ہے۔اور تاریخ گواہ ہے کہ جو قومیں بنیادیں درست کر لیں، ان کا مستقبل خود بخود سنور جاتا ہے۔

آخر میں، بات کو ایک فکر میں سمیٹا جائے تو وہ یہ ہے:

ہر دور میں زوال کے اسباب بدلتے ہیں، مگر احیا کا راستہ ہمیشہ اللہ، عدل، علم اور کردار سے ہو کر گزرتا ہے۔

باب 21

نوجوان، شناخت کا بحران اور مستقبل کی قیادت

(نوجوان: امت کا سرمایہ یا گم ہوتا ہوا امکان؟)

ہر قوم کا مستقبل اس کے نوجوانوں میں پوشیدہ ہوتا ہے، مگر المیہ یہ ہے کہ آج کا نوجوان خود اپنے مستقبل کے بارے میں غیر یقینی، الجھن اور اضطراب کا شکار ہے۔ وہ جسمانی طور پر بالغ ہے، ذہنی طور پر تیز، مگر فکری طور پر منتشر۔ اس کے سامنے دنیا کھلی ہے، مگر سمت واضح نہیں؛ مواقع بہت ہیں، مگر مقصد دھندلا ہے۔ یہی کیفیت دراصل شناخت کے بحران کی پہلی علامت ہے۔

قرآنِ مجید نے نوجوانی کو محض عمر کا مرحلہ نہیں، بلکہ ایک امانت قرار دیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت یوسفؑ، اصحابِ کہف — یہ سب نوجوان تھے جب انہوں نے تاریخ کا رخ بدلا۔ قرآن اصحابِ کہف کے بارے میں کہتا ہے:

بے شک وہ چند جوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے انھیں ہدایت میں زیادہ کر دیا۔ (سورۃ الکھف: آیت 13)

یہ نوجوان ہی وہ طبقہ ہے جو ایمان کے ساتھ کھڑا ہو جائے تو اللہ خود اسے ہدایت میں بڑھا دیتا ہے۔

آج کا نوجوان ایک عجیب تضاد میں جی رہا ہے۔ ایک طرف اسے بتایا جاتا ہے کہ تم آزاد ہو، خود فیصلہ کرو، خود کو منواؤ؛ اور دوسری طرف اس پر ایسے معیارات مسلط ہیں جو اس کی اپنی تہذیب، دین اور اقدار سے میل نہیں کھاتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ پوری طرح مغرب جیسا بن پاتا ہے، نہ پورے یقین کے ساتھ اپنی شناخت قبول کر پاتا ہے۔ یہی

درمیانی لٹکاؤ اسے اندر سے توڑ دیتا ہے۔

قرآن اس کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے:

وہ درمیان میں ہی معلق ڈگمگا رہے ہیں، نہ پورے ان کی طرف نہ صحیح طور پر ان کی طرف اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہی میں ڈال دے تو تو اس کے لئے کوئی راہ نہ پائے گا۔ (سورۃ النساء: آیت 143)

یعنی نہ اِدھر کے رہے، نہ اُدھر کے — یہی سب سے خطرناک ذہنی حالت ہے۔

شناخت کا بحران اس وقت شدت اختیار کرتا ہے جب نوجوان کو یہ سکھایا جائے کہ دین اس کی ذاتی کمزوری ہے، روایت پسماندگی ہے، اور سوال بغاوت۔ وہ سوال کرتا ہے، مگر رہنمائی نہیں پاتا؛ وہ بغاوت کرتا ہے، مگر مقصد کے بغیر۔ نتیجتاً یا تو وہ شدت پسندی کی طرف جاتا ہے، یا مکمل لاتعلقی کی طرف — دونوں صورتیں قیادت نہیں، انتشار پیدا کرتی ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے نوجوانوں کو کبھی دبایا نہیں، بلکہ ان کی رہنمائی کی۔ ایک نوجوان گناہ کی اجازت مانگتا ہے، تو آپ ﷺ اسے جھڑکتے نہیں، بلکہ اس کے دل کو مخاطب کرتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نوجوان دلیل سے جیتے جاتے ہیں، ڈانٹ سے نہیں۔

جدید دنیا نے نوجوان کو ایک اور الجھن میں مبتلا کر دیا ہے: کامیابی کی غلط تعریف۔ اسے سکھایا گیا ہے کہ کامیابی پیسہ، شہرت اور طاقت کا نام ہے۔ کردار، خدمت اور قربانی کو غیر عملی خواب بنا دیا گیا ہے۔ اس ماحول میں جو نوجوان قیادت کا خواب دیکھتا بھی ہے، وہ اکثر خودغرض لیڈر بننے کا خواہش مند ہوتا ہے، نہ کہ ذمہ دار رہنما۔

قرآن کامیابی کا معیار بدلتا ہے:

بے شک تم میں سب سے عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے (سورۃ الحجرات: آیت 13)

یہ معیار اگر نوجوان کے دل میں بیٹھ جائے تو قیادت خدمت بن جاتی ہے، حکمرانی نہیں۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہر دور میں قیادت نوجوانوں کے کندھوں پر آئی ہے۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ کی قیادت، حضرت علیؓ کی جوانی میں جرات، اور محمد بن قاسمؒ کا عزم — یہ سب اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام نوجوان کو پیچھے نہیں، آگے کھڑا کرتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ نوجوان کو شناخت، اعتماد اور تربیت دی جائے۔

آج کا مسئلہ یہ نہیں کہ نوجوان نااہل ہے، بلکہ یہ ہے کہ اسے صحیح سوال پوچھنے اور صحیح جواب پانے کا موقع نہیں دیا جا رہا۔ ہم اس سے اطاعت چاہتے ہیں، مگر مکالمہ نہیں؛ ہم اس سے قربانی چاہتے ہیں، مگر رہنمائی نہیں۔ ایسے میں قیادت کیسے پیدا ہو؟

مرکزی خلاصہ یہ ہے کہ نوجوان مسئلہ نہیں، امکان ہے — مگر یہ امکان تب حقیقت بنے گا جب اس کی شناخت واضح ہو، اس کے سوال سنے جائیں، اور اسے یہ یقین دلایا جائے کہ دین اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بلکہ اس کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

نوجوان اگر اپنی پہچان پا لے، تو وہ صرف اپنا مستقبل نہیں، قوم کی تقدیر بدل دیتا ہے۔

(شناخت کا بحران: دین، ثقافت اور جدیدیت کے درمیان کشمکش)

شناخت انسان کی وہ بنیاد ہے جس پر اس کی سوچ، فیصلے اور سمت قائم ہوتی ہے۔

جب شناخت واضح ہو تو انسان مشکلات میں بھی متوازن رہتا ہے، اور جب شناخت بکھر جائے تو سہولتیں بھی اسے سنبھال نہیں سکتیں۔ آج کا نوجوان اسی بکھری ہوئی شناخت کا شکار ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں مسلمان بھی ہے، جدید بھی بننا چاہتا ہے، اور اپنے معاشرتی دباؤ سے بھی آزاد ہونا چاہتا ہے— مگر ان تینوں کے درمیان توازن سکھانے والا کوئی مضبوط نظام اس کے پاس موجود نہیں۔

قرآنِ مجید انسان کو سب سے پہلے اس کی پہچان بتاتا ہے:

اسی نے تمھارا نام مسلمین رکھا (سورۃ الحج: آیت 78)

یعنی تمہاری اصل شناخت اللہ نے خود متعین کر دی ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ آج نوجوان کو یہ شناخت بطور فخر نہیں، بطور سوال دی جا رہی ہے— جیسے مسلمان ہونا کوئی وضاحت مانگنے والی بات ہو۔

شناخت کا بحران اس وقت جنم لیتا ہے جب نوجوان کے سامنے تین مختلف بیانیے رکھ دیے جائیں۔ پہلا بیانیہ دین کا ہے، جو اکثر اس کے سامنے یا تو سخت، غیر لچک دار، یا محض ماضی کی یادگار بن کر آتا ہے۔ دوسرا بیانیہ ثقافت کا ہے، جو بعض اوقات دین کے نام پر رسم و رواج کو مسلط کر دیتا ہے۔ اور تیسرا بیانیہ جدیدیت کا ہے، جو آزادی، ترقی اور کامیابی کو دین اور روایت سے متصادم دکھاتا ہے۔ نوجوان ان تینوں میں سے کسی ایک کو مکمل قبول نہیں کر پاتا، اور یوں داخلی تصادم کا شکار ہو جاتا ہے۔

قرآن اس کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے:

تو کیا وہ اللہ کے دین کے علاوہ کچھ اور تلاش کرتے ہیں (سورۃ آل عمران: آیت 83)

یہ سوال آج کے نوجوان کے دل میں خاموشی سے گردش کر رہا ہے۔

دین اور ثقافت کے درمیان فرق نہ سمجھا یا جانا بھی شناخت کے بحران کو گہرا کر دیتا ہے۔ نوجوان بہت سی ایسی چیزوں کو "دین" سمجھ کر رد کر دیتا ہے جو دراصل ثقافتی یا سماجی تھیں۔ نتیجتاً وہ دین سے نہیں، بلکہ دین کے نام پر مسلط کی گئی سختیوں سے بھاگ رہا ہوتا ہے۔ لیکن جب اسے متبادل میں خالص جدیدیت ملتی ہے تو وہاں اسے روحانیت، مقصد اور اخلاق کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے دین کو ثقافت کا قیدی نہیں بنایا۔ آپ ﷺ نے عرب معاشرے کی بہت سی روایات کو بدلا، کچھ کو برقرار رکھا، اور کچھ کو اصلاح کے ساتھ قبول کیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام جامد نہیں، بلکہ اصولی دین ہے—جو ہر دور میں رہنمائی دے سکتا ہے۔

جدیدیت نے نوجوان کو سوال کرنے کی جرات تو دی ہے، مگر جواب دینے کا نظام فراہم نہیں کیا۔ اسے سکھایا گیا ہے کہ ہر روایت پر شک کرو، مگر یہ نہیں بتایا گیا کہ شک کے بعد یقین تک کیسے پہنچا جائے۔ نتیجتاً نوجوان یا تو مستقل شک میں رہتا ہے، یا کسی ایک انتہا کو پکڑ لیتا ہے۔ قرآن ہمیں شک کے بجائے یقین کی دعوت دیتا ہے:

اس کتاب (کے اللہ کی کتاب ہونے) میں کوئی شک نہیں (سورۃ البقرہ: آیت 2)

شناخت کا بحران صرف فکری نہیں بلکہ نفسیاتی بھی ہے۔ نوجوان جب اپنے آپ کو کہیں مکمل قبول شدہ نہیں پاتا تو اس میں احساسِ کمتری، غصہ یا بے حسی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت بعض اوقات خود نفرتی، بغاوت یا غیر ذمہ دار طرزِ زندگی کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ ہم اسے اخلاقی مسئلہ سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ یہ دراصل شناختی مسئلہ ہوتا ہے۔

قرآنِ مجید انسان کو اندرونی سکون کی طرف بلاتا ہے:

سن لو! اللہ کی یاد ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں۔ (سورۃ الرعد: آیت 28)

جب دل مطمئن نہ ہو تو باہر کی کوئی کامیابی بھی کافی نہیں ہوتی۔

اس کشمکش سے نکلنے کا راستہ یہ نہیں کہ نوجوان کو جدید دنیا سے کاٹ دیا جائے، اور نہ یہ کہ دین کو اس کی زندگی سے الگ کر دیا جائے۔ اصل حل یہ ہے کہ نوجوان کو یہ دکھایا جائے کہ اسلام اس کی شناخت کو مکمل کرتا ہے، محدود نہیں۔ اسلام اسے سوچنے سے نہیں روکتا، بلکہ سمت دیتا ہے؛ آگے بڑھنے سے نہیں روکتا، بلکہ مقصد دیتا ہے؛ اور قیادت سے نہیں روکتا، بلکہ اس کے لیے اخلاقی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب مسلمان نوجوانوں کو یہ توازن ملا تو وہ دنیا کے معمار بنے۔ بغداد، قرطبہ اور سمرقند کی جامعات میں یہی نوجوان جدید علوم بھی سیکھتے تھے اور دین سے جڑے بھی رہتے تھے—ان کے لیے یہ کشمکش نہیں تھی، ہم آہنگی تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ شناخت کا بحران دراصل دین اور جدیدیت کی لڑائی نہیں، بلکہ غلط پیشکش اور کمزور تربیت کا نتیجہ ہے۔ جب نوجوان کو اس کی اصل پہچان اعتماد کے ساتھ سمجھا دی جائے، تو وہ نہ ماضی سے ڈرتا ہے، نہ مستقبل سے۔

نوجوان کو اگر یہ بتا دیا جائیکہ وہ کون ہے، تو اسے یہ نہیں سکھانا پڑتا کہ اسے کیا بننا ہے۔

(نوجوان کی فکری و اخلاقی تربیت: قیادت کی تیاری کیسے ہو؟)

قیادت کسی دن اچانک پیدا نہیں ہو جاتی، بلکہ یہ ایک طویل تربیتی عمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جو قومیں یہ سمجھ لیں کہ لیڈر پیدا ہوتے ہیں، وہ اکثر اچھے نعرہ باز تو پیدا کر لیتی ہیں، مگر

اچھے رہنما نہیں۔ اسلام کا تصورِ قیادت طاقت یا مقبولیت پر نہیں بلکہ کردار، بصیرت اور ذمہ داری پر قائم ہے، اور یہی چیز نوجوان کی تربیت کا اصل ہدف ہونی چاہیے۔

قرآنِ مجید قیادت کو امانت قرار دیتا ہے، نہ کہ اعزاز:

بے شک ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اٹھا لیا (سورۃ الاحزاب: آیت 72)

جب نوجوان کو یہ شعور دیا جائے کہ قیادت بوجھ ہے، حق نہیں، تو اس کی سوچ کی بنیاد ہی بدل جاتی ہے۔

فکری تربیت کا پہلا مرحلہ سوچ کی درست سمت ہے۔ نوجوان کو یہ سکھانا ضروری ہے کہ ہر سوال بغاوت نہیں ہوتا، اور ہر روایت زنجیر نہیں ہوتی۔ اسے دلیل کے ساتھ سوچنے، اختلاف کے ساتھ جینے، اور سچ کے سامنے جھکنے کی تربیت دی جائے۔ نبی کریم ﷺ نے صحابہ ؓ کو اندھی تقلید نہیں سکھائی، بلکہ شعور دیا۔ اسی لیے وہ مشکل ترین حالات میں بھی درست فیصلے کر سکے۔

قرآن بار بار سوال اٹھاتا ہے:

﴿أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ — ﴿أَفَلَا يَتَفَكَّرُونَ﴾

یہ آیات اس بات کا اعلان ہیں کہ اسلام قیادت کے لیے سوچنے والا ذہن چاہتا ہے، نہ کہ صرف جذباتی پیروکار۔

اخلاقی تربیت قیادت کی روح ہے۔ علم اگر اخلاق سے خالی ہو تو وہ تباہ کن بن جاتا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب طاقت اخلاق کے بغیر آئی تو وہ ظلم میں بدل گئی۔ نبی

کریم ﷺ نے قیادت کا معیار واضح کر دیا: ''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل کے لیے بہترین ہے اور میں اپنے اہل کے حق میں سب سے بہتر ہوں۔'' (سلسلہ احادیث صحیحہ حدیث: 1507)

جو نوجوان گھر میں عدل، صبر اور ذمہ داری نہیں سیکھتا، وہ اقتدار میں بھی یہی صفات نہیں دکھا سکتا۔

نوجوان کی تربیت میں کردار سازی کو مرکزی حیثیت دینا ہوگی۔ سچ بولنا، وعدہ نبھانا، اختلاف میں ادب، اور طاقت میں انکسار — یہ سب سکھائے بغیر ہم قیادت کے خواب تو دیکھ سکتے ہیں، حقیقت نہیں۔ حضرت یوسفؑ کو قرآن نے قیادت دی تو اس وقت، جب وہ اخلاق، امانت اور ضبط کا امتحان پاس کر چکے تھے:

بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لاؤ کہ میں اسے اپنے خاص کاموں کے لئے مقرر کرلوں، پھر جب اس سے بات چیت کی تو کہنے لگا کہ آپ ہمارے ہاں آج سے ذی عزت اور امانت دار ہیں۔ (سورۃ یوسف: آیت 54)

قیادت کی تیاری کا ایک اہم پہلو ذمہ داری دینا بھی ہے۔ نوجوان کو صرف نصیحتیں نہیں، مواقع بھی چاہئیں۔ نبی کریم ﷺ نے نوجوان صحابہؓ کو عملی میدان میں اتارا — حضرت اسامہؓ کو لشکر کی قیادت، معاذؓ کو یمن کی ذمہ داری، اور علیؓ کو فیصلوں کی امانت دی۔ یہ اعتماد ہی قیادت کو جنم دیتا ہے۔

آج ہم نوجوان سے کامل بننے کی توقع رکھتے ہیں، مگر اسے سیکھنے کا حق نہیں دیتے۔ ہم غلطی پر سزا دیتے ہیں، اصلاح نہیں۔ حالانکہ قیادت کی تربیت غلطیوں سے سیکھنے کا نام ہے، نہ کہ غلطی سے خوف کا۔ رسول اللہ ﷺ نے تربیت میں صبر کو بنیاد بنایا، اسی لیے ایک غیر تربیت یافتہ معاشرہ چند برسوں میں بہترین قیادت میں بدل گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ نوجوان کی قیادت تقریروں سے نہیں، تربیت سے بنتی ہے۔ جب اسے صحیح فکر، مضبوط اخلاق، عملی ذمہ داری اور اعتماد ملتا ہے، تو وہ خود بخود رہنما بن جاتا ہے — چاہے اس کے پاس اسٹیج ہو یا نہ ہو۔

نوجوان اگر ذمہ داری سیکھ لے، تو اسے اقتدار سکھانے کی ضرورت نہیں رہتی۔

(نوجوان، میڈیا اور قیادت کا نیا تصور)

آج کا نوجوان کسی ایک استاد، ایک کتاب یا ایک ادارے سے تربیت نہیں پاتا، بلکہ اس کی سب سے بڑی درسگاہ میڈیا ہے۔ اسکرین — چاہے وہ موبائل کی ہو یا لیپ ٹاپ کی — اس کے لیے استاد بھی ہے، دوست بھی، رول ماڈل بھی، اور نقاد بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر نوجوان کی قیادت کو سمجھنا ہو تو پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ میڈیا اس کے ذہن میں قیادت کا کون سا تصور بٹھا رہا ہے۔

قرآنِ مجید انسان کو اثر قبول کرنے والی مخلوق قرار دیتا ہے اور اسی لیے ماحول کی اہمیت پر زور دیتا ہے:

جو زمین پاکیزہ (ہے) اس میں سے سبزہ بھی پروردگار کے حکم سے (نفیس ہی) نکلتا ہے (سورۃ الاعراف: آیت 58)

یعنی اچھی زمین ہی اچھا پھل دیتی ہے۔ اگر فکری زمین میڈیا کے ذریعے آلودہ ہو جائے تو وہاں سے مضبوط قیادت نہیں، کمزور شخصیات پیدا ہوتی ہیں۔

جدید میڈیا نے قیادت کے تصور کو کردار سے ہٹا کر شہرت سے جوڑ دیا ہے۔ جو زیادہ نظر آئے، وہی لیڈر؛ جو زیادہ بولے، وہی رہنما؛ جو زیادہ فالوورز رکھے، وہی معتبر۔ اس ماحول میں خاموش، سنجیدہ، اصولی اور گہرے لوگ پس منظر میں چلے جاتے ہیں، اور اسٹیج

ان کے ہاتھ میں آ جاتا ہے جو جذبات کو بھڑکانا جانتے ہیں، سمت دینا نہیں۔

قرآن ہمیں اس دھوکے سے خبردار کرتا ہے:

پس آپ کو ان کے مال و اولاد تعجب میں نہ ڈال دیں۔ (سورۃ التوبہ: آیت 55)

یعنی ظاہری چمک دمک کو معیار نہ بناؤ— یہی اصول آج میڈیا کے تناظر میں پہلے سے زیادہ اہم ہو چکا ہے۔

میڈیا نے نوجوان کو فوری اثر (Instant Impact) کا عادی بنا دیا ہے۔ وہ فوری تبدیلی، فوری انقلاب اور فوری کامیابی چاہتا ہے۔ مگر قیادت کا سفر ایسا نہیں ہوتا۔ قیادت صبر، تسلسل اور ناکامیوں سے گزر کر بنتی ہے۔ جب نوجوان کو یہ حقیقت نہیں بتائی جاتی تو وہ یا تو جلد مایوس ہو جاتا ہے، یا غیر حقیقی خوابوں میں جینے لگتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی قیادت کا ماڈل اس کے بالکل برعکس تھا۔ مکہ کے تیرہ سال صبر، خاموش جدوجہد اور کردار سازی میں گزرے۔ قرآن اس تربیت کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے:

پس تو خوب ثابت قدم رہ، جیسے تجھے حکم دیا گیا ہے (سورۃ ہود: آیت 112)

استقامت وہ وصف ہے جو میڈیا کلچر کم اور قیادت زیادہ مانگتی ہے۔

اس کے باوجود میڈیا کو یکسر دشمن سمجھنا بھی ایک فکری غلطی ہے۔ یہی میڈیا نوجوان کو آواز، رسائی اور اثر دیتا ہے— جو ماضی میں صرف طاقتور طبقوں کے پاس تھا۔ اگر نوجوان کے پاس فکر واضح ہو، اخلاق مضبوط ہو، اور مقصد بلند ہو، تو میڈیا اس کے لیے دعوت، اصلاح اور مثبت قیادت کا غیر معمولی ذریعہ بن سکتا ہے۔

مسئلہ میڈیا نہیں، مسئلہ میڈیا پر کس فکر کی نمائندگی ہے۔

قیادت کا نیا تصور یہی ہے کہ نوجوان میڈیا میں موجود بھی ہو، مگر میڈیا کا اسیر نہ ہو۔ وہ بولے بھی، مگر سوچ کر؛ ردِعمل بھی دے، مگر حکمت کے ساتھ؛ اور اختلاف بھی کرے، مگر اخلاق کے دائرے میں۔ قرآن دعوت کا اسلوب واضح کرتا ہے:

اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلا (سورۃ النحل: آیت 125)

حکمت ہی وہ چیز ہے جو میڈیا کے شور میں قیادت کو پہچان دیتی ہے۔

آج کے نوجوان کو یہ سکھانا ضروری ہے کہ لیڈر وہ نہیں جو سب سے زیادہ نظر آئے، بلکہ وہ ہے جو سب سے زیادہ ذمہ داری اٹھائے۔ وہ جو مشکل وقت میں اصول نہ چھوڑے، اور آسانی میں غرور نہ کرے۔ میڈیا وقتی مقبولیت دیتا ہے، مگر تاریخ صرف کردار کو یاد رکھتی ہے۔

تاریخ میں جن نوجوانوں نے قیادت کی، وہ میڈیا کے ستارے نہیں تھے، مگر اصولوں کے امین تھے۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ مدینہ کے پہلے سفیر بنے — نہ اسٹیج، نہ لشکر، صرف کردار اور پیغام۔ یہی قیادت کا اصل معیار ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ میڈیا نے قیادت کو مشکل نہیں بنایا، بلکہ ننگا کر دیا ہے۔

اب دکھاوے کی قیادت زیادہ دیر نہیں چلتی، اور خلوص اگر سچا ہو تو چھپ نہیں سکتا۔ نوجوان اگر اس حقیقت کو سمجھ لے تو میڈیا اس کے لیے فتنہ نہیں، وسیلہ خیر بن سکتا ہے۔

قیادت اسکرین سے نہیں، سچائی سے چمکتی ہے۔

(نوجوان قیادت کا مستقبل: امید، ذمہ داری اور راستہ)

تاریخ کا ہر نیا دور نوجوانوں کے کندھوں پر آتا ہے، مگر فرق یہ ہوتا ہے کہ کچھ نوجوان اس بوجھ کو شعور کے ساتھ اٹھاتے ہیں اور کچھ نادانی میں۔ عصرِ حاضر کا نوجوان اگرچہ بے شمار چیلنجز میں گھرا ہوا ہے، مگر اسی قدر امکانات بھی اس کے ہاتھ میں ہیں۔ اصل سوال یہ نہیں کہ حالات کیسے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ ان حالات میں نوجوان کیا بننے کا فیصلہ کرتا ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں مایوسی کے اندھیروں سے نکال کر امید کی روشنی دکھاتا ہے:

اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ (سورۃ الزمر: آیت 53)

یہ آیت صرف گناہ گار کے لیے نہیں، بلکہ اس نسل کے لیے بھی ہے جو خود کو کھو بیٹھی ہے۔ اسلام نوجوان کو یہ یقین دلاتا ہے کہ اگر نیت درست ہو تو واپسی کا راستہ ہمیشہ کھلا ہوتا ہے۔

نوجوان قیادت کا مستقبل سب سے پہلے ذمہ داری کے شعور سے جڑا ہے۔ قیادت نعروں، مقبولیت یا سوشل اثر سے پہلے ایک اندرونی احساس ہے کہ **"میں جواب دہ ہوں"**۔ قرآن نے انسان کو زمین پر خلیفہ قرار دے کر یہی ذمہ داری یاد دلائی:

میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں (سورۃ البقرہ: آیت 30)

یہ خلافت اقتدار نہیں، امانت ہے — اور امانت وہی اٹھا سکتا ہے جو اپنے نفس پر قابو رکھتا ہو۔

مستقبل کی قیادت کا ایک اہم ستون امید ہے، مگر یہ امید خوابوں پر نہیں، حقیقت پر قائم ہوتی ہے۔ وہ نوجوان جو صرف شکوہ کرتا ہے، وہ قیادت نہیں کرسکتا؛ اور جو ہر حال میں بہتری کا راستہ ڈھونڈتا ہے، وہی رہنما بنتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے مکہ کی گھٹن زدہ فضا میں بھی

یہی امید زندہ رکھی، حالانکہ بظاہر کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

قرآن اسی کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے:

پس یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔(سورۃ الم نشرح: آیت 5)

یعنی مشکل کے ساتھ آسانی جڑی ہوتی ہے — شرط یہ ہے کہ آنکھیں کھلی ہوں۔

نوجوان قیادت کا مستقبل علم اور کردار کے امتزاج میں پوشیدہ ہے۔ محض جذباتی نوجوان وقتی ہجوم تو اکٹھا کر سکتا ہے، مگر دیرپا تبدیلی نہیں لا سکتا۔ اور محض تعلیم یافتہ مگر بے حس نوجوان نظام کا حصہ تو بن سکتا ہے، رہنما نہیں۔ قیادت وہی کرے گا جو علم بھی رکھتا ہو اور دل بھی۔

حضرت یوسفؑ کی قیادت اسی امتزاج کی مثال ہے۔ طاقت بھی، امانت بھی — یہی مستقبل کی قیادت کا معیار ہے۔

اس دور میں نوجوان کو یہ سمجھنا ہوگا کہ قیادت کا راستہ تنہائی سے گزرتا ہے۔ ہر درست فیصلہ مقبول نہیں ہوتا، اور ہر حق بات پر تالیاں نہیں بجتیں۔ مگر تاریخ ہمیشہ انہی کو یاد رکھتی ہے جنہوں نے شور کے بجائے اصول چُنے۔ قرآن ہمیں اسی استقامت کی تلقین کرتا ہے:

پس تو خوب ثابت قدم رہ، جیسے تجھے حکم دیا گیا ہے (سورۃ ہود: آیت 112)

نوجوان قیادت کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ اسے ماضی کی غلامی لازم نہیں۔ وہ تاریخ سے سیکھ سکتا ہے، مگر اس کا قیدی نہیں۔ وہ جدید دنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنے دین، اقدار اور شناخت کے ساتھ کھڑا ہو سکتا ہے۔ اسلام اسے پیچھے نہیں دیکھنے کہتا، بلکہ صحیح سمت میں آگے بڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔

آخر میں، اس باب کو اگر ایک فکر میں سمیٹا جائے تو وہ یہ ہے:

نوجوان اگر اپنی پہچان پا لے، ذمہ داری قبول کر لے، اور امید نہ چھوڑے — تو وہ صرف مستقبل کا انتظار نہیں کرتا، بلکہ مستقبل تخلیق کرتا ہے۔

نوجوانوں کی واپسی کے عملی راستے

ہم نے مسلمان نوجوان میں دین سے دوری کے اسباب کو تفصیل سے دیکھا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس صورتحال کا حل کیا ہے؟ نوجوان کو دوبارہ دین سے جوڑنا محض تقریروں یا نصیحتوں سے ممکن نہیں—اس کے لیے فکری، نفسیاتی، سماجی اور ادارہ جاتی سطح پر عملی اقدامات ضروری ہیں۔

یہ باب انہی قابلِ عمل راستوں پر روشنی ڈالتا ہے۔

.1 سوال کو حق سمجھا جائے

نوجوان سوال کرے گا—یہ حقیقت ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ مذہبی ماحول میں سوال پوچھنے کو جرم نہیں بلکہ سیکھنے کا ذریعہ سمجھا جائے۔ مساجد، مدارس، اسکول اور گھروں میں ایسا ماحول بنایا جائے جہاں نوجوان بلاخوف سوال کر سکے اور سنجیدہ، مدلل جواب پا سکے۔

.2 دین کو مقصدِ زندگی سے جوڑا جائے

نوجوان کو بتایا جائے کہ دین صرف عبادات نہیں بلکہ:

- شخصیت سازی
- اخلاقی قوت
- معاشرتی انصاف
- ذہنی سکون
- مقصدِ حیات

جب نوجوان دیکھے گا کہ دین اس کے روزمرہ مسائل سے جڑا ہوا ہے تو وابستگی خود پیدا ہوگی۔

.3 والدین کی تربیت

اکثر والدین بچوں کو دینی نصاب تو دلاتے ہیں مگر خود مثال نہیں بنتے۔ والدین کے لیے تربیتی پروگرام ہوں جو انہیں سکھائیں کہ جدید دور میں اولاد کے ساتھ دینی مکالمہ کیسے کیا جائے۔

گھر اگر پہلی مسجد بن جائے تو باہر کی دنیا کا خوف کم ہو جاتا ہے۔

.4 جدید تعلیمی اداروں میں دینی مکالمہ

یونیورسٹیوں اور کالجز میں ایسے پلیٹ فارمز بنائے جائیں جہاں جدید علم اور دینی فکر کا مکالمہ ہو۔ فلسفہ، سائنس اور دین کو متصادم نہیں بلکہ متکامل دکھایا جائے۔

.5 میڈیا میں مثبت دینی کانٹینٹ

نوجوان جہاں ہے، وہیں دین پہنچایا جائے — یعنی ڈیجیٹل دنیا میں۔

جید علماء کی زیرِ نگرانی مختصر، معیاری، مدلل اور خوبصورت انداز میں دینی مواد تیار کیا جائے جو نوجوان کے ذہن کی سطح پر ہو۔

.6 نوجوان رول ماڈلز کی تشکیل

ایسے افراد کو سامنے لایا جائے جو کامیاب بھی ہوں، دیندار بھی ہوں، جدید بھی ہوں۔ یہ امتزاج نوجوان کے دل میں یہ تصور بدل سکتا ہے کہ دینداری ترقی کی رکاوٹ نہیں۔

7. روحانی تجربہ فراہم کیا جائے

مطالعہ قرآن، دعا، ذکر اور خدمتِ خلق کے ذریعے نوجوان کو روحانی ذوق دیا جائے۔ جب وہ دل کا سکون پائے گا تو دین نظریہ نہیں بلکہ تجربہ بن جائے گا۔

8. کمیونٹی اور دوستی کا متبادل

مثبت نوجوان گروپس بنائے جائیں جہاں دین، دوستی اور جدید سرگرمیاں ساتھ ہوں۔ کیونکہ نوجوان تنہا نہیں بدلتا — وہ گروپ کے ساتھ بدلتا ہے۔

نتیجہ

نوجوان کو واپس لانا ممکن ہے — بشرطیکہ ہم اس کے ذہن کو سمجھیں، اس کے سوال کو عزت دیں، اور دین کو محبت، علم اور مقصد کے ساتھ پیش کریں۔

دین فطرت کی آواز ہے۔ جب شور کم ہو جائے تو دل خود اسے سن لیتا ہے۔

ریاستی سطح پر اصلاحی اقدامات

نوجوان میں دین سے قربت یا دوری صرف انفرادی یا خاندانی مسئلہ نہیں رہتا — یہ اب قومی سطح کا چیلنج بن چکا ہے۔ اگر ایک بڑی نوجوان آبادی فکری اور روحانی خلا کا شکار ہو جائے تو اس کے اثرات سماجی امن، اخلاقی نظام اور قومی شناخت پر پڑتے ہیں۔

اسی لیے ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے پالیسی اقدامات کرے جو نوجوان کو جدید دنیا میں رہتے ہوئے اپنی دینی اور اخلاقی بنیاد سے جڑا رکھیں۔

.1 قومی تعلیمی پالیسی میں اقدار کی شمولیت

ریاست کو ایسا تعلیمی نصاب تشکیل دینا ہوگا جس میں:

- اخلاقی تربیت
- مقصدِ حیات
- قومی و تہذیبی شناخت
- مذہبی فہم

کو جدید علوم کے ساتھ مربوط انداز میں شامل کیا جائے۔ مقصد یہ نہ ہو کہ مذہب زبردستی پڑھایا جائے، بلکہ یہ دکھایا جائے کہ دین علم اور زندگی کے ساتھ چل سکتا ہے۔

.2 اساتذہ کی فکری تربیت

اساتذہ صرف مضمون پڑھانے والے نہیں بلکہ ذہن بنانے والے ہوتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اساتذہ کو جدید فکری چیلنجز، نوجوان کی نفسیات اور دینی مکالمے کی تربیت دی جائے۔

باخبر استاد نوجوان کو گمراہی سے بچا سکتا ہے۔

.3 قومی میڈیا پالیسی

ریاستی سطح پر میڈیا کے لیے اخلاقی اور تہذیبی ذمہ داری کا فریم ورک بنایا جائے۔ ایسا مواد فروغ دیا جائے جو:

- اخلاقی اقدار

- خاندانی نظام
- مثبت دینی شعور

کو مضبوط کرے۔

میڈیا اگر صرف تفریح نہیں بلکہ فکری تعمیر کا ذریعہ بن جائے تو نوجوان کی سمت بدل سکتی ہے۔

.4 ڈیجیٹل لٹریسی اور تنقیدی شعور

نوجوان کو اسکول ہی سے سکھایا جائے کہ انٹرنیٹ پر ہر چیز سچ نہیں ہوتی۔

تنقیدی تجزیہ، ماخذ پرکھنے اور الگورتھم کے اثرات کو سمجھنے کی تربیت لازمی ہو۔

یہ صلاحیت نوجوان کو فکری ببل سے باہر نکال سکتی ہے۔

.5 نوجوانوں کے لیے قومی سطح کے مکالمے

ریاست ایسے پلیٹ فارم مہیا کرے جہاں نوجوان، علماء، سائنسدان، ماہرینِ نفسیات اور سماجی مفکرین مل بیٹھ کر زندگی کے بنیادی سوالات پر مکالمہ کریں۔

مکالمہ ٹکراؤ کو کم کرتا ہے، فہم کو بڑھاتا ہے۔

.6 نوجوانوں کے لیے مثبت کمیونٹیز

ریاستی سطح پر یوتھ سینٹرز، رضاکارانہ نیٹ ورکس اور سروس پروگرام بنائے جائیں جہاں نوجوان خدمتِ خلق کے ذریعے دین کے عملی پہلو کو محسوس کر سکیں۔

7. عدل اور شفافیت

سب سے اہم اصلاح یہ ہے کہ ریاست انصاف، شفافیت اور مساوات کو فروغ دے۔ کیونکہ جب نوجوان ریاست کو عادل دیکھتا ہے تو اسے دین کا عدل پسند پیغام حقیقت لگنے لگتا ہے۔

ریاست اگر دین کے اخلاقی اصولوں کی عملی مثال بن جائے تو تبلیغ کی ضرورت کم پڑ جاتی ہے۔

نتیجہ

ریاست صرف قانون نافذ کرنے والا ادارہ نہیں بلکہ قومی روح کی محافظ ہوتی ہے۔ اگر ریاست نوجوان کے اخلاقی و روحانی شعور کی حفاظت کرے تو فکری انتشار کم ہو سکتا ہے۔

نوجوان کو بندوق سے نہیں، مقصد سے جوڑا جاتا ہے۔

خلاصہ، اختتامی کلمات اور آئندہ کی سمت

یہ کتاب پاکستانی نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی لادینی اور دین سے دوری کے اسباب، مظاہر اور نتائج کا تفصیلی مطالعہ تھی۔ ہم نے تاریخی، سماجی، تعلیمی، نفسیاتی، ڈیجیٹل اور ریاستی تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ اب وقت ہے کہ پورے مباحث کو ایک جامع نتیجے میں سمیٹا جائے۔

.1 مسئلہ کیا ہے؟

مسلمان نوجوان آج:

- سوالات سے بھرا ہوا ہے
- معلومات کے سیلاب میں گھرا ہوا ہے
- شناخت کے بحران میں مبتلا ہے
- اعتماد کے ٹوٹنے سے گزر رہا ہے

جب اسے دین غیر منطقی، غیر متعلق یا جبر کی صورت میں دکھائی دیتا ہے تو فطری طور پر وہ دور ہوتا ہے۔

یہ لادینی زیادہ تر انکار نہیں بلکہ غلط تجربے کا ردعمل ہے۔

.2 اصل جڑ کہاں ہے؟

کتاب کے مطالعے سے واضح ہوا کہ اصل اسباب یہ ہیں:

- مکالمے کی کمی

- سوال کو دبانا
- دین کو رسم بنا دینا
- کردار کی کمی
- انصاف کا فقدان
- جدید علم سے عدم ربط

یعنی مسئلہ دین نہیں — دین کی پیشکش ہے۔

3. نوجوان کیا چاہتا ہے؟

نوجوان:

- دلیل چاہتا ہے
- احترام چاہتا ہے
- سچائی چاہتا ہے
- مقصد چاہتا ہے
- روحانی سکون چاہتا ہے

جب دین ان ضروریات کو پورا کرتا ہے تو وہ خود واپس آتا ہے۔

4. حل کا خلاصہ

حل تین سطحوں پر ہے:

فرد کی سطح

- سوال سننا
- محبت سے رہنمائی
- روحانی ذوق پیدا کرنا

ادارے کی سطح

- تعلیمی اصلاح
- میڈیا کی بہتری
- نوجوان دوست پلیٹ فارم

ریاستی سطح

- عدل
- شفافیت
- قومی اقدار کی حفاظت

جب یہ تینوں سطحیں ہم آہنگ ہوں تو نوجوان کی فکری واپسی ممکن ہے۔

5. امید کی حقیقت

یہ تصور غلط ہے کہ نئی نسل مکمل طور پر دین سے کٹ چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نوجوان:

- سچ کی تلاش میں ہے

- روحانیت کا پیاسا ہے
- مقصد چاہتا ہے

اگر درست رہنمائی ملے تو یہی نسل دین کی نئی فکری تجدید کر سکتی ہے۔

6. آئندہ کی سمت

مستقبل کا کام یہ ہے کہ:

- علماء جدید علم سے واقف ہوں
- اساتذہ نفسیات سمجھیں
- والدین مکالمہ سیکھیں
- ریاست انصاف دے
- میڈیا ذمہ داری نبھائے

یہ سب مل کر نوجوان کے دل میں دوبارہ یقین جگا سکتے ہیں۔

دین فطرت ہے۔ نوجوان فطرت سے بھاگ نہیں سکتا — بس شور کم کرنے کی ضرورت ہے۔ جب محبت، علم اور انصاف اکٹھے ہو جائیں — نوجوان خود مسجد، کتاب اور خدا کی طرف لوٹ آتا ہے۔

دعا یہ اختتام

اے اللہ! ہم تیرے حضور عاجزی اور امید کے ساتھ دستِ دعا دراز کرتے ہیں۔ تو دلوں کے حال جاننے والا ہے اور نیتوں کے بھید سے باخبر ہے۔ اگر اس کتاب میں کوئی بات حق کے قریب ہے تو وہ تیری توفیق سے ہے، اور اگر کوئی لغزش یا کمی رہ گئی ہے تو وہ ہماری کم فہمی کا نتیجہ ہے۔

اے ربِ کریم! پاکستان کے نوجوانوں کے دلوں کو ہدایت کے نور سے منور فرما۔ ان کے ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات کو ایمان کی مضبوطی کا ذریعہ بنا، ان کے شکوک کو یقین میں بدل دے، اور ان کے قدموں کو صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رکھ۔ انہیں ایسا فہم عطا فرما جو اندھی تقلید سے پاک ہو، اور ایسا یقین عطا فرما جو شعور اور بصیرت پر قائم ہو۔

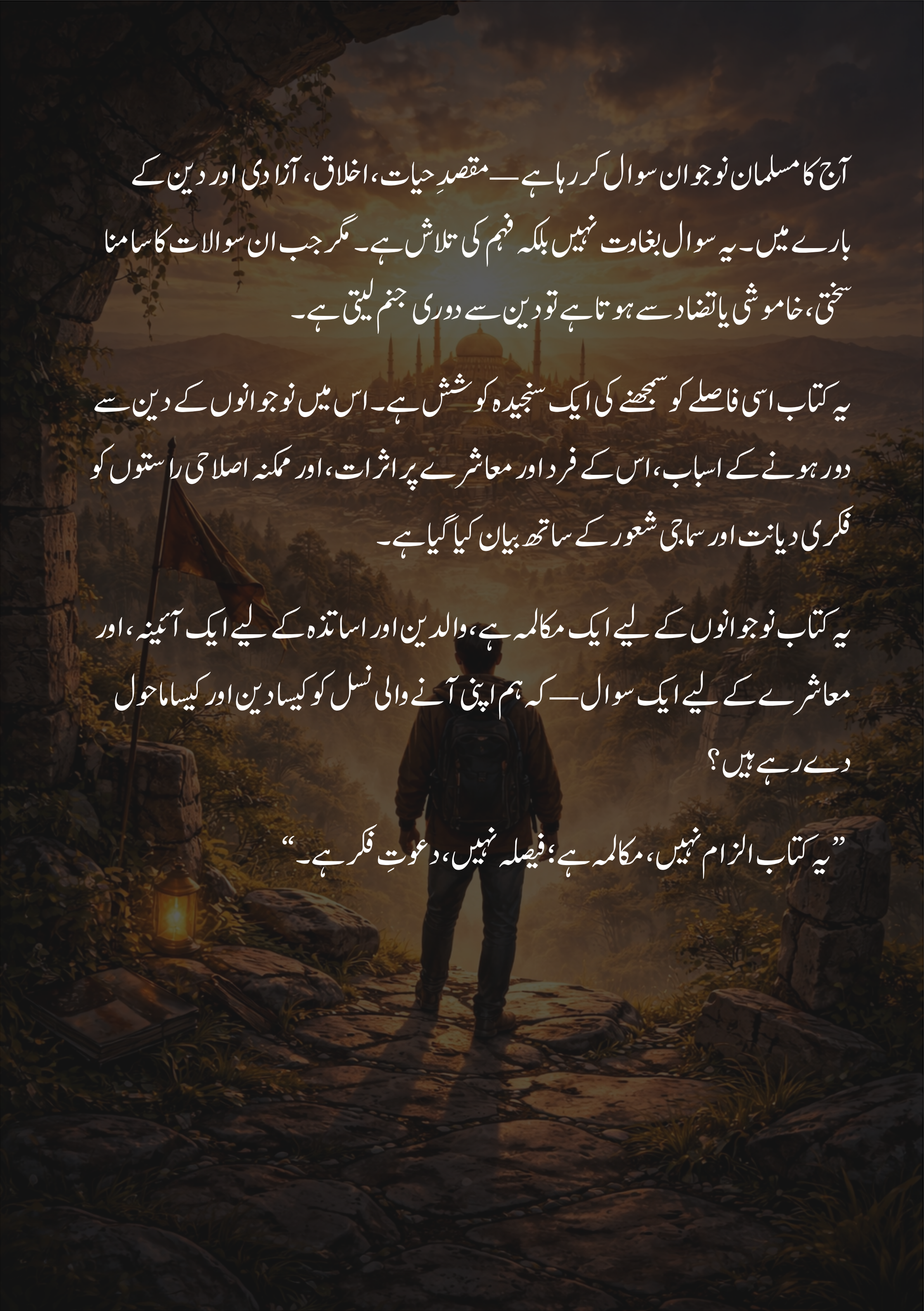
اے اللہ! ہمیں دین کو صحیح طور پر سمجھنے، اس پر عمل کرنے اور اسے حکمت، محبت اور حسنِ اخلاق کے ساتھ پیش کرنے کی توفیق عطا فرما۔ ہمارے قول و فعل میں ہم آہنگی پیدا فرما تاکہ ہماری زندگیاں خود دین کی دعوت بن جائیں، اور ہماری کمزوریاں دوسروں کے لیے ٹھوکر کا سبب نہ بنیں۔

اے پروردگار! ہمارے گھروں کو سکون، ہمارے معاشرے کو عدل، اور ہماری نسلوں کو خیر و بھلائی کا ذریعہ بنا دے۔ نوجوانوں کے لیے ایسے اساتذہ، رہنما اور نمونے پیدا فرما جو علم کے ساتھ حلم، اور قوت کے ساتھ اخلاق کو جمع کر سکیں۔

اے رب العالمین! ہمیں مایوسی، انتہا پسندی اور فکری گمراہی سے محفوظ فرما، اور ہمیں وہ راستہ دکھا جس میں تیری رضا، ہمارے معاشرے کی اصلاح، اور انسانیت کی بھلائی پوشیدہ ہو۔ ہماری کوششوں کو قبول فرما، ہماری نیتوں کو خالص کر دے، اور ہمارے انجام کو خیر پر ختم فرما۔

اے اللہ! اس کتاب کو اگر کسی ایک دل کے قریب بھی کر دے، کسی ایک ذہن میں روشنی کا سبب بنا دے، یا کسی ایک نوجوان کو دین کے ساتھ مثبت ربط عطا کر دے، تو یہی ہماری سب سے بڑی کامیابی ہے۔

آمین یا ربَّ العالمین۔



آج کا مسلمان نوجوان سوال کر رہا ہے — مقصدِ حیات، اخلاق، آزادی اور دین کے بارے میں۔ یہ سوال بغاوت نہیں بلکہ فہم کی تلاش ہے۔ مگر جب ان سوالات کا سامنا سختی، خاموشی یا تضاد سے ہوتا ہے تو دین سے دوری جنم لیتی ہے۔

یہ کتاب اسی فاصلے کو سمجھنے کی ایک سنجیدہ کوشش ہے۔ اس میں نوجوانوں کے دین سے دور ہونے کے اسباب، اس کے فرد اور معاشرے پر اثرات، اور ممکنہ اصلاحی راستوں کو فکری دیانت اور سماجی شعور کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

یہ کتاب نوجوانوں کے لیے ایک مکالمہ ہے، والدین اور اساتذہ کے لیے ایک آئینہ، اور معاشرے کے لیے ایک سوال — کہ ہم اپنی آنے والی نسل کو کیسا دین اور کیسا ماحول دے رہے ہیں؟

”یہ کتاب الزام نہیں، مکالمہ ہے؛ فیصلہ نہیں، دعوتِ فکر ہے۔“